نگارِ پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین نمبر

مدیر ڈاکٹر فرمان فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲ جاری شدہ ۱۹۲۲ء

تعلیمی اداروں کیلئے محکمہ تعلیم کراچی سے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف یو پی/۳۴۴۹

بانی

علامہ نیاز فتح پوری

سالنامہ ۱۹۷۵ء محمود حسین نمبر

مدیر

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

نائب مدیر

اُمراؤ طارق

ناظم نشر و اشاعت و اشتہار

رشید محمد قریشی

دفتر

۱۸۱- گارڈن آفیسز، نشتر روڈ، کراچی ۳

(سید اختر حسین نے جاوید آفسٹ پریس سے چھپوا کر ۱۵۹-اے قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی سے شائع کیا)

فہرستِ مضامین

۵۴ واں سال	سالنامہ جون، جولائی ۱۹۷۵ عیسوی	شمارہ ۶-۷

۶- نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو (زندگی و شخصیت)

۷- محمود میاں کے نام (غیر مطبوعہ خطوط)

۸- نامہ ہائے محمود (غیر مطبوعہ)

۹۔ آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے (فکر و نظر)

۱۰۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان (سیرت و عمل)

۱۱۔ اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں (تأثراتِ منظوم)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مُلاحظات

ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بُلبل

۱۰ اپریل کو ڈاکٹر محمود حسین کے روپ میں ایوانِ مشرق کی ایک شمع اور بجھی، تہذیبی قدروں اور علم و فن کے چہروں کی روشنی ماند پڑ گئی، علمی و ادبی مجلسیں سونی سونی ہیں، فضا پر بے دلی و مردنی سی چھائی ہے ہر چند کہ ان کے خونِ دل سے سیراب و شاداب باغات، جامعہ ملیہ اور جامعہ کراچی دونوں موجود ہیں، دونوں میں حسبِ معمول کام ہو رہا ہے، وہی طلبہ، وہی اساتذہ، وہی دفتری عملہ، وہی جلسے، وہی جلوس، وہی کاروبار اور وہی گردشِ روزگار، کیا کچھ نہیں ہے لیکن تازگی و شگفتگی کا چمن بکھیر دینے والا متبسم چہرہ اور سلام کے لئے ہر وقت اُٹھے ہوئے لمبے ہاتھ اب نظر نہیں آتے۔ سارا ماحول عجب کی طرح سوگوار سنجیدگی اور بے کیفی کا شکار ہے۔ نہ لطیفے ہیں نہ شگوفے۔ نہ قہقہے ہیں نہ چہچے۔ میر کے لفظوں میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ع

ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

مصائب اور بھی تھے لیکن محمود حسین کا یکایک اُٹھ جانا ہم سب کے لئے ایک سانحہ تھا، پورے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی، اپنے پرائے، چھوٹے بڑے سبھی اُن کے غم میں نڈھال ہوئے سسکے، بلکے، تڑپے اور بعض دھاڑیں مار کر روئے اور ابھی تک بعض کا یہ حال ہے کہ اُن کے ذکر سے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ لوگ انھیں یاد کرتے ہیں اور مدتوں یاد رکھیں گے، کیوں؟ شاید اس لئے کہ وہ میر تقی میر کے اس شعر ؎

باسے دُنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کے عامل و مفسر بن کر ہم سب کے دُکھ درد کا درماں بن گئے تھے۔ آج بھی اُن کی یاد آتی ہے، کبھی گاہے گاہے کبھی اکثر اور بہت ستاتی ہے۔ بیتاب و مضطرب کر جاتی ہے لیکن بایں ہمہ بے تابی[1] ان کی یاد سے دل کو ایک طرح کی آسودگی میسر آتی ہے۔ یہی بیتابی و آسودگی دراصل نگار کے محمود حسین نمبر کی محرک

---

[1] ایں حرفِ نشاط آور می گویم و می رقصم ٭ از عشق دل آساید بایں ہمہ بے تابی (اقبال)

داعی بن گئی۔ مئی کا پرچہ پریس جا چکا تھا۔ میں نے پریس جا کر پہلے صفحے کے اُوپر ایک سطر کا اس طور پر اضافہ کر دیا ... "جون کا پرچہ ڈاکٹر محمود حسین نمبر ہوگا"

بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ فیصلہ حد درجہ عاجلانہ اور جذباتی ہے لیکن اب ہو کیا سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کئی دن تک مایوسی اور تذبذب کا شکار رہا۔ پھر ایک دن یاد آیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ایسے موقعوں پر کسی کا یہ قول دہرایا کرتے تھے "فیصلہ نہ کرنے سے غلط فیصلہ کرنا بہتر ہے" اس سے مجھے یک گونہ سکون ملا اور میں یکسوئی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ پھر حالات ایسے سازگار ہوتے گئے کہ میں اپنے فیصلے پر ایک طرح کی خوشی محسوس کرنے لگا۔ خیال تھا کہ اتنے کم وقت میں نہ تو لوگ لکھ سکیں گے اور نہ سو ڈیڑھ سو صفحے سے زائد کے مضامین اکٹھا ہو سکیں گے لیکن میری گزارش پر اہلِ قلم نے ایسی توجہ فرمائی کہ مجھے خود اپنی تنگ دامانی کا شکوہ ہو گیا۔ ساڑھے تین سو صفحات کے جس نمبر کی تیاری میں کم از کم ایک سال لگتا تھا وہ مہینے بھر میں تیار ہو گیا

اب یہ نمبر قارئینِ نگار کے سامنے ہے۔ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ میں اس کے بارے میں کیا عرض کروں اور جو کچھ ہے جیسا بھی ہے یہی متاعِ حقیر اب متاعِ فقیر ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طبیعت کا اندازہ کر کے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس متاعِ حقیر کو ان کی رُوح قبول کرے گی، خوش ہوگی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے اسے سراہے گی، میری ہمت بڑھائے گی۔ میرے اس عمل سے شاید خود لجائے گی لیکن مجھے کسی حال میں بھی آزردہ و مضمحل دیکھنا پسند نہ کرے گی اس لئے کہ اس نے زندگی میں بھی کبھی یہ نہیں کیا

اس کام میں کتنے دوستوں نے میرا ہاتھ بٹایا ہے اور کس کس طرح میری مدد کی ہے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں، میرا دل ان سب کیلئے شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہے۔ البتہ اس کا اعتراف کرتا چلوں کہ محمود حسین نمبر نکالنے کی تجویز و تخیل کو جن لوگوں نے دل سے سراہا اور اسے عملی شکل دینے کی مختلف منزلوں میں میری مدد کی اُن میں محمد دین شمسی صاحب، حکیم سعید صاحب، ڈاکٹر سعد صاحب، ولی اللہ صاحب، ڈاکٹر عزیز صاحب، نذر صاحب، شاہد صاحب، ضیا صاحب، ماہد صاحب، سلام صاحب، نیاز صاحب سبطین صاحب، بیگ صاحب، صدیقی صاحب، تنویر صاحبہ، ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ، شمیم آزر صاحب، شفیع نقی صاحب رشید صاحب، اختر صاحب اور کوثر صاحب بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض میرے دوست ہیں بعض عزیز، بعض بزرگ ہیں بعض رفیق کار، بعض شاگرد ہیں اور بعض نگار کے ہمدرد، میں ان سب کیلئے دعا گو اور سپاس گزار ہوں۔

فرمان فتحپوری

پیغام

بیگم رعنا لیاقت علی خاں (نشانِ امتیاز)، گورنر سندھ

ڈاکٹر محمود حسین کو میں گزشتہ تقریباً تیس سال سے جانتی ہوں اور اس دیرینہ واقفیت کی بنا پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ مرحوم ایک حلیم الطبع انتہائی شریف اور نیک دل انسان تھے اور بہت بڑے محبِ وطن بھی۔ وہ ایک مشفق و فرض شناس استاد تھے۔ ان کا شمار برصغیر کے ممتاز مورخین و ماہرینِ تعلیم میں ہوتا تھا

قیامِ پاکستان کے وقت وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریڈر تھے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد انھیں ڈپٹی منسٹر کی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں لے لیا گیا اور وزارتِ دفاع و ریاستی و سرحدی امور کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ پھر کامن ویلتھ اور امورِ خارجہ کے وزیر مملکت ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں وزارتِ امورِ کشمیر کا منسٹر انچارج اور ۱۹۵۲ء میں وزارتِ تعلیم کا وزیر بنایا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۷۱ء سے اب تک وہ جامعہ کراچی کے وائس چانسلر تھے جس کی ترقی و توسیع کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے اور طلبا کے کاز کو ہر طرح عزیز رکھا۔

تعلیم و تدریس کے شعبہ میں انھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں جنہیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ملک سے جہالت کی تاریکی دور کرنے کے لئے انھوں نے "مجلس تعلیم ملی" قائم کی اور بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ جامعہ ملیہ جیسا عظیم و فعال تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ کچھ کا اُردو ترجمہ کیا۔ فارسی زبان میں اُن کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب "فتح المجاہدین" ہے جو جنگی حکمتِ عملی اور ٹیپو سلطان کی فوجی تنظیم سے متعلق ہے۔ اُس کا پیش لفظ قائدِ ملت مرحوم لیاقت علی خاں نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے انہوں نے لائبریریوں سے متعلق ایک عمدہ کتاب لکھی تھی۔ اور اس طرح انہوں نے خود کو علم و عمل کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ثابت کیا۔ اُن کی موت بلا شبہ قوم کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین کی زندگی پاکستانی نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ ہمارے طلبا و طالبات اُن کی عظیم شخصیت سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خدا اُن پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

رعنا لیاقت علی خاں

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ڈاکٹر محمود حسین، ایک نظر میں

یہ سوانحی خاکہ، کئی دن کی شب و روز محنت اور دیدہ ریزی کے بعد، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے نجی کاغذات، ان کے پاسپورٹ، سروس ریکارڈ، ڈاکٹر یوسف حسین خان کی یادوں کی دنیا، محترمہ بیگم محمود اور ان کی بڑی بیٹی محترمہ تنویر ضیا کے ساتھ تبادلۂ خیال، کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ (ف ف)

اب و جد

نام	محمود حسین خاں
تاریخ پیدائش	۱۵ جولائی ۱۹۰۷ء
جائے پیدائش	قائم گنج۔ ضلع فرخ آباد، یو۔ پی
والد	فدا حسین خاں متوفی ۱۹۰۷ء بعمر ۳۹ سال
والدہ	نازنین بیگم (وفات ۱۹۱۱ء)
دادا	غلام حسین خان ابن محمد حسین خان ابن احمد حسین خان
نانا	نبی داد خان
چچا	عطا حسین خان (وفات ۱۹۱۰ء)
مورثِ اعلیٰ	حسین خان ملقب بہ مدہ آخون (بڑے استاد)

بھائی بہن

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم سات بھائی تھے اور سب سے چھوٹے تھے۔ بہن کوئی نہ تھی۔ بڑے بھائیوں کے نام بلحاظ بزرگی و خوردی یہ ہیں۔

۱۔ مظفر حسین خان مرحوم [1]

۲۔ عابد حسین خان مرحوم

---

[1] امتیاز حسین خاں مرحوم، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور خدیجہ کے والد۔

۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم[1] (ہندوستان کے سابق صدر، تعلیمی مفکر اور سیاسی رہنما، متوفی ۳ر مئی ۱۹۶۹ء)
۴۔ زاہد حسین خاں مرحوم (اٹھارہ سال کی عمر میں بعارضہ دق انتقال کیا)
۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں[2] (علوم عمرانی اور اردو کے نامور عالم و مصنف۔ حیات ہیں اور ہندوستان میں ہیں)
۶۔ جعفر حسین خاں مرحوم (چھ سال کی عمر میں وفات پائی)

پرورش و تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمود حسین، شکم مادر ہی میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ مشکل سے چار سال کی عمر تھی کہ والدہ نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ چنانچہ ان کی پرورش، اور تعلیم و تربیت، چچا، چچی اور بڑے بھائیوں کی نگرانی میں ہوئی، رسمی تعلیم کے لئے اوّل اوّل اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڈھ، جارج اسکول قائم گنج اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔

تعلیمی اسناد

۱۔ میٹرک ۔ ۱۹۲۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ سے اول درجے میں پاس کیا۔
۲۔ انٹر ۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ سے دہلی منتقل ہوئی تو ڈاکٹر صاحب بھی دہلی چلے گئے اور وہیں سے ۱۹۲۶ء میں انٹر کیا۔
۳۔ بی۔ اے ۱۹۲۸ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے بی۔ اے کیا۔
۴۔ پی ایچ ڈی ۱۹۲۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمن گئے اور ہائیڈل برگ سے ۱۹۳۲ء میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موضوع تھا "اصلاحاتِ آئین ہند ۱۹۱۹ء"۔
۵۔ ڈی، لٹ ۔ ۱۹۶۱ء میں COLORADO STATE COLLEGE نے ڈی لٹ کی

---

[1] سعیدہ، اور صفیہ کے والد
[2] اجمل، راشدہ اور مہر خانم کے والد

اعزازی ڈگری دی۔

شادی

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں، محترمہ سلطان جہاں بیگم بنت علی عثمان خان سے شادی ہوئی سلطان جہاں بیگم، گھر میں "بیا" کہلاتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی بالعموم انہیں اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

اولاد

دو بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔

۱۔ انور حسین[۱] ۔ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہیں، ۲۶ جنوری ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، ۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء میں مہرالنساء بنت ڈاکٹر یوسف حسین خان سے شادی ہوئی۔ ان دنوں، کویت یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔

۲۔ طارق حسین[۲] ۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۷ مارچ ۱۹۷۰ء میں صبیحہ بنت خورشید حسن خان سے شادی ہوئی۔ فن لینڈ کی ایک پرائیوٹ فرم میں کام کرتے ہیں۔

۳۔ تنویر[۳] جہاں بیگم۔ بیٹیوں میں سب سے بڑی ہیں، تاریخ پیدائش ۲۷ جنوری ۱۹۲۷ء ہے، ۲۶ دسمبر ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خالہ زاد بھائی کے بیٹے کیپٹن ضیاءالدین خان سے شادی ہوئی۔

---

(۱) انور حسین کے دو بیٹے، شاہد اور فہد اور دو بیٹیاں نجلا اور لیلیٰ ہیں۔ شاہد سب میں بڑا ہے اور اس کی عمر دس سال ہے، پیدائشی خون کی کمی کا مریض ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سے بڑی محبت تھی، یونیورسٹی ساتھ لاتے تھے اور لے جاتے تھے گویا رات دن ساتھ رکھتے تھے۔ علاج کے لئے، لندن تک لے گئے لیکن فائدہ نہ ہوا۔ شاہد اب نانا کے فراق میں گھلا جا رہا ہے مہینے کے آخر میں جب اسے خون دیا جاتا ہے تو کچھ جان میں جان آجاتی ہے۔

(۲) ۔ طارق کے چار سال کی ایک بیٹی بشریٰ اور ۲ ½ سال کا بیٹا ذاکر ہے۔

(۳) ۔ تنویر جہاں کے شوہر کیپٹن ضیاءالدین خاں، میجر جنرل رحیم الدین خاں کے حقیقی بھائی ہیں، رحیم الدین خاں کو تنویر کی چھوٹی بہن ثاقبہ بیاہی ہیں۔

۴- یاسمین[۱] خانم - ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئیں۔ یکم نومبر ۱۹۵۷ء میں افضل حسین کے پوتے میاں افتخار حسین سے شادی ہوئی۔

۵- ثاقبہ[۲] خانم - یکم نومبر ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئیں۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۸ء میں میجر جنرل رحیم الدین خاں سے شادی ہوئی۔

مناصب

۱- ۱۹۳۳ء ڈھاکہ یونیورسٹی میں جدید تاریخ کے ریڈر مقرر ہوئے۔

۲- ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو کے مشیر مقرر ہوئے

۳- ۱۹۴۷ء (۱) پاکستان کانسٹیٹیونٹ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

(۲) ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تعلقات عامہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

۴- ۱۹۴۸ء - پاکستان اسٹرلنگ بیلنس ڈیلی گیشن کے ممبر بنائے گئے۔

۵- ۱۹۴۹ء (۱) ڈھاکہ سے مستقلاً کراچی آگئے۔

(۲) پاکستان کی کابینہ میں دفاع، امور خارجہ اور دولت مشترکہ کے نائب وزیر مقرر ہوئے

۶- ۱۹۵۰ء - ریاستی اور قبائلی امور کے نائب وزیر مقرر کیے گئے۔

۷- ۱۹۵۱ء - کابینہ میں بہ حیثیت وزیر شامل ہوئے اور امور کشمیر کا قلمدان ان کے سپرد ہوا۔

۸- ۱۹۵۲ء - کابینہ کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔

۹- ۱۹۵۳ء (۱) ۴ جولائی ۱۹۵۳ء کو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔

(۲) کراچی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب کیے گئے۔

۱۰- ۱۹۶۰ء - ۱۵ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

۱- یاسمین کے دو بیٹیاں سینعہ اور نسرین اور ایک بیٹا سہیل ہے۔ لڑکیوں کی عمر ۱۵ سال اور ۱۲ سال اور بیٹے کی عمر ۹ سال ہے۔
۲- ثاقبہ کے دو بیٹیاں شاذہ (۱۴ سال) اور ثمن (۷ سال) اور دو بیٹے فائز (۱۲ سال) اور آصف (۴ سال) ہیں۔

۱۱- ۱۹۶۲ء - (۱) ۱۹ فروری ۱۹۶۲ء کو وائس چانسلر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

(۲) ۲۰ فروری ۱۹۶۲ء کو کراچی کے شعبہ تاریخ میں بہ حیثیت پروفیسر اور صدر واپس آ گئے۔

۱۲- ۱۹۶۴ء - وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) گئے۔

۱۳- ۱۹۶۴-۶۵ء - کولمبیا یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔

۱۴- ۱۹۶۵ء (۱) ۷ جون ۱۹۶۵ء کو اپنے سابق عہدے پر کراچی یونیورسٹی واپس آ گئے۔

(۲) ۲۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو فیکلٹی آف آرٹس کے دوبارہ ڈین مقرر کیے گئے۔

۱۵- ۱۹۶۷ء - ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو ساٹھ سال پورے ہو گئے اور ملازمت کی مدت میں دو سال کی توسیع کر دی گئی۔

۱۶- ۱۹۶۹ء - ملازمت میں ایک سال کی مزید توسیع دے دی گئی۔

۱۷- ۱۹۷۱ء ۳ اگست ۱۹۷۱ء کو چار سال کے لیے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

۱۸- ۱۹۷۵ء / ۹ اپریل ۱۹۷۵ء تا دم حیات کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

منصبی مدتیں

۱- ریڈر - ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۶ء تقریباً ۱۳ سال

۲- مشیر آل انڈیا ریڈیو ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء ۲ سال

۳- پروفیسر - ۱۹۴۷ تا ۱۹۷۱ تقریباً ۲۴ سال

۴- پاکستان کانسٹیٹیونٹ اسمبلی کے ممبر ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۴ء تقریباً سات سال

۵- پاکستانی کابینہ کے وزیر و نائب وزیر ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ تقریباً چار سال

۶- ڈین فیکلٹی آف آرٹس (۱) ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء ۴ سال
(۲) ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء ۶ سال
تقریباً ۱۰ سال

۷- بیرونی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر ۱۹۶۴ تا ۱۹۶۵ء تقریباً ۱½ سال

۸- پرو چانسلر ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء تقریباً ۴ سال

۹۔ وائس چانسلر (۱) ۱۹۶۰ تا ۱۹۶۳ (ڈھاکہ یونیورسٹی) ۳ سال
(۲) ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ (کراچی یونیورسٹی) ۴ سال } تقریباً ۷ سال

جامعۂ تعلیم ملی ملیر

۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء جامعہ ملیہ ملیر کا یوم تاسیس ہے۔ اس کے بعد اس کے تحت یکے بعد دیگرے مندرجہ ذیل ادارے قائم ہوئے۔

۱۔ ۱۹۵۲ء۔ اقامتی ابتدائی مدرسہ۔
۲۔ ۱۹۵۳ء۔ اقامتی ثانوی مدرسہ۔
۳۔ ۱۹۵۵ء۔ کامرس کالج
۴۔ ۱۹۵۵ء۔ مکتبۂ جامعہ تعلیم ملی
۵۔ ۱۹۵۶ء۔ سائنس کالج
۶۔ ۱۹۵۷ء۔ آرٹس کالج
۷۔ ۱۹۵۹ء۔ جامعہ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن
۸۔ ۱۹۶۰ء۔ جامعہ ایجوکیشنل کوارٹرلی کا اجرار
۹۔ ۱۹۶۴ء۔ جامعہ ملیہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی
۱۰۔ ۱۹۶۶ء۔ ثانوی مدرسہ برائے طالبات
۱۱۔ ۱۹۷۰ء۔ ٹیچر ٹریننگ کالج

ادارت

۱۔ ۱۹۲۵ء زمانہ طالب علمی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی "بزم کمال" کے صدر منتخب ہوئے اور "جوہر" نام کا ایک قلمی رسالہ نکالا بعد کو یہی رسالہ اردو کا معتبر پرچہ بن گیا اور اس کے دو شمارے "جوہر نمبر" اور "اقبال نمبر" بہت مقبول ہوئے۔

۲۔ ۱۹۵۲ء۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ کے آڈیٹوریل بورڈ کے چیرمین مقرر ہوئے۔

۳۔ ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۰ء سے تادم حیات جامعہ ایجوکیشن کوارٹرلی کے مدیر رہے۔

حج بیت اللہ

١- ١٩٦٤ء
٢- ١٩٦٧ء
٣- ١٩٧٢ء

عمرہ

١- ١٩٥٧ء
٢- ١٩٧١ء

سیاحت

مختلف ضرورتوں سے ڈاکٹر صاحب نے دنیا کے بیشتر ملکوں کی سیاحت کی۔ جن ملکوں کا انہوں نے ایک سے زائد بار سفر کیا ان میں، امریکہ، انگلستان، جاپان، جرمنی، سعودی عربیہ انڈونیشیا، ایران، ترکی، فلپائن، بلجیم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

١- پہلا بیرونی سفر۔ ١٩٢٩ء میں تعلیم کی غرض سے جرمنی گئے۔

٢- آخری بیرونی سفر۔ ١٩٧٥ء میں انگلستان گئے۔

زبانوں سے واقفیت

اُردو، فارسی، جرمن اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے البتہ لکھتے صرف اُردو، انگریزی اور جرمن زبانوں میں تھے ان کے مسودات میں کئی مضامین جرمن زبان میں اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

تصنیفات وتالیفات

ڈاکٹر صاحب کے مسودات میں سینکڑوں مطبوعہ وغیر مطبوعہ مقالے موجود ہیں لیکن ان سب کی فہرست دنیا سردست میرے لئے ممکن نہیں، کتابی صورت میں ان کی مطبوعہ تصنیفات وتالیفات کی تفصیل یہ ہے۔

١۔ معاہدہ عمرانی یا اصول قانون سیاسی

(ارُوسو کی مشہور کتاب سوشل کنٹرا یکٹ کا اُردو ترجمہ مع مقدمہ وحواشی)

طبع اوّل ١٩٣٥ء مکتبہ جامعہ دہلی

طبع دوم ١٩٦٤ء شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی

٢- دی کوئسٹ آف امپائر (THE QUEST OF EPIRE)

ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے اور انگریزی میں ہے۔ کتاب کا موضوع، جاپان اٹلی اور

دائیں سے بائیں :- ([illegible]) زاہد حسین اور ذاکر حسین، عابد حسین خاں، فدا حسین خاں (ذاکر محمود حسین کے والد) یوسف حسین خاں، عطا حسین خاں (ڈاکٹر محمود کے چچا)، مظفر حسین خاں

فروری ۱۹۲۹ء

سنہ ۱۹۳۷ء بڑے بیٹے انور حسین کو گود میں لئے ہوئے

۱۹۵۴ء
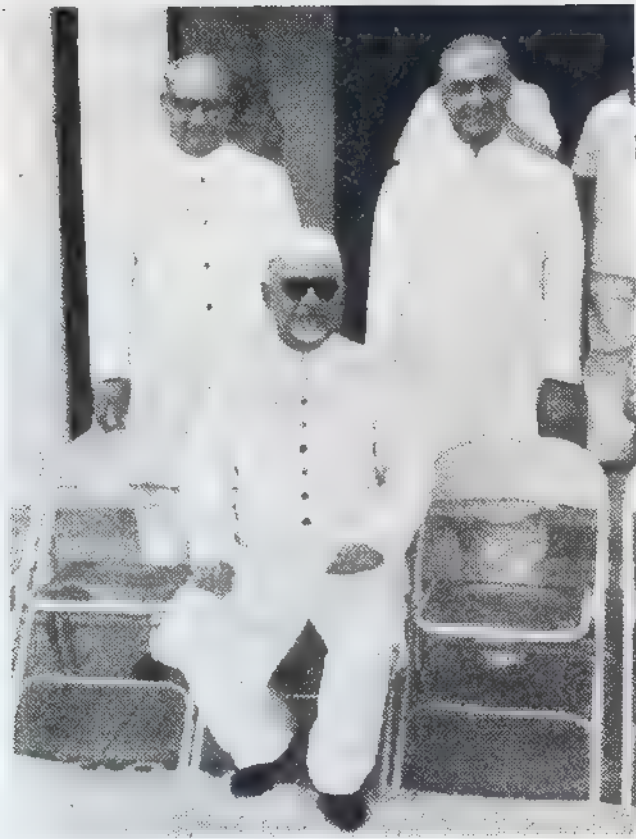
بیگم عطا حسین خاں : ڈاکٹر صاحب مرحوم کی چچی جنہوں نے ان کی

۱۹۵۶ء دائیں سے بائیں :۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۱۹۶۴ء

۱۹۵۴ء بیگم محمود حسین
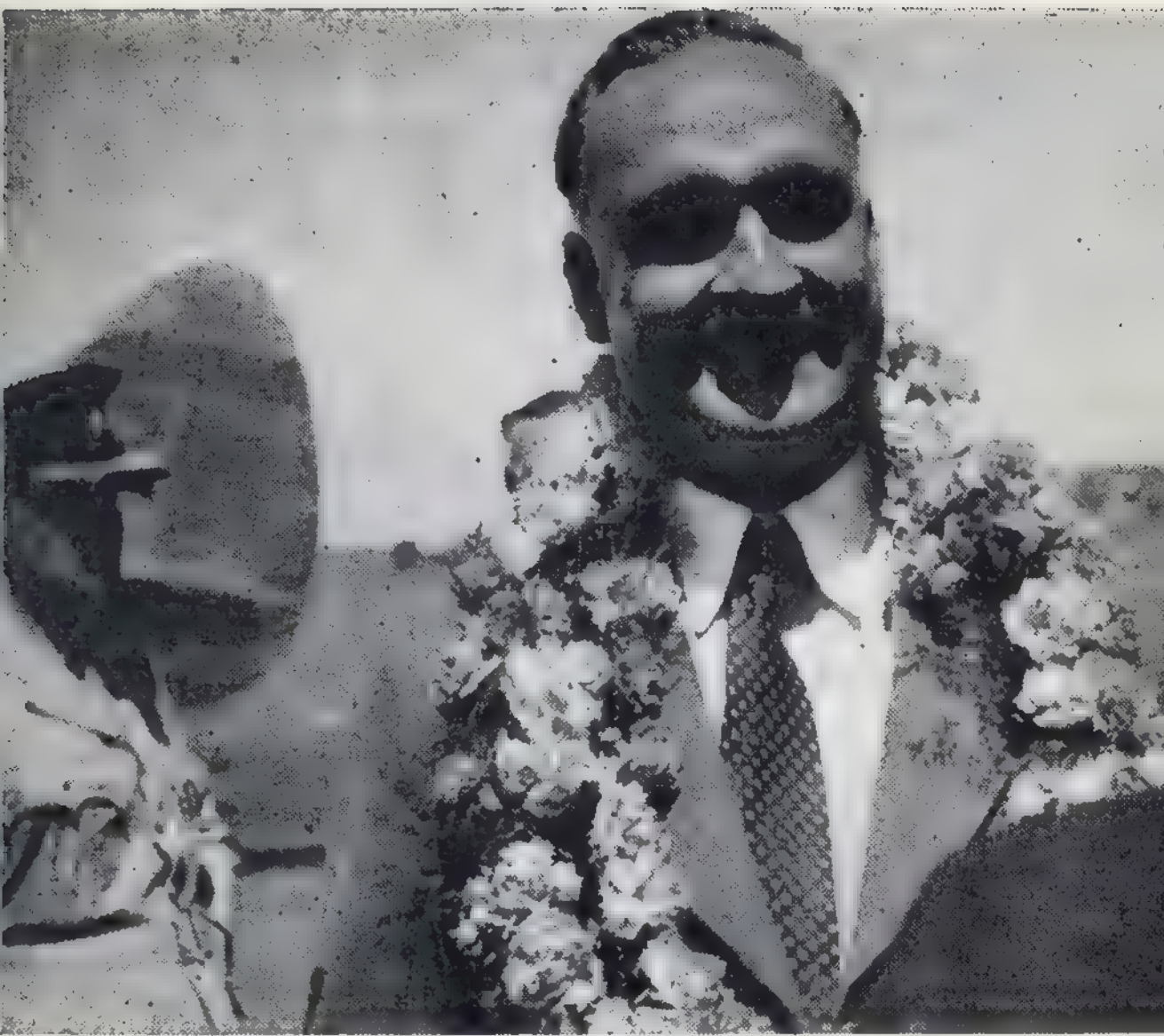
فروری ۱۹۵۶ء ڈربن ایرپورٹ

۱۹۵۶ء دائیں سے بائیں ۱۔ ڈاکٹر محمود حسین۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (ٹوپی اور شیروانی میں) محترمہ مس فاطمہ جناح

سنہ ۱۹۶۲ء ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں
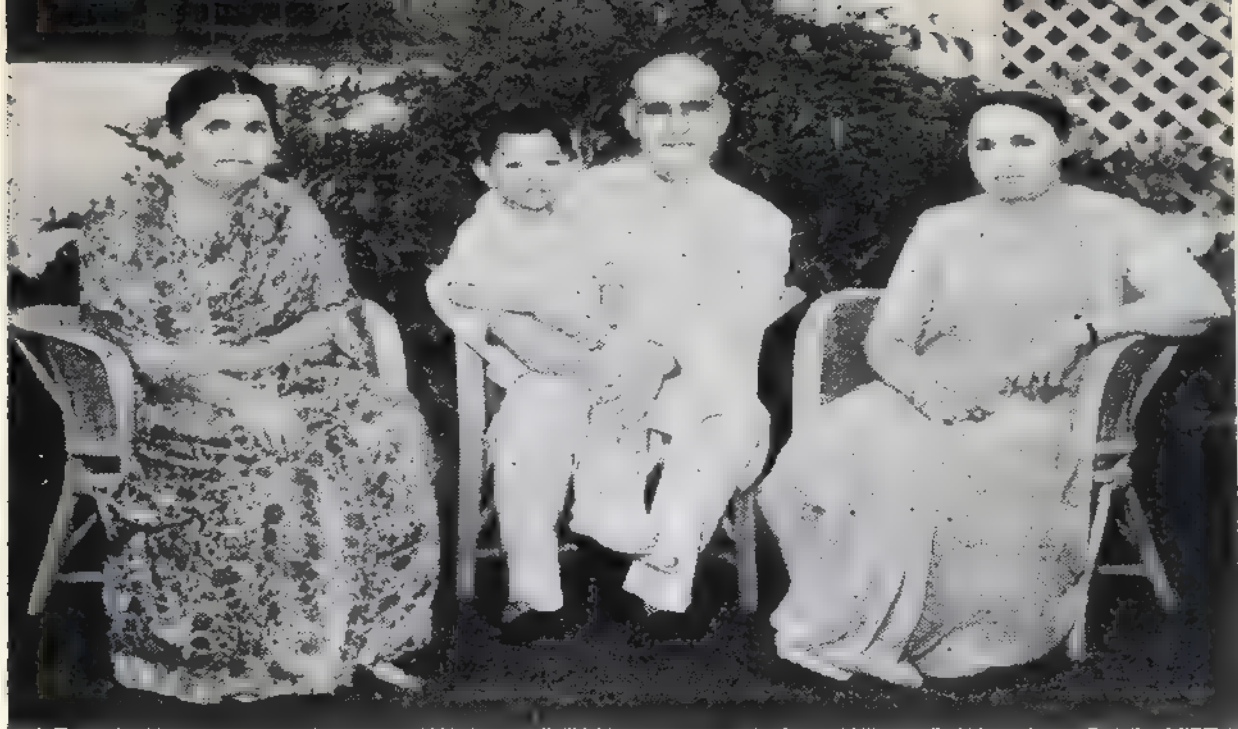
۱۹۶۸ء بیگم محمود حسین، ڈاکٹر محمود حسین (شاہد کو گود میں لئے ہوئے) بیگم یوسف حسین

۱۹۷۳ء ثاقبہ، شازہ، سمن، اور آصف کے ساتھ

مئی سنہ ۱۹۶۹ء ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی وفات کی خبر سُن کر

۱۹۷۵ء صبیحہ طارق، تنویر ضیا، شاہد (ڈاکٹر صاحب کی گود میں)، بیگم محمود حسین، کیپٹن ضیاء الدین خاں

اُردو و انگریزی عکسِ تحریر

ہم اب بھی مصائب پر قابو پا سکتے ہیں۔ البتہ بڑی محنت لگن درستی کردار کی
دشواریوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ تکلیفیں اٹھانی ہوں گی، قربانیاں دینی پڑیں گی۔ سراسیمہ
ہونے، یا ہمت ہار کر بیٹھ جانے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں بڑھتے طوفانوں کا
مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ یہ وقت انتشار پیدا کرنے کا نہیں ہے۔ علاقائی
تعصب کو ہوا دینا یا طبقاتی خلیج کو وسعت دینا پاکستان کی بنیادیں ہی ہلا سکتی
ہیں۔ حالیہ واقعات سے سبق لینا چاہئے۔ بعض لوگ اس طرح کے شبہات کا اظہار
کرتے ہیں کہ شاید پاکستان کی بنیاد ہی غلط پڑی تھی اور اس کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن
واقعہ یہ ہے کہ حالیہ واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پاکستان کی بنیاد غلط
اصولوں پر پڑی تھی بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری قیادت ناقص تھی جو پاکستان
جیسی عظیم مملکت کے انتظام و انصرام کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اور
کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

DR. MAHMUD HUSAIN

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI 27

31. 7. 71

Dear Shaza,

I was very happy to receive your letter. As you know I shall be coming to 'Pindi on the 3rd August when I shall be meeting all of you.

You have asked what is a Vice-chancellor. Just as in your school you have many girls and a number of teachers, and also a Principal or Head Mistress to look after the whole school similarly in the University apart from students and teachers there is a Vice-Chancellor to look after the whole University. The Vice-chancellor is the Head of the University just as your Principal is the Head of your school.

I hope you have now understood the meaning of the word.

Affectionately
Nana

ڈاکٹر محمود حسین اور بیگم محمود حسین

ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیمِ اسناد منعقدہ ۱۹۷۰ء میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے
ڈاکٹر محمود حسین کے دائیں جانب، وائس چانسلر ڈاکٹر ابو سعید چودھری بیٹھے ہیں
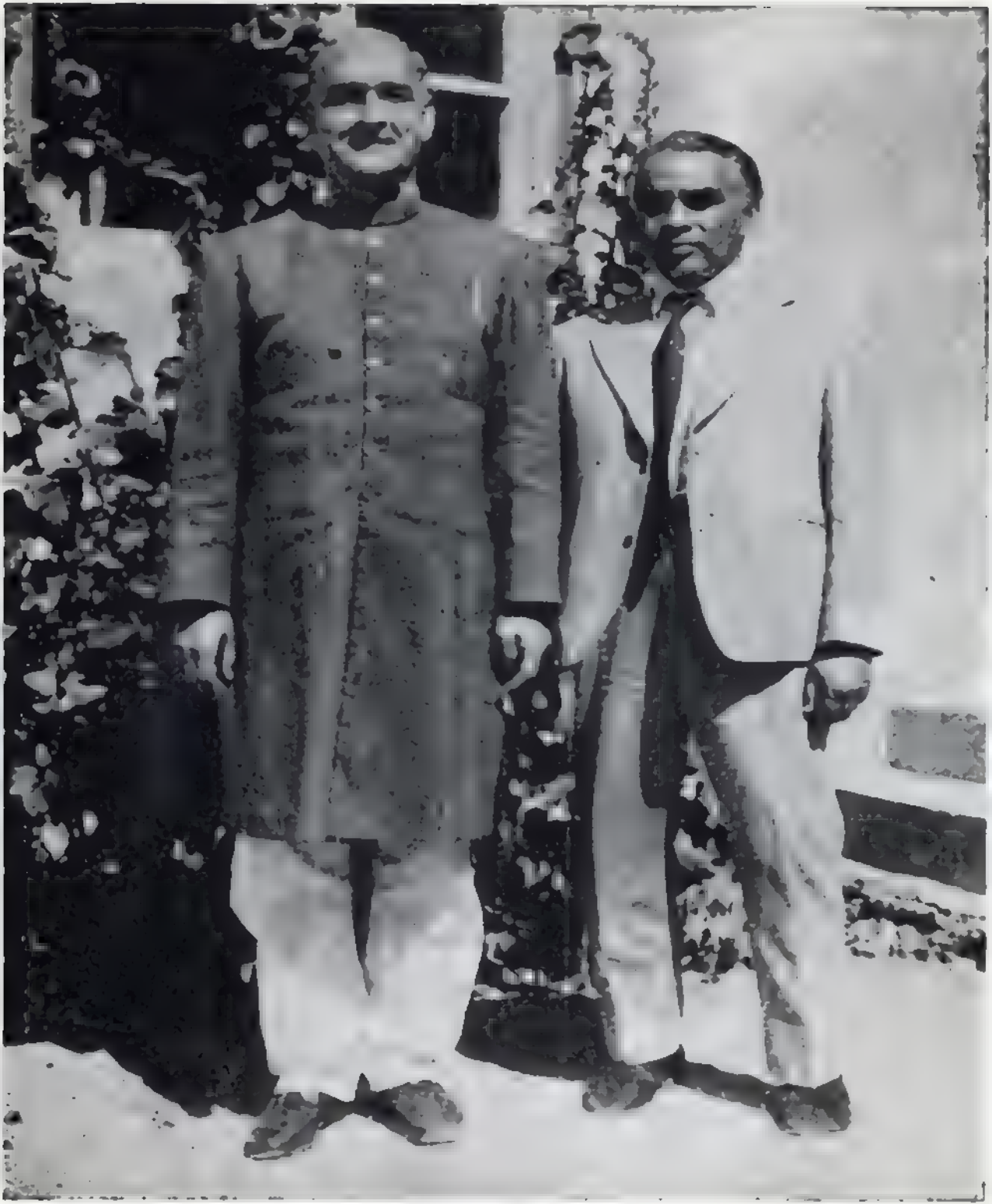
۱۹۷۵ء

نگار کے مدیر ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر محمود حسین کے ساتھ

جرمنی کی توسیع پسندانہ حکمت عملی ہے۔ طبع اوّل ۔ ۱۹۳۷ء ڈھاکہ

۳۔ بادشاہ

(مشہور اطالوی مصنف میکیاولی کی تصنیف پرنس کا اُردو ترجمہ مع مقدمہ)

طبع اول ۱۹۴۷ء مکتبہ جامعہ دہلی

طبع دوم ۱۹۵۷ء اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

طبع سوم ۱۹۷۰ء شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی

۴۔ فتح المجاہدین ۔

ٹیپو سلطان کے عسکری نظام و اصول پر مشتمل، زین العابدین شوستری کی فارسی کتاب کا متن مع مقدمہ و حواشی بہ زبان انگریزی طبع اوّل ۱۹۵۰ء اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

۵۔ دی ڈریمس آف ٹیپو سلطان (THE DREAMS OF TIPO SULTAN)

طبع اوّل ۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۵ء

۶۔ عرب دُنیا

ڈاکٹر نجلاء عزالدین کی مشہور زمانہ کتاب (THE ARAB WORLD) کا اُردو ترجمہ ہے ۔ طبع اوّل ۔ ۱۹۶۷ء مکتبہ جدید لاہور

۷۔ لائبریریز اور لائبریرین (OF LIBRARIES AND LIBRARIANS)

کتاب اور کتاب خانوں کی اہمیت پر مشتمل انگریزی مقالات، کا مجموعہ ہے ۔

طبع اوّل ۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

بیماریِ دل

۱۔ ۳ رمئی ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا انتقال ہوا میت میں شرکت کے لئے دہلی گئے وہیں، ۵ رمئی ۱۹۶۹ء کو دل کا پہلا شدید دورہ پڑا۔

۲۔ ۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو سہ پہر کو یونیورسٹی دفتر ہی میں فالج کا حملہ ہوا۔ چوتھے دن نیم غشی کے عالم ہی میں دل کا دوسرا دورہ پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔

وفات ۔ ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ نصف شب گزرنے کے بعد

دو بج کر ۴۰ منٹ پر وفات پائی۔

جنازہ و دفن

مرحوم کا جنازہ ۱۱ ؍ مئی ۱۹۷۵ء کو ۴ بجے شام مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کے مکان "گوشہ" این - ۲۱، پی، ای، سی، ایچ، ایس سے جلوس کی شکل میں جامعہ ملیہ ملیر کے احاطے میں لے جایا گیا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے نماز پڑھائی۔

چھ بجے شام کو سپرد خاک کیا گیا۔ جامعہ ملیہ کی مسجد کے دروازے کے سامنے دائیں جانب جامعہ تعلیم ملیہ ملیر کے سکریٹری ماسٹر عبدالحیٔ مرحوم کی قبر کے ساتھ ان کی قبر ہے۔

سوم و چہلم

۱۲ ؍ اپریل ہفتہ کو سوم کے سلسلے میں اور ۱۰ ؍ مئی ہفتہ کو چہلم کے سلسلے میں بعد نماز ظہر، نرسری کی مسجد نعیمیہ میں قرآن خوانی ہوئی۔

یادگاریں

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کی حقیقی یادگاریں تو ان کی ملکی و ملی خدمات، تعلیمی و علمی کارنامے اور شخصیت و کردار کی وہ بلندیاں ہیں جو پاکستان کی تاریخ میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور ملک و ملت کو ان کے نام اور کام کی یاد دلاتی رہیں گی۔ اس یاد کا ایک تازہ ثبوت، کراچی یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے اجلاس منعقدہ ۲۴ ؍ اپریل ۱۹۷۵ء کی منظور کردہ وہ قرارداد ہے جسے شعبۂ اردو کے استاد جمیل اختر خان صاحب نے پیش کیا اور جس کی رو سے

۱۔ کراچی یونیورسٹی کی لائبریری آیندہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کہلائے گی۔

۲۔ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ عمومی میں ڈاکٹر محمود حسین کے نام کی چیر قائم ہوگی۔

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام کی زیر نگرانی تحقیقی علمی و ادبی مقالوں پر مشتمل، ایک یادگاری مجلہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

بطرزِ خود نوشت

(ڈاکٹر صاحب سے ایک گفتگو)

جامعہ ملیہ کالج میگزین "نخلستان" (حصۂ اردو) کے مدیروں نے جناب شفیع نقی جامعی کی ہمراہی میں ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات میں اُن کی زندگی اور نظریات کے بارے میں چند سوالات کئے تھے یہ گفتگو انہیں سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے اور اپنی افادیت کی بنا پر نگار میں شائع کی جا رہی ہے۔ (ف ف)

ڈاکٹر صاحب! ہم فرزندانِ جامعہ کو بڑی خوشی ہوگی اگر آپ ہمیں اپنے خاندان اور اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ معلومات سے سرفراز فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب کی چمکدار آنکھوں میں فکر کی گہرائیاں اور گہری ہوگئیں۔ لمحہ بھر کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ حال کے پردے اُٹھا کر ماضی کے دریچوں میں جھانک رہے ہوں پھر ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ نظریں اُٹھائیں اور فرمایا۔

"ہندوستان کی ایک بستی قائم گنج ضلع فرخ آباد میں، میں نے آنکھیں کھولیں یہاں پٹھانوں اور ہندوؤں کی مشترک آبادی تھی تعلیم کا رواج مسلمانوں میں خصوصاً کم تھا۔ لوگ عموماً فوج میں ملازمت کرتے تھے پھر وہاں سے ریٹائرڈ ہو کر زمینداری کرتے۔ ہمارے دادا تک بھی حسب دستور پیشہ آبا سپہ گری ہی چلتا رہا لیکن میرے والد مرحوم کو قدرت کے دست کرم سے علمی ذوق ملا تھا۔ ان کے ذوق کی تسکین ریاست حیدرآباد دکن میں ہو سکتی تھی چنانچہ وہ قائم گنج سے حیدرآباد دکن گئے۔ یہاں سے انہوں نے منشی فاضل کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب کیا۔ پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے وہیں پریکٹس شروع کر دی یہاں انہوں نے رسالہ "آئین دکن" بھی جاری کیا جو قانون داں حلقے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہم سات بھائیوں میں سے پانچ بھائی یہیں پیدا ہوئے۔ والد صاحب دکن میں مجلس قانون کے ممبر بھی تھے۔ مذاق علمی ہمیں والد صاحب سے وراثت میں ملا۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) نے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میں نے بھی اس اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ میرے بڑے بھائیوں کی اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ میری عمر آٹھ سال کی تھی کہ مجھے بھی علی گڑھ کے گورنمنٹ اسکول

میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں مقیم طالب علم کی حیثیت سے میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔"

ڈاکٹر صاحب نے پہلو بدلا دایاں ہاتھ صوفے کی پشت پر لے گئے۔ ماتھے پر چند شکنیں ابھر آئیں، بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میز پر تھپکی دیتے ہوئے خلا میں گھورا پھر کہنے لگے۔

"۱۹۲۰ء میں "نان کوآپریشن" کی تحریک نے زور پکڑا۔ اس وقت میرے بڑے بھائی ذاکر حسین مرحوم ایم اے کر رہے تھے اور میں آٹھویں میں تھا۔ ہم نے بھی اس تحریک میں اپنی بساط بھر حصہ لیا پھر علی گڑھ میں جامعہ قائم ہوئی تو تعلق بھی اسی سے ہو گیا۔ بھائی صاحب کا اُستاد کی حیثیت سے اور میں ایک طالب علم کی حیثیت سے۔ میں جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔"

ڈاکٹر صاحب بڑی تیزی سے اپنی راہ حیات کی منزلیں گزار رہے تھے۔ سفر کی کیفیتوں کا تجسس ہمیں قطع کلام پر مجبور کر گیا۔ ہم نے ایک شوخ گستاخی کے ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے عرض کیا۔

ڈاکٹر صاحب! گستاخی معاف۔ آپ کا سیاسی شعور کب اور کیسے بیدار ہوا؟ ۔ بڑی سنجیدگی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "میری سیاسی سوجھ بوجھ کا آغاز اس وقت ہوا جب میری عمر گیارہ برس کی تھی۔ پہلی جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر انگریز تھے۔ انھوں نے فتح کی خوشی میں ایک شاندار قسم کا جشن منایا "یونین جیک" کے بیج طلبہ کے لگوائے اور مٹھائی بانٹی۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ جنگ میں "ترک" بھی لڑے تھے۔ ان کے ہارنے پر مٹھائی کا تقسیم ہونا مجھے بہت کھلا۔ حسب معمول جب میں اپنے بڑے بھائی سے جیب خرچ لینے کے لئے ان کے ہاسٹل پہونچا تو ان کو میں نے جشن کی ساری تفصیل سنائی۔ بڑے بھائی نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کیا اور میں نے محسوس کیا شاید اب ترکی کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ مسلمانوں کی اس شکست پر میں بہت غمگین رہا۔ چند سال بعد خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد علی قید نہ ہوئے تھے جامعہ ملیہ ہی میں رہتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ روزانہ بڑی بصیرت افروز تقریر کرتے تھے۔ یہ انہی کا اثر تھا کہ جامعہ کے طلبہ کی سیاسی سوجھ بوجھ بہت بڑھ چکی تھی۔ مولانا محمد علی سے میں بہت متاثر رہا ہوں ان کی رفاقت کبھی نہ بھولنے والی یاد ہے میں زندگی بھر اس یاد کو محو نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں اسکول کا لاابالی طالب علم تھا لیکن وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مجھے آج بھی اپنے اس دور کے اساتذہ اکثر یاد

آتے ہیں۔ وہ ایک یادگار دن تھا جب ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی شیخ الہند مولانا محمود الحسن ؒ کو بلایا گیا تھا۔ وہ ضعیف بھی تھے اور اس وقت بیمار بھی۔ علی گڑھ کالج کی مسجد میں لاکر انھیں بٹھایا گیا ان کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ ان کی تقریر مولانا حسین احمد مدنی نے جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے پڑھ کر سنائی۔

کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے

تقریر کیا تھی مسلمانوں کے لئے تجدید عہد تھا کہ وہ قرطبہ اور غرناطہ کے صحیح وارث ثابت ہوں گے۔ جامعہ کی طالب علمی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب میری سیرت و شخصیت کی تکمیل ہو رہی تھی۔ ہمارے یہاں ایک استاد جناب کیلاٹ صاحب (MR. KALLAT) بھی تھے۔ یہ بڑی خوبیوں کے اُستاد تھے۔ پاکستان میں ہاکی کے مشہور کوچ جناب عبدالغنی کیلاٹ انہی کے متبنیٰ ہیں "

گفتگو اب تک بڑی سنجیدہ روش پر چل رہی تھی۔ ہماری شوخی نے انگڑائی لی۔ موضوع کا رُخ بدلنے کے لئے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا۔ ڈاکٹر صاحب! طلبہ کچھ شوخیاں بھی کرتے ہیں اور کچھ شرارتیں بھی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں یقیناً آپ نے بھی کچھ ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب ہماری شرارت کو بھانپ گئے انھیں بے اختیارانہ ہنسی آگئی۔ کہنے لگے۔ ہاں بھئی۔ شرارتیں تو ہم نے بھی کی ہیں ایک واقعہ آپ کو سناؤں اسی سے آپ اندازہ کرلیں کہ ہم کتنے اور کیسے شریر تھے۔ جناب مولانا شرف الدین صاحب ہم تمام بھائیوں کے اُستاد تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت شفیق تھے لیکن ہم اپنی تت نئی شرارتوں سے انھیں بہت تنگ کرتے تھے۔ وہ کلاس میں اور کلاس کے باہر ہمیں اپنے اشعار سناتے اور شعر سمجھ میں آئے نہ آئے ہم اپنا فرض منصبی سمجھ کر انھیں خوب داد دیا کرتے تھے۔ ان کے دو تخلص تھے یاسؔ اور مومنؔ۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یاس تھے تو داغ کے رنگ میں کہتے تھے اور مومن بن کر مومن خاں مومن کے رنگ میں کہنے لگے۔ ایک دن ہم نے ان کے ایک شعر کے متعلق داد دیتے ہوئے کہا کہ یہ داغ کے رنگ میں ہے! بڑے برہم ہوئے کیونکہ شعر مومن کے رنگ میں تھا۔ کہنے لگے "محمود حسین خاں! افسوس تمہیں اب تک شعر سمجھنا نہ آیا۔" حضرت بیدم وارثی سے ان کی خوب چشمک رہتی تھی۔ مولانا اپنے اور بیدم وارثی کے اشعار کا موازنہ کرتے تھے۔ ہم بیدم کا شعر سنتے تو بُرا سا منہ بنا لیتے اور مولانا کے شعر پر دل کھول کر داد دیتے۔ وہ

پہلے بیدم کا شعر سناتے اور پھر اپنا۔ ایک دفعہ ہماری شامت جو آئی تو پڑھتے پڑھتے یہ ترتیب بدل گئی۔
ہم بیدم کا شعر سمجھے جو دراصل مولانا کا تھا ہم نے کہا۔ "کیا پھسپھسا شعر ہے —" مولانا کا پارہ چڑھا۔
بولے — "محمود حسین خاں"! افسوس تمہیں اب تک اچھے اور برے شعر کی تمیز تک نہ آئی —" ہم نے فوراً
کہا — "مولانا معاف فرمائیں ہم سمجھے تھے حضرت بیدم کا شعر ہے" اس چٹکلے پر مولانا اور برہم ہو گئے"۔
شاید اپنی طالب علمی کے اس حسین یادگار واقعہ کو سوچ کر خود ڈاکٹر صاحب بھی بے اختیار ہنس رہے
تھے۔ ماضی کی یادیں بھی کتنی حسین ہوتی ہیں ہم اس بذلہ سنجی کا لطف اُٹھا چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:
"واقعی جامعہ کی فضا ایک طرح کا چیلنج تھی۔ اس کی راہ میں بڑی دقتیں بھی آئیں۔ یہ حکومت وقت
کے خلاف ایک تحریک تھی۔ مالی مشکلات اور ٹرسٹیز کی بے بسی۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ اب یہ چراغ
گل ہونے کو ہے لیکن ایسے وقت میرے بڑے بھائی "ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادارہ کو بچایا۔ اساتذہ کو جمع
کیا اور ادارہ کو کلیتاً ان پر چھوڑ کر رائے طلب کی کہ آپ اس کو چلانے کے حق میں ہوں تو ساتھ
دیں ورنہ اسے بند کر دیا جائے اساتذہ نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ واقعی یہ لوگ وہ تھے جنہوں
نے آرام و آسائش پر لات مار کر خدمت کی حامی بھری تھی۔ اس وقت وہاں انتہائی تنخواہ تین سو روپے
تھی — — — جو کسی کو نہ مل سکی جو کچھ آمدنی ہوتی وہ مساوی طور پر بانٹ لیا کرتے تھے۔ ہماری مجلس
تعلیم ملی کے سکریٹری ماسٹر عبدالحئی صاحب انہی لوگوں میں سے ہیں جو اس عہد میں پیش پیش تھے"۔

ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام ختم کیا تو ہم نے پوچھا" ڈاکٹر صاحب! بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
جامعہ ملیہ اور علی گڑھ دونوں ادارے مسلمانوں کی خدمت کے لئے بنائے گئے۔ وہ کیا خصوصیت ہے جو جامعہ
ملیہ کو علی گڑھ سے ممتاز کرتی ہے؟ — ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے نظریں جھکائیں جیسے سوچ رہے
ہوں کہ جواب کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ پھر فرمایا:

" — ہندوستان کے مسلمانوں نے سیاست کے کئی روپ دیکھے ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ میں مسلمانوں پر
ایسی افتاد پڑی کہ سیاست میں شرکت کا تصور بھی محال تھا۔ سرسید نے اسی بات کو پیش نظر رکھا کہ اب
مسلمانوں کو انگریزوں سے دوستی کے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ سیاست میں شرکت کر کے مسلمانوں نے
بڑا نقصان اُٹھایا ہے۔ لیکن جوں جوں مسلمان تعلیم حاصل کرتے گئے ان کے سامنے انگریزوں کی ریشہ دوانیاں
کھل کر آتی گئیں۔ ترکوں پر ظلم و تشدد، مصر پر قبضہ، جنگ بلقان، روس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے

ایران کے حصے بخرے ۔ ترکی کے سوا دیگر تمام اسلامی ممالک انگریزوں یا فرانسیسیوں کے تسلط میں چلے گئے تھے ۔ اور ترکی بھی دم بہ لب تھا۔ سرسید کی موجودگی میں تو مسلمان کانگریس میں شریک نہ ہوئے لیکن کانگریس کی آواز اس وقت سنی ضرور جانے لگی تھی ۔ سنہ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کانگریس کے ایما پر ۱۹۱۱ء میں ختم کردی گئی ۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی ، اپنے حقوق کی حفاظت اس کا مقصد قرار پایا ۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست پر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ۔ خالص ترکی علاقوں پر یونان اور اٹلی براجمان ہو گئے یہ وقت تھا کہ مسلمانوں نے پانی سر سے اونچا محسوس کیا ۔ مسلمانوں کی سیاست نے اپنا رُخ بدلا ۔ یہ انگریزوں سے جنگ کا دور تھا ۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی خم ٹھونک کر میدان میں اُترے انھوں نے سوچا کہ علی گڑھ مضبوط قلعہ ثابت ہوگا لیکن علی گڑھ کے ٹرسٹیوں نے یاران تیز گام کا ساتھ دینا مصلحت کے خلاف سمجھا ۔ مسلمانوں کی لیڈر شپ دل میں گھاؤ لئے پھر آگے بڑھی اور اس نے اپنی آرزوں اور اُمنگوں کے نخل کو جلد تناور دیکھنے کے لئے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی ۔ یہ ڈاکٹر صاحب انقلابی موڈ میں معلوم ہو رہے تھے چہرہ ان کے جذبات کی سرخی شفق کو مستعار دے رہا تھا ۔ وہ بولے ۔ " کسی تحریک کو کامیاب ہوتے ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں اگرچہ تحریک خلافت ناکام رہی تیس ہزار افراد پس دیوار زنداں ڈال دیئے گئے لیکن یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں ان کے بڑے دوررس نتائج نکلے ۔ تحریک خلافت وہ بنیاد ہے جس پر آج پاکستان کا قصر کھڑا ہے ۔ تحریک ختم ہو گئی لیکن جامعہ ملیہ ختم نہیں ہوئی وہ علم و عمل کے کھیتوں کو سیراب کرنے لگی یہاں وہ فصلیں تیار ہوئیں جن سے قوم نے روحانی اور ذہنی غذا پائی اور خوب پائی ۔ مولانا محمد علی جوہر اس ادارہ کی رُوح رواں تھے ان کے تعلیمی نظریے کی دو تین موٹی موٹی باتیں اب تک میرے ذہن پر نقش ہیں ۔ ادارہ کا نام انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا ۔ یہ ادارہ مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا وہ چاہتے تھے کہ یہاں دینی اور ملی تقاضے سامنے رکھ کر مسلمانوں کو تعلیم دی جائے جو انگریزی تعلیم سے یکسر مختلف ہوں ۔ علی گڑھ کو انھوں نے ایسی یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی تھی کہ جس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور دیگر مسلم مدارس بھی اس کی نگرانی میں چلیں لیکن انگریز اس پر رضامند نہ تھے ۔ بنارس یونیورسٹی کے ہندوؤں نے زور لگایا کہ تعلیمی حقوق انھیں حاصل ہوں ۔ انگریزوں نے یہ سودا ہنگامہ سمجھ کر سمجھوتہ کر لیا ۔ ڈاکٹر ضیاء الدین وغیرہ نے وقتی تقاضوں کے تحت انگریزوں کی مرضی کے مطابق علی گڑھ یونیورسٹی کی تشکیل قبول کرلی ڈاکٹر ضیاء الدین پریکٹیکل تھے جبکہ

مولانا محمد علی جوہر آئیڈیلسٹ :

ڈاکٹر صاحب نے ماضی کے دریچوں سے رُخ پھیرا تو ہم انھیں حال کے دروازے تک لے آئے
ہم نے عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! کہا جاتا ہے کہ کراچی کی جامعہ ملیہ۔ دہلی کی جامعہ کا پرتو ہے۔ ہماری
خواہش ہے کہ آپ ہمیں وہ حالات بتائیں جن میں اس جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ وہ کیا مقاصد تھے جو قیام
جامعہ کے وقت آپ کے پیش نظر تھے ۔" ہم نے محسوس کیا کہ یاد ماضی کی خنک ہوائیں ڈاکٹر صاحب کو فرحت
بخش رہی ہیں ان کا چہرہ اس دلی مسرت کی غمازی کر رہا تھا جو کامیاب جدوجہد کے بعد انسان کو حاصل
ہوتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا :

"۱۹۲۳ء سے میرا قیام ڈھاکہ میں رہا۔ قیام پاکستان کے وقت بھی میں ڈھاکہ میں تھا۔ حکومت سے
میرا تعلق ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ کراچی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا جامعہ ملیہ سے تعلق رہ چکا تھا۔ یہ لوگ
مجھ سے ملے اور کہا کہ تقسیم کے بعد جامعہ تو ہندوستان میں رہ گئی کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہاں بھی اسی طرز
کی ایک جامعہ بنائی جائے۔ یہ تجویز میرے دل کی آواز تھی چنانچہ ہم نے ۱۹۵۲ء میں کراچی میں جامعہ ملیہ کی
بنیاد رکھی۔ پرائمری اسکول سے ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ جامعہ ملیہ دہلی میں مولانا محمد علی نے تعلیم کا
سلسلہ کچھ اس طرح شروع کیا تھا کہ وہ خود اپنی پالیسی کے مطابق تعلیم دیتے تھے اور اپنے ہی طرز پر
امتحانات لیتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی اسکول کی حد تک تو یہ سلسلہ بہت کامیاب تھا لیکن میٹرک اور اس
کے بعد طلبہ کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ جامعہ کے طلبہ کو نہ دوسرے کالج قبول کرتے تھے
نہ یونیورسٹی انھیں داخلہ دیتی تھی کیونکہ نصاب تعلیم حکومت کے منظور شدہ نصاب سے مختلف ہونے کی
وجہ سے جامعہ ملیہ دہلی میں دی جانے والی ڈگریاں قسلیم نہیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے جامعہ کے طلبہ کو
اعلیٰ تعلیم اور ملازمت حاصل کرنے کے سلسلہ میں غیر معمولی مشکلات پیش آتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جو اعلیٰ تعلیم کے مصارف
برداشت کر سکتا تھا چنانچہ جامعہ ملیہ سے فارغ ہونے کے بعد میری تعلیم باہر ہوئی اس زمانے میں
آجکل کی طرح وظائف کا رواج نہ تھا اور ہر طالب علم کو ایسی سہولتیں میسر نہ تھیں جیسی کہ آجکل ہیں۔

جامعہ ملیہ کراچی کے قیام کے وقت حالات ماضی سے مختلف تھے۔ آزادی حاصل ہو چکی تھی۔ اب
ہم ایک آزاد قوم کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ حکومت سے عدم تعاون کا سوال

ہی نہیں تھا اس لئے ہم نے سوچا کہ ہم اپنے قومی اور ملی تقاضوں کے مطابق منظور شدہ نصاب کو اپنا کر اپنی آرزوؤں اور امنگوں کا محل تعمیر کریں گے،" ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے پر اعتماد لہجے میں انکشاف کیا۔ "ہم نے ابتدا ہی سے اسلامیات کی تعلیم کو جامعہ میں لازمی قرار دیا جبکہ ۱۹۵۲ء میں یہاں اسلامیات کی تعلیم لازمی نہیں تھی۔ ہمیں فخر ہے کہ اس میدان میں ہمیں اولیت حاصل ہے اور اگر ہم اپنے آپ کو پیش رو کہیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ ہم نے اپنے اسکول میں (Project Method) کا بھی آغاز کیا جو ہمیں جامعہ ملیہ دہلی سے وراثت میں ملا تھا۔ ہم نے جن جن چیزوں کو اچھا سمجھا ابتدا ہی سے رائج کر دیا۔ کالج میں اس قسم کے نئے تجربات کی گنجائش کم تھی اس لئے وہاں تعلیم کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے اداروں میں ہیں۔" ڈاکٹر صاحب بڑی تفصیل سے جذباتی انداز میں ہمیں معلومات فراہم کر رہے تھے دوران گفتگو اُن کے الفاظ ہاتھوں کے اشاروں سے مجسم ہوتے جا رہے تھے۔
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "ہمارا تصور یہ ہے کہ ہم تعلیم کے طریقوں میں اصلاحات کرتے رہیں تاکہ ہم بھی مستفیض ہوں اور دوسرے ادارے بھی نمونہ حاصل کر سکیں۔ یہ ہمارا اندازِ فکر ہے۔ کامیابی کے لئے بہت سے عوامل ضروری ہیں۔ میں اونچے دعوے کرنے کا عادی نہیں۔ مجھے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا بھی احساس ہے میں نے کوئی تیر نہیں مارا البتہ پوری ایمان داری سے اس خدمت کو انجام دینے کی کوشش کی ہے جو میں نے ایک جذبے اور لگن کے ساتھ قبول کی تھی۔ خون جگر پلا کر میں نے اپنی آرزوؤں کے اس ننھے پودے کی آبیاری کی ہے۔ زندگی کی رنگینیوں سے دامن چھڑا کر اپنی عمر اس کے لئے وقف کر دی لیکن اب مجھے اس پر فخر ہے نہ غرور، کیوں کہ قدرت اپنی منشا کے مطابق جس سے چاہتی ہے کام لیتی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اس نیک کام کے لئے اس کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔"

ڈاکٹر صاحب کی انکساری اُن کی عظمتوں کا اعلان کر رہی تھی لوگ دُنیا میں کچھ نہ کر کے بھی اپنے سر سہرے باندھتے پھرتے ہیں ہم سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کتنے عظیم انسان ہیں کہ بہت کچھ کرنے کے باوجود انہیں اپنے کارناموں پر نہ فخر ہے اور نہ غرور کاش ہماری قومی کشتی کے سارے ہی ناخدا ایسے ہوتے۔ جامعہ کے اغراض و مقاصد کی بات چلی تو ہم یہ معلوم کرنے کے لئے مچل گئے کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہم نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب! کیا جامعہ میں ان اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو رہی ہے جن کو پیش نظر رکھ کر آپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اگر ہو رہی ہے تو اس کی کیا وجوہ

ہیں؟ سوال کرنے سے پہلے ہمیں اپنے سوال کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا لیکن سوال کر دینے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر احساس کرب ابھر آیا وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور بڑے دکھ کے ساتھ کہنے لگے۔ یہ کسی تجربے کی کامیابی کے لئے بہت سارے عناصر ضروری ہیں مثلاً وسائل، افراد وغیرہ۔ ہمارے وسائل محدود ہیں اور مسائل بے شمار، کاش ہمیں وہ سارے وسائل مہیا ہوتے جنہیں برت کر ہم اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتے جہاں تک افراد کا تعلق ہے صرف جامعہ ہی نہیں پوری قوم قحط الرجال سے دوچار ہے۔ یہ ہمارا ایک قومی المیہ ہے۔ فکری و عملی تربیت کے فقدان کی وجہ سے قوم جذبہ ملی سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں تک رویے کا تعلق ہے ہم پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ جو افراد بھی ہمارے ساتھ ہیں ان کی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کریں ہمیں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں جامعہ ملیہ کی ترقی سے مایوس نہیں ہوں۔ میں اس وقت الزام تراشی کرنا نہیں چاہتا لیکن میرا تجربہ ہے کہ اس سلسلے میں ہماری رسائی بہت کم ہے۔" اسی دوران ہمارے سامنے چائے آچکی تھی۔ شام کا سہانا وقت تھا۔ ایک عظیم شخصیت کی رفاقت میں پی جانے والی چائے آج بھی یاد آتی ہے تو عجیب سا سرور محسوس ہوتا ہے۔ اساتذہ کی بات چلی تو ہم نے غیر ارادی طور پر ایک اور سوال کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب! کیا اساتذہ کے تقرر کے وقت ادارہ کے نصب العین کا خیال رکھا جاتا ہے؟ ممکن ہے ہمارا یہ سوال کسی حد تک شوخی یا گستاخی پر محمول کیا جائے لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے پوچھنا ہمارا حق تھا اور جواب دینا ڈاکٹر صاحب کا فرض۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

"بھئی آج کل آئیڈیل ٹیچرز بڑی مشکل سے ملتے ہیں ایک اصول پر کاربند، ایک طرح سے سوچنے والے۔ ایک ہی طرز پر کام کرنے والے ناپید ہیں۔ ہماری کوشش بہرحال یہی ہوتی ہے کہ جس کا ہم تقرر کرتے چلے ہیں وہ اچھا انسان ہو گفتار و کردار میں دوسروں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہو لیکن کوئی اپنے ماتھے پر لیبل لگائے نہیں پھرتا کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ میں اگرچہ اس وقت آپ سے گفتگو کر رہا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا خیال کیا ہے۔ آپ کس طرز فکر کے مالک ہیں۔ ٹھونک بجا کر، الٹ پلٹ کے دیکھ کر یا سونگھ کر تقرر کرنا مشکل ہے۔ ہم جان بوجھ کر کسی "غلط آدمی" کا تقرر نہیں کرتے۔ حالات بعد میں تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ بعض اوقات فیصلے کی غلطی بھی ہم سے سرزد ہو جاتی ہے لیکن یہ بات صرف ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ واقعات کی دنیا میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔"

ہمارا دوسرا سوال نظام تعلیم سے متعلق تھا۔ ہم نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب! آپ ایک زمانے میں وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں اس لئے موجودہ نظام تعلیم سے متعلق آپ کی رائے ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مسکراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "اچھے طلبہ کا تعلیمی معیار بہرحال اچھا ہوتا ہے لیکن اگر طلبہ کی اکثریت کا معیار اچھا ہو تو اسے نظام تعلیم کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ جس طالب علم کی تعلیم بنیادی طور پر ناقص ہو اس کو کوئی نظام بھی ٹھیک نہیں کرسکتا۔ اچھا طالب علم ہر نظام سے استفادہ کرہی لیتا ہے۔ لیکن جو نظام تعلیم آج کل رائج ہے اس کے لئے مجھے یہ تسلیم کرنے میں قطعاً عار نہیں کہ اس کا معیار پست ہے۔"

نظام تعلیم میں ذریعہ تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ معاً ہمارا ذہن قومی زبان کی طرف منتقل ہوگیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم نے پوچھا: جامعہ نے قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کیا مثبت اقدامات کئے ہیں؟ بغیر کسی تامل کے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔" قومی زبان کے لئے ہم نے اپنا بہت نقصان کرلیا۔ ہم پر جتنا بوجھ اس سلسلے میں پڑا وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ معاشرے میں آج کل وہ اسکول اچھے اور معیاری سمجھے جارہے ہیں جن کا میڈیم انگریزی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ اٹھارہ انیس سال سے ہم پر کتنا دباؤ ڈالا جاتا رہا اور ہم سے کہا جاتا رہا کہ انگلش میڈیم بنالیا جائے یا انگلش سیکشن علیحدہ کھول دیا جائے۔ پھر فیشن کے مطابق حسب دلخواہ فیسیں وصول کی جائیں اس طرح یہ روز روز کا مالی بحران بھی ختم ہوجائے گا اور اسکول بھی خودکفیل ہوجائے گا۔ ہمارے لئے یہ سودا بہت سستا تھا لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے اپنا آئڈیل سامنے رکھا۔ کالج میں یونیورسٹی کی مقرر کردہ راہ پر چل کر ہم اردو اور انگریزی ہردو زبانوں میں تدریس کا کام کرتے ہیں۔" پتہ نہیں ماضی کی کن یادوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا تھا وہ بتارہے تھے۔" ہر کام کسی مقصد سے ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کا نصیب قومی زبان کے بارے میں بہت ہی خراب رہا۔ ایک معمولی سی مثال لیجئے۔ ترکی زبان کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ تیسری بڑی زبان ہے جو اسلامی زبان کہلاتی ہے لیکن کمال اتاترک نے اس کے رسم الخط کو اپنے دامن سے جھٹک دیا اور رومن رسم الخط کو اپنایا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ماضی سے رشتہ ختم کردیا جائے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ قوم جس کے پاس ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کتابیں ایک خاص رسم الخط میں موجود ہوں اور وہ رات کے بعد صبح کو یہ اعلان کردے کہ یہ کتابیں ہماری نہیں۔ میرے نزدیک یہ انتہائی غلط پالیسی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی ماضی سے

سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں اگر ہم بھی اپنے ماضی سے علٰحدگی اختیار کرنا چاہتے ہیں تو بے شک یہ بڑی اہم
چیز ہے اس سے بہتر کوئی اور آلہ نہیں ملے گا لیکن بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اسے مناسب
سمجھتے ۔" ڈاکٹر صاحب اس وقت آب دیدہ ہو گئے ان کی آنکھوں میں کرب اور بے چینی کا سیلاب اُمڈ آیا
وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہے تھے ۔" جب میں ترکی میں CITY OF SEVEN HILLS یعنی استنبول گیا
جہاں پانچسو مسجدیں ہیں اور ہر بلند پہاڑی پر ایک نہایت خوبصورت مسجد بنی ہوی ہے جو دُور دُور
تک اسلامی تمدن کا اعلان کرتی ہے یہ مسجدیں مسلم فن تعمیر کا شاہکار ہیں ۔ایک مسجد کو اندر جاکر دیکھنے کا
اتفاق ہوا تو چند امریکی خواتین ایک ترک گائڈ کے ساتھ تھیں یہ وہ عورتیں تھیں جو مالدار لوگوں سے شادی
کرتی ہیں پھر اُن کی وفات کے بعد اُن کے سرمائے سے دُنیا کی سیاحت کرتی ہیں یہ خواتین مسجد سے متعلق
معلومات حاصل کر رہی تھیں ایک بوڑھی عورت نے گنبد کی طرف اشارہ کرکے گائڈ سے پوچھا وہ کیا لکھا
ہے ۔ اگنبد پر عربی رسم الخط میں اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ، لکھا تھا) گائڈ نے جواب
دیا:" NOTHING MADAM THESE ARE SYMBOLS " گائڈ کے اس جواب پر میری
گردن شرم سے جھک گئی اور دل خون کے آنسو رونے لگا ۔میں نے کہا افسوس ماضی سے علٰحدگی اور
وہ بھی ایسی کہ " بنیادیں" تک " سمبل" بنادی گئیں ۔بے شک اگر اسی منزل تک ہمیں بھی پہنچنا ہے تو
اس کے لئے اس سے زیادہ " مؤثر" طریقہ کوئی اور نہیں کہ ہم اپنے رسم الخط اور اپنی قومی زبان کو
خیرباد کہہ دیں ۔"

ہم نے محسوس کیا کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مضراب غم کو چھیڑ دیا ہے ۔تار جھنجھنا اُٹھے ہیں اس لئے ہم
نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ۔" ڈاکٹر صاحب! آزاد کشمیر میں آجکل جو انقلابی اقدامات کئے جا رہے ہیں
کیا آپ اُن سے جامعہ میں استفادہ کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں ؟" ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا بڑا مختصر جواب
دیا، فرمایا:" میں نے ابھی ان اقدامات کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن بظاہر میں سمجھتا ہوں کہ بڑے
مفید اور بروقت اقدامات ہیں ۔"

تفصیل تو ہمیں بھی مطلوب نہ تھی یہ سوال تو ہم نے ڈاکٹر صاحب کا موڈ بدلنے کے لئے کیا تھا اور
اس کوشش میں ہم کامیاب رہے اس کے فوراً بعد ہم نے ایک ایسا سوال کر دیا جو طلبہ کو دوراہے پر لاکر
کھڑا کئے ہوئے ہے ۔ہم نے پوچھا:" ملکی حالات کے پیش نظر کیا طلبہ برادری کو براہ راست ملکی سیاست

میں حصہ لینا چاہیئے جبکہ آج سیاست ہمارے یہاں ایک نظریاتی جنگ بھی بن گئی ہے ؟" ڈاکٹر صاحب کے
ہونٹوں پر ایک معنی خیز خندہ تبسم پھیل گیا۔ ایک شفیق اُستاد کے لہجے میں بولے ۔" ابھی وقت پڑا ہے۔
طالب علم ہمارا حق یافتہ PRIVILLAGED طبقہ ہے انہیں پہلے مسائل سمجھنے چاہئیں۔ میں اس کا
قائل نہیں ہوں کہ طلبہ عملی سیاست میں بغیر سوچے سمجھے کُود پڑیں۔ نظریاتی جنگ کے بھی نظریاتی پہلو ہوتے
ہیں اور پھر اس کے عملی پہلو، طلبہ کو چاہیے کہ وہ نظریاتی پہلو پر زیادہ نظر رکھیں۔ دیکھئے نا! جب تک آپ عمر
کے ایک خاص اسٹیج تک نہ پہنچ جائیں اور برسر روزگار نہ ہو جائیں آپ شادی نہیں کرتے بالکل اسی طرح
جب تک آپ عملی سیاست کو سمجھنے اور اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وادی خارزار
میں نہیں کودنا چاہیئے۔ سیاست کوئی شجر ممنوعہ نہیں لیکن بہرحال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ طلبا پر سیاست
میں حصہ لینا اس وقت فرض ہوتا ہے جب وہ علم و ہنر، فکر و نظر اور فہم و فراست سے لیس ہو جائیں۔" ہم
سے نہ رہا گیا عرض کیا ۔" لیکن ڈاکٹر صاحب! آج کیفیت یہ ہے کہ گھر میں آگ نہیں لگی ہے بلکہ گھر آگ
میں جل رہا ہے کیا اس وقت ہم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ گھر کو بچانے کے سلسلے میں ہم بھی اپنا
حصہ ادا کریں۔" ڈاکٹر صاحب بھی آج دل کھول کر ہمیں سارے راز و نیاز بتانے کے موڈ میں تھے۔
فرمانے لگے ۔" دنیا میں سارے کام اشتراک عمل اور تقسیم عمل سے ہوتے ہیں آپ کے ذمے حصول تعلیم ایک
فرض ہے۔ آپ اس کو صحیح طور پر انجام دے لیں تو یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہوگی۔ بعض اوقات شعلے
ایندھن نہ ملنے پر خود ہی سرد پڑ جاتے ہیں آپ کی شکایت بجا۔ میں خود بھی دیکھ رہا ہوں کہ طلبہ کا طبقہ
اس وقت سخت مضطرب ہے آپ کا فرض ہے کہ آپ سلجھاؤ کی فکر کریں پھر آپ ہی کو یہ مسائل حل کرنے ہونگے۔"

ڈاکٹر صاحب ایک سوال ہم آپ سے اور کرنا چاہتے ہیں۔" اس وقت ملک میں نظریاتی جنگ کی جو
آگ بھڑکی ہوئی ہے اس کی لپیٹ سے تعلیمی ادارے بھی محفوظ نہ رہ سکے بلکہ زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ تعلیمی
اداروں ہی سے اس آگ کو ایندھن فراہم کیا جا رہا ہے۔ طالب علم کی حیثیت سے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں
کہ آپ جامعہ کو کن خطوط پر چلانا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل
میں وہ ہماری جرأت رندانہ پر مسکرائے ضرور ہوں گے۔ انھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا:" جامعہ ملیہ
در و دیوار کا نام نہیں ہے بلکہ طلبہ اور اساتذہ جامعہ ملیہ کے لئے جسم اور روح ہیں۔" ایسا لگ رہا تھا
جیسے کوئی اپنے سرمایہ حیات کی روداد بیان کرنے چلا ہو۔ وہ کہہ رہے تھے ۔" طلبہ اور اساتذہ اس ادارہ

کو دوسرے اداروں سے ممیز کرسکتے ہیں ان کا تخیل اور کردار ایک نہج فراہم کرتا ہے۔ آئندہ ہمارے ساتھ کون لوگ ہوں گے، اساتذہ کا رویہ کیا ہوگا یہ انہی کو سوچنا چاہیئے اگر وہ کسی اور طرز پر سوچتے ہیں تو ادارہ بھی ظاہر ہے اسی ڈھب پر چل پڑے گا۔ یہاں ہندوستان جیسے حالات نہیں ہیں۔

جامعہ ملیہ کا خمیر ہم نے مولانا محمد علی جوہر کی ان ایمان افروز اور روح پرور تقریروں سے گوندھا ہے جو وہ جامعہ ملیہ دہلی میں نماز فجر کے بعد کیا کرتے تھے۔

ہمارے کانوں میں آج بھی مولانا کی آواز گونجتی ہے۔ ہمارا ذہنی ڈھانچہ انہی کا تیار کردہ ہے اس لئے ہمارا طرز فکر بھی وہی ہے جو مولانا کا تھا۔

لوگ اب ہوا کا رُخ دیکھ کر چلنے لگے ہیں۔ جامعہ ملیہ کے لئے ایک اجتماعی تنظیم ہے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے ملک و ملت کے تقاضوں کے مطابق فرزندانِ قوم کی بہتر نشوونما کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے صحیح اسلامی خطوط پر چلائے۔"

تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو مزید زحمت دینا مناسب نہ سمجھا لیکن پھر بھی عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب ہماری خواہش ہے کہ طلبہ برادری کے لئے بالعموم اور جامعہ کے طلبہ کے لئے بالخصوص کوئی پیغام آپ ہمیں دیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "بھئی میں تو اپنے آپ کو ایک اوسط درجہ کا انسان سمجھتا ہوں۔ پیغام دینا تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ لیکن آپ کی خواہش کو مسترد بھی نہیں کروں گا کسی اور وقت دی

فن تعمیر اور مصوری کے علاوہ، فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلمانوں نے کمال حاصل نہیں کیا ہو۔ خطاطی کو انھوں نے ایک اعلیٰ درجے کے آرٹ میں تبدیل کر دیا۔ عجائب گھروں میں آج بھی ہم کو ایسے نمونے ملتے ہیں جو باوجود عصر حاضر میں فن طباعت کی اس قدر ترقی کے اپنا جواب پیدا نہیں کر سکے۔ محمود حسین

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

سایہ دار درخت

مکرم بندہ تسلیم

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ڈاکٹر محمود حسین کے متعلق ایک مختصر نوٹ ملفوف ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو خط کی شکل میں شائع کریں۔ دماغ حاضر نہیں اور نہ صحت اس قابل ہے کہ تفصیل سے کچھ لکھتا۔

ڈاکٹر محمود حسین کی رحلت کا غم ابھی تازہ ہے اور مدتوں باقی رہے گا۔ ممتاز حسن کی طرح ان کی شخصیت کی مثال کسی سایہ دار درخت سے دی جا سکتی ہے جس کے کٹ جانے کے بعد آس پاس آسرا نہیں رہتا۔ خاص و عام میں وہ یوں مقبول تھے کہ "ان کا ظاہر و باطن ایک تھا علم و تہذیب کے جوہر کو انھوں نے ذات میں اس طرح سمیٹا تھا کہ ترقیٔ درجات کے ساتھ اس میں انکسار کا رنگ نکھرتا گیا۔ اس کے باوصف وہ اپنے اصولوں کے سختی سے پابند تھے اور ان کی مروّت کو مفاہمت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مجھے وہ اپنے برادران بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ڈاکٹر یوسف حسین کے قریبی نیاز مند کی حیثیت سے جانتے تھے اور قیام پاکستان سے لے کر اب تک میں ان کی شفقت سے سرفراز رہا۔ برصغیر کے عہد حاضر میں اور کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ تین بھائیوں نے بیک وقت قیملی زندگی میں ایسا روشن کردار ادا کیا ہو۔

مولوی عبدالحق نے جن تازہ واردوں کے لئے خضر کا کام کیا۔ ان میں یوسف حسین اور محمود حسین بھی شامل تھے۔ یورپ سے جب یہ فارغ التحصیل ہو کر لوٹے تو دُنیا میں اقتصادی بحران اور کساد بازاری کی وجہ سے ملازمتوں کا بڑا توڑا تھا اور ہندوستان میں تو اچھے اچھوں کو نوکر کیا چاکری بھی نہ ملتی تھی۔ مولوی صاحب کے اثر و رسوخ نے یوسف حسین کو جامعہ عثمانیہ میں لیکچرار کی جگہ دلوائی۔ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر اے۔ ایف۔ ایم۔ کے رحمن سے ان کی دوستی محمود حسین کے کام آئی۔ یہ ۳۳ء کی بات ہے۔ پھر ظہور پاکستان کے ساتھ ان کا ستارہ ایسا چمکا کہ

ریڈر سے پروفیسر اور پروفیسر سے نائب وزیر اور پھر ۱۹۵۱ء میں وزیر کابینہ کے منصب تک پہنچے۔ اگلے سال جب گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برخاست کیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین سے پُرانے مراسم کی بنا پر انھیں نوزائیدہ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا۔ پھر تو ڈاکٹر محمود حسین یہیں کے ہو رہے اور یونیورسٹی کی تعمیر و تشکیل میں ان کا جو حصہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

تنظیم و انتظام نیز درس و تدریس میں ان کا اتنا وقت صرف ہوا کہ وہ تاریخ کے کسی موضوع پر وسیع اور قابل توجہ کام نہ کر سکے۔ انھیں اس امر کا احساس تھا اور اگر زندگی مہلت دیتی تو وہ اس کی تلافی کرتے۔

میری دانست میں ڈاکٹر محمود حسین کا بڑا کارنامہ جامعہ تعلیم ملّی (مالیر) کا قیام ہے۔ اسے وہ جامعہ ملیہ (دہلی) جیسے کردار ساز ادارہ کا نقش ثانی بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے بڑی جاں فشانی کی۔ جب اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا، وہ وزیر تھے اور میں وزارت تعلیم سے وابستہ۔ بارہا ان سے جامعہ کے معاملات پر گفتگو ہوئی اور اس کی توسیع کے منصوبے زیر بحث آئے۔ ڈاکٹر محمود حسین کی اصل یادگار یہی ہے اور سرکاری تحویل میں آجانے کے بعد کاش اسے اپنے بنیادی خطوط پر گامزن رہنے کا موقعہ ملے۔

> فن تعمیر کے علاوہ مصوری میں بھی مسلمانوں نے کمال حاصل کیا، چنانچہ مسلمان مصوروں کا درجہ دنیائے مصوری میں بہت بلند ہے۔ اور ان کی قومی خصوصیات وانفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ مغلوں کی مصوری کو ہی لیجئے۔ اُن کی مصوری، اُن کی زندگی کی طرح روشن۔ ان کے تخیل کی طرح رنگین۔ اُن کے جذبات کی طرح جوان، اور ان کی شاعری کی طرح مرصّع ہے۔ رنگوں کا انتخاب و امتزاج، خطوط کی وضاحت و دلکشی۔ موضوع کی شگفتگی و اہمیت مغلوں کی مصوری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان کی تصویروں میں زندگی سانس لیتی معلوم ہوتی ہے اور اپنے زمانے کے معاشرے کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ (محمود حسین)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

شرافت کا جوہر

برادرم فرمان صاحب! سلام علیکم

ڈاکٹر محمود حسین صاحب اور ان کے خاندان سے میری واقفیت بہت پرانی تھی۔ میرے خاندان کے اکثر لوگ حضرت نیاز بریلوی کے صاحبزادے شاہ نصیر الدین اور ان کے خلیفہ جناب نصیر الزماں صاحب سے بیعت تھے اور نصیر الزماں صاحب قائم گنج (فرخ آباد) کے رہنے والے اور ڈاکٹر صاحب کے خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے، پھر علی گڑھ آیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سے براہ راست نیاز حاصل ہوا۔ مسعود حسین خاں جواب جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر ہیں۔ اس زمانہ میں شعبہ اردو میں طالب علم تھے اور میں نیا نیا اسی شعبہ میں لکچرار مقرر ہوا تھا۔ پاکستان بنا تو میں انگلستان سے سیدھا یہاں چلا آیا اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے متعلق ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد خاں صاحب وزیر مملکت مقرر ہوئے۔ گرمیوں میں اہل پنجاب کا ثقافتی مرکز لاہور سے مری منتقل ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں فضل احمد کریم فضلی صاحب کے یہاں جو اس وقت امور کشمیر کے سیکرٹری تھے۔ مجھے خاں صاحب سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ پھر میں ۱۹۵۶ء میں کراچی چلا آیا اور جب سے اب تک مجھے ان کی رفاقت، شفقت اور بزرگی کا تجربہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ چونکہ پٹھان تھے اس لئے مزاج میں کسی قدر سختی تھی لیکن اس جلال کا اظہار بہت ہی کم ہوتا تھا۔ ان کی تصویر جواب بار بار میرے سامنے ہے۔ وہ مسکراتے بلکہ قہقہے لگاتے ہوئے خاں صاحب ہیں۔ وہ زندہ دل، اور خوش باشی کے قائل تھے اور انتہائی پریشانی کے موقعوں پر بھی ضبط و تحمل اور استقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے تھے۔ میں مردانگی اور جرأت کو ہی ان کی سب سے نمایاں خصوصیت سمجھتا ہوں۔

لوگ عام طور پر مصروف زندگی گزارتے ہیں تو ان کے معمولات میں فرق آجاتا ہے۔

لیکن خاں صاحب جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس میں وضعداری اور وفاداری بشرطِ استواری، شرافت کے جوہر سمجھے جاتے تھے۔ اور خاں صاحب ان جوہروں کا مثالی مجسمہ تھے۔ اُن کی وضع قطع، ان کے لباس، گفتگو، نشست و برخاست، احباب سے ان کے تعلقات۔ اُن کے مزاج، قول اور فعل میں یہ وضعداری ہمیشہ قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار جو تصویر ان کی سامنے آتی ہے وہ ایک ہی ہے۔

وہ بڑے اچھے منتظم تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی ذمہ داری ایک بڑے نازک دور میں سنبھالی اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اس جامعہ کی بڑی خدمت کی، جو شاید کسی اور سے ممکن نہ تھی، ہماری جامعات کے سربراہوں کی اس نسل کے وہ آخری نشان تھے جن کو میں دیو قامت کہتا ہوں۔ افسوس کہ ان کی جگہ ایسی خالی ہوئی جس کے پر ہونے کے لئے آنکھیں ان جیسے آدمی تلاش کرتی ہیں اور خالی لوٹتی ہیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

ہمارے ملک میں سنجیدہ مضامین پر تصانیف کی کمی بڑی بری طرح محسوس کی جارہی ہے اولاً ایسی کتابیں لکھی نہیں جاتیں۔ لکھی جاتی ہیں تو فروخت نہیں ہوتیں۔ مجھے دو ایک رسائل کا علم ہے جو کئی کئی سال جاری رہے اور ان میں بڑے بڑے وقیع مضامین چھپے۔ مگر ان کی اشاعت ۳۰، ۴۰ سے آگے نہ بڑھی اور آخر میں انھیں بند کرنا پڑا۔ گذشتہ آٹھ برس میں اولاً تو معیاری کتابوں کا کال رہا اور جو شائع ہوئیں انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ پھر بھی ان سے ناشر اور مصنف کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ صورت مضمون نگار اور ناشروں کے لئے حد درجہ حوصلہ شکن ہے اور ہم سب کے لئے بڑی شرم کا باعث ہے۔ اگر ہماری ادبی ترقی ہمیشہ کے لئے رک نہیں گئی ہے، اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، تو اس صورت حال کو بدلنا ہوگا۔

محمود حسین

ڈاکٹر احسان رشید

سچا موتی

محبّ مکرم فرمان صاحب۔ تسلیم

آپ ڈاکٹر صاحب کی یاد میں نگار کا خاص نمبر نکال رہے ہیں کتنا بڑا اور اچھا کام آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے شایانِ شان ہوگا آپ نے بڑی محبت اور عنایت سے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں بھی اس موقع پر کچھ عرض کر سکتا ہوں آپ کی اس فرمائش کو پورا کرنا ہر اس شخص کے لئے ایک خاص اعزاز ہے جو ڈاکٹر صاحب کو عزیز، محترم اور گرانمایہ کہتا ہے میں نے آپ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وقتِ مقررہ پر میں اس فرمائش کی تعمیل کر دوں گا لیکن اب جبکہ وہ مقررہ وقت بھی ختم ہو چکا ہے کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو ڈاکٹر صاحب کی یاد کچھ اس طرح آتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس طرح گرفت میں لاؤں مجھے یقین ہے کہ اس کیفیت سے ہر وہ شخص دوچار ہوگا جو ان کی یاد میں کچھ لکھنا چاہے گا۔ اتنا کہنے میں شاید میں حق بجانب ہوں گا کہ اس کیفیت سے آرٹسٹ اور ادیب دوچار ہوتے ہیں تو تخلیق کے نئے دریچے کھول لیتے ہیں میرا شمار ان لوگوں میں ہے جو تخلیقی احساس اور تجربہ سے عاری ہوتے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میری تحریر نگار کے قارئین کے لئے محض بارِ خاطر ہوگی اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری آپ پر بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت علم اور عمل کی جن اعلیٰ اقدار کی حامل تھی اس کی بناء پر وہ ہماری تہذیب اور شائستگی کی انتہائی دلآویز اور معنی خیز علامت بن گئی۔ ان کی صورت کا حُسن، اس کا جلال اور جمال خود قدرت کی فیاضیوں کا ایک نادر نمونہ تھی۔ ان کی سیرت ایک ایسے سچے موتی کی مانند تھی جس کی پرورش میں خود ان کی ذاتی صلاحیتوں کو دخل تھا انسانی شخصیت کے تمام اجزاء کو قدرت خود ودیعت کرتی ہے لیکن ان کی تشکیل و تعمیر خود اس شخص کی کوششوں سے عبارت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سیرت کی تعمیر میں بہت سے عوامل شامل ہوں گے لیکن سب سے بڑا عنصر خود ان کا وہ عمل ترک و انتخاب تھا جسے وہ بروئے کار لائے ان کی انسان دوستی، شیفتگیٔ علم اور تقوے جو عمر بھر ان کا شعار رہا خود ان

کا ذاتی کارنامہ تھا۔

ہماری تہذیبی زندگی میں ایک اچھے اور بڑے انسان کی سب سے اچھی اور بڑی تصویر اقبال نے پیش کی ہے میرے نزدیک اس تصویر کی جتنی مکمل نمائندگی اس ملک کی عصری تاریخ میں ڈاکٹر صاحب نے پیش کی ہے وہ کم ہی لوگوں کے حصّے میں آئی۔ جہاں تک میرا علم ہے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں دو شخصیتوں کا بہت بڑا حصہ ہے جن سے ان کا گہرا ذاتی تعلق تھا ایک ان کے بڑے بھائی ذاکر صاحب دوسرے مولانا محمد علی جوہر۔ یہ دونوں ان کے بزرگ تھے، ان دونوں نے اچھے اور بڑے انسان بنانے میں جو کوشش کی اس سے ہم اور آپ واقف ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بارے میں یہ کہنا قطعاً صحیح ہوگا کہ وہ ان بزرگوں کے خواب کی تعبیر تھے۔

ہم جب کبھی کسی شخص کے بارے میں جو بے شمار صفات کا حامل ہوتا ہے مختصراً کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اسے ستودہ صفات قرار دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اس کا استعمال یقیناً ایک اجمالِ بلیغ ہے۔ ان کی پوری زندگی پر نظر ڈالئے تو یہی نظر آتا ہے کہ ہر دور میں ان کی ذات میں نئی صفات شامل ہوتی رہیں اچھا اور بڑا آدمی صرف کسی قوم یا گروہ کی میراث نہیں ہوتا وہ انسان کی اور انسانیت کا نمائندہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں مشرق اور مغرب کا امتیاز کچھ معنی نہیں رکھتا اس لئے کہ نہ صرف ان کے خیال سے بلکہ ان کی عملی زندگی سے اقبال کے اس شعر کی تصدیق ہوتی ہے

؎ مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ڈاکٹر صاحب رہے اس لئے کہ ان کو دیکھ کر، اُن سے مل کر اور اُن کو برت کر ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ بچپن جوانی اور بڑھاپے کی تخصیص بے معنی سی چیز ہے وہ زندگی کی ایک ایسی زندہ رو تھے جس میں حیاتِ انسانی کے مختلف ادوار کے سب دھارے ہمہ وقت شامل رہے۔ اس طور پر ان کی زندگی ایک کبھی خشک نہ ہونے والا دھارا تھی جس نے دریائے حیات کو کبھی خشک نہ ہونے دیا اور جب بھی اور جہاں بھی اس کا گزر ہوا اس نے تشنہ کاموں کو سیراب کیا اور یہ بات ثابت اس طرح ہوتی ہے کہ اب جب کہ ڈاکٹر صاحب دور، بہت دور چلے

گئے ہیں وہ لوگ جو ان سے قریب اور متعلق تھے تشنہ سے تشنہ تر ہوتے جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا یعنی ان کا حشر کیا ہوگا؛ اس کا جواب بھی ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی سے ملتا ہے وہ چشمہ جس کا وہ خود دھارا تھے وہ ان کی ہی کوہکنی سے پھوٹا تھا کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے ان کی اس کوہکنی کا؛ اس لیے کہ یہ صرف کوہکنی نہیں تھی انھوں نے "قانونِ باغبانیٔ صحرا" نوشت کیا تھا کیا ہم کو جو اپنے کو ان کا نام لیوا کہتے ہیں اس کا احساس ہے؟۔

> اب تک ہماری سرکاری زبان انگریزی ہے۔ یہی دفاتر کی زبان ہے۔ اسی میں سب سرکاری کاروبار ہوتے ہیں۔ یہی تجارتی زبان ہے، اندرونی و بیرونی تجارت میں یہی استعمال ہوتی ہے۔ ہمارے بنکوں میں حساب کتاب اسی میں رکھے جاتے ہیں۔ ہماری سڑکوں پر اسی زبان کے بورڈ آویزاں ہیں۔ غرض ہر جگہ پاکستان میں انگریزی کا رواج ہے۔
>
> یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ انگریزی زبان ہندوستان پر فرنگی تسلط کی مکروہ نشانی ہے۔ یہ وہ زنجیرِ غلامی ہے جس کو ہمارے بدیسی آقاؤں نے ہمارے گلے میں زبردستی پہنایا۔ غلامی کی حدیں بڑھ کر ذہنی غلامی تک پہونچ گئیں اور یہ فرنگی سیاست کی سب سے زیادہ خطرناک چال تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نوجوان، انگریزی قالب میں ڈھل کر نکلنے لگے اور ان کی پرواز کلرکی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ محمود حسین

سید ہاشم رضا

اسلام اور پاکستان کا عاشق

مکرمی و محترمی ، سلام مسنون

آپ نے جون کے 'نگار' کو ڈاکٹر محمود حسین کے لئے وقف کر کے علم و ادب کی بڑی خدمت کی ہے ، مرحوم کی عظیم خدمات کا تقاضہ بھی یہی تھا ۔ میری مرحوم سے شناسائی بعیق پاکستان اگست ۱۹۴۷ء سے تھی لیکن مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ڈھاکے میں ۱۹۶۱ء میں ملا جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا چانسلر اور ڈاکٹر صاحب مرحوم اس پُر آشوب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے فرائض بڑی تندہی اور نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہے تھے ، ان کی کچھ صفات تو ایسی تھیں جن پر ' تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ' کا اطلاق ہوتا ہے لیکن بہت سی صفات ایسی تھیں جو انھوں نے تعلیم و تدریس کو اپنی زندگی کا مشن بنا کر حاصل کی تھیں ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ان کے نامور بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے تعلیم کے میدان میں ویسا ہی نام پیدا کیا جیسا کہ سیاست کے میدان میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے پیدا کیا تھا ، دِلّی کی جامعہ ملیہ اور ملیر کی جامعہ ملیہ دونوں بھائیوں کی بہترین یادگاریں ہیں ۔ ڈاکٹر محمود حسین اس تہذیب کی یادگار تھے جس میں حفظِ ماتقدم کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا یہ ان کی وضعداری تھی کہ وہ ہر کہ ومہ سے اس خندہ پیشانی سے ملتے تھے کہ ملنے والے کو یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ وہ ان سے کمتر ہے ۔ شرافتِ نسبی کے ساتھ ساتھ ان کی شرافتِ قلبی ان کے ملنے والوں کو متاثر کرتی تھی ۔

ان کی تعلیم کی تکمیل جرمنی میں ہوئی ، وہ برسہا برس مغرب میں رہے لیکن میں نے انھیں کبھی سوٹ اور ٹائی میں ملبوس نہیں دیکھا ۔ وہ ہمیشہ شیروانی میں نظر آئے اور ان کی جامہ زیبی کی وجہ سے شیروانی ان پر بہت بھلی لگتی تھی ، ڈھاکہ یونیورسٹی جب ستر سال پہلے قائم ہوئی تھی تو وہ بنگال کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بنی تھی ۔ اس یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی

علیگڑھ کی طرح پاکستان کی اساس بننا چاہیئے تھا لیکن افسوس ہے کہ اس یونیورسٹی کے ہندو پروفیسروں نے مسلمان طالب علموں کے ذہنوں کو وطنیت کے شکنجے میں جکڑ دیا اور ملت کی راہ مستقیم سے ہٹا دیا، جب تک ڈاکٹر محمود حسین مرحوم ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انھوں نے ہندو پروفیسروں کی ریشہ دوانیوں کا بہت کچھ سدِباب کیا۔ انھوں نے ڈھاکہ میں اپنے عہدے سے اس وقت استعفیٰ دیا جب حکومتِ مشرقی پاکستان نے ان کی ان تجاویز پر دھیان نہیں دیا جو انھوں نے اس یونیورسٹی کو بنگالی قومیت کا آلۂ کار بننے سے روکنے کے لئے پیش کی تھیں وہ عزت اور آبرو کے ساتھ ڈھاکے سے کراچی منتقل ہو گئے۔

۱۹۶۷ء میں جب مجھے کراچی یونیورسٹی کے سینیٹ اور بعد میں سنڈیکیٹ میں شامل کیا گیا اس وقت ڈاکٹر صاحب تاریخ کے شعبے کے سربراہ تھے اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ وہ انتظامی مسائل میں ڈاکٹر محمود حسین کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سینٹ اور سنڈیکیٹ کے اجلاسوں میں ڈاکٹر محمود حسین کی کوششیں ہمیشہ یہ ہوتی تھیں کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے اور حتی الوسع افراط اور تفریط سے احتراز کیا جائے، میں نے ان جلسوں میں ان کی جبیں پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔ طالبعلموں کی بہبود ہمیشہ ان کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی تھی، ڈاکٹر صاحب مرحوم بڑے ہنس مکھ آدمی تھے، وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں بھی کوئی نہ کوئی ہنسی کا پہلو نکال لیتے تھے۔ ان کی ہنسی ساری محفل کو شگفتہ کر دیتی تھی، وہ تقریر سے زیادہ عمل پر زور دیتے تھے۔ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو وہ اس کو اپنا ہی مسئلہ سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ معمولی معمولی گھروں میں اسی شان سے داخل ہوتے تھے جیسے کہ حکومت کے ایوانوں میں، وہ اپنے زیردستوں سے بھی اسی طرح ملتے تھے جیسے کہ اپنے ہمسروں سے ان کی زندگی کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر تھا کہ انھیں اسلام اور پاکستان سے عشق تھا اور یہی کشش تھی جو انھیں ان کے آبائی وطن سے کراچی کھینچ لائی، ایسے لوگ جو کہ لوگوں کے دلوں پر نقوش چھوڑ جاتے ہیں ہم سے جدا تو ہو جاتے ہیں لیکن مرتے نہیں، وہ ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو زندگی کے کٹھن سفر میں دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں، ڈاکٹر صاحب مرحوم جیسے خوش نصیب لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎ نازم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

حکیم محمد سعید

بیادِ محمودؔ

مکرمی فرمان صاحب

آج میں جس عظیم انسان پر اظہارِ خیال کرنے بیٹھا ہوں اگرچہ اس کا جسدِ خاکی ہم میں موجود نہیں ہے۔ تب بھی اس کی معنوی شخصیت، اس کا کردار، اس کی سیرت ہمارے لئے ایک ایسی روشن مثال ہے جو صدیوں تک دلوں کو گرماتی رہے گی۔

ڈاکٹر محمود حسین صاحب جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل روتا ہے۔ اپنی سیرت و شخصیت میں زندگی کی وہ تمام رعنائیاں اور کردار کے وہ تمام محاسن رکھتے تھے جن کی بنا پر کسی شخصیت سے محبت کی جاتی ہے اور عقیدت سے رکھی جاتی ہے اور جس کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔ آہ صد آہ! کتنی بڑی دولت ہم سے چھن گئی اور کتنی جلد چھن گئی۔ وہ دولت جو ہمیں بے مانگے مل گئی تھی اور جس کی ہم نے قدر نہ جانی۔ عظمت و انکسار بہت مشکل سے یکجا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب علم و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ اس کے ساتھ ان میں جو حلم اور جو عجز و انکسار تھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وہ کبھی اپنی کسی بات کسی عمل، سے اپنی بڑائی کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی عظمت، ان کی بلندی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ سادگی کا مجسمہ تھے۔ خوش اخلاقی اور خوش مزاجی ان کی سرشت تھی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اصولوں کے بڑے پابند تھے لیکن اس کے باوجود دوست نوازی اور دلنوازی کی شان ان میں پوری رعنائی کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اقبال کے اس مصرع کی صحیح تعبیر تھے۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

اپنی کم آمیزی اور علمی مزاج کے باوصف جب بھی میں نے ان سے درخواست کی اور ان کو کسی مجلس میں شرکت کی زحمت دی انھوں نے کبھی میری درخواست رد نہ کی۔ علمی مشاغل۔ تدریسی مصروفیات اور اس کے ساتھ انتظامی الجھنیں کبھی انھیں اپنے کسی نیازمند کی دلجوئی سے باز نہ رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ایک استاد تھے اور ان کو اپنی یہ حیثیت بہت عزیز تھی۔

ایک استاد میں جو انہماک اور جو بے نیازی ہونی چاہیئے وہ ان کے مزاج کا جزو تھی۔ ایک معلم کو اپنے موضوع پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کے لیے مشفق و مہربان بھی ہونا چاہیئے۔ علم کے ابلاغ سے اس کو آشنا لگاؤ ہونا چاہیئے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو اس کے سامنے کم تر سمجھے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی گواہ ہے کہ وہ تاریخ کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے طالبعلموں سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ اپنے پیشے سے ان کو اتنی محبت تھی کہ پروفیسری کے مقابلے میں وہ بڑے سے بڑے منصب کو بھی کم تر سمجھتے تھے۔ ملک کی خدمت انھوں نے مختلف حیثیتوں میں کی۔ دستور ساز اسمبلی کے رکن اور مرکزی حکومت کے وزیر بھی رہے۔ تحریک پاکستان میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، ایک مورخ کی حیثیت سے بھی تدوینِ تاریخ پاکستان میں اہم حصہ لیا۔ لیکن ان کے مشاغل میں مرکزی اہمیت درس و تدریس کو ہی حاصل رہی۔ جامعہ تعلیم ملی کا قیام بھی ڈاکٹر صاحب کی تعلیم سے دلچسپی کا ایک مظہر ہے۔

سنا ہے، دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے کہ عقل کی کم مائیگی سے علم کو غرور آجاتا ہے۔ اور پھر عالم آمر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عذاب ہے، نہ صرف عالم کی ذات کے لیے بلکہ قوم و ملت کے لئے بھی، لیکن علم و فہم کو خوش آہنگ رکھنے والا عالم رشد و ہدایات کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عظمت یہی ہے کہ وہ ایک عالم ہونے کے باوجود ایک انسان بھی تھے، ایک شریف النفس انسان اور اشاعتِ علم کی طلب کیلئے علم کو ضروری خیال فرماتے تھے۔

آج اس وقت جب میں غم زدہ دل و دماغ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں، تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے وہ مجھ پر مسکرا رہے ہیں اور اپنی مخصوص شانِ استغنا کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ غم کیسا، کس بات کا غم۔ حیرت ہے کہ تم نے مجھے نہ پہچانا، میں تو زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا! میں اس وقت تک زندہ رہوں گا جب تک میرا ایک طالبعلم بھی میرا ہم راز ہے اور میرے مشن کو اپنی ذات کا جزو سمجھتا ہے۔ میرا تعلق زماں و مکاں سے نہیں۔ میں تاریخ پڑھاتا تھا، اور تاریخ لکھتا ہی نہیں تھا تاریخ بناتا بھی تھا میری ذات اس تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین امر ہیں۔ زندہ جاوید ہیں۔ ہم خود فراموش ہیں۔ ہم تو ان کو فراموش کر سکتے ہیں لیکن تاریخ ان کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

شریف آدمی

برادرم فرمان صاحب

ڈاکٹر محمود حسین کی شخصیت کے بارے میں اگر ایک بات کہی جائے تو یہ ہوگی کہ وہ ایک نہایت شریف آدمی تھے۔ شریف آدمی کی تعریف یہ ہے کہ زندگی گزارنے اور زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے چند اصول ہوں۔ وہ وقتی فائدوں کے لئے زندگی سے سمجھوتہ نہ کرتا ہو۔ وہ پڑھا لکھا ہو، خوش ذوق ہو، خیر و شر میں تمیز کرتا ہو۔ زندگی کی اچھی اور لطیف چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ رکھتا ہو، باہمت ہو، کینہ پرور، حاسد اور منافق نہ ہو۔ مخالفین کو شکست دینے کے لئے اوچھے ہتھیار استعمال نہ کرتا ہو۔ وسیع القلب ہو، سنجیدہ مسکراہٹ اس کی شخصیت میں دلآویزی پیدا کرتی ہو۔ اس کے لہجے میں نرمی اور مٹھاس باتوں میں کشش اور خلوص ہو۔ انسانی ہمدردی اس کا طرۂ امتیاز ہو۔ چھوٹا اس سے ملے تو اُسے چھوٹا ہونے کا احساس نہ ہو بڑا ملے تو اسے اپنے قد کا پتا چلے۔ بیک وقت وہ طوفان ہو اور شبنم بھی ہو۔ یہ سب باتیں مجھے ڈاکٹر محمود حسین کی ذات میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب شرافت و انسانیت کا ایک ایسا سانچا تھے جو ان کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا ہے

میں ان سے دو چار بار ہی ملا ہوں پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں ہوئی۔ وہ پی ای این کے نائب صدر تھے اور میں خازن تھا۔ جرمنی میں پی ای این کی سالانہ کانگرس ہونے والی تھی، مجلسِ انتظامیہ میں انھوں نے تجویز پیش کی کہ اس کانگرس میں شرکت کے لئے جمیل جالبی کو بھیجا جائے۔ اس عرصے میں جو ملاقاتیں ہوئیں، ان کی شرافت نے ہمیشہ مجھے پہلے سے زیادہ اپنا گرویدہ بنا لیا پھر ایک دن ٹیلی فون آیا اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مجھے یاد فرمایا تھا۔ میں گیا تو فرمایا کہ ایک کتاب کا ترجمہ کرنا ہے۔ آپ کر دیجئے۔ میں نے کہا "میں کر دوں گا" دس پندرہ دن بعد پھر ٹیلیفون آیا۔ فرمانے لگے ابھی ٹھہر جائیے۔ یونیورسٹی مالی مشکلات کا شکار

ہے۔ میں جلد ہی آپ کو خط لکھوں گا۔ پھر وہ یونیورسٹی کو طرح طرح کے بحران سے نکالنے میں لگ گئے اور اسی اثناء میں موت نے نقارہ باج دیا اور وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ــــــ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے میری آخری ملاقات "شام ہمدرد" میں ہوئی مجھے شام ہمدرد میں تقریر کرنی تھی اور مرحوم بڑی محبت سے اس جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ جلسے کے بعد اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ میرے مضمون کی تعریف کی اور میز سے اٹھا کر مجھے چائے کی پیالی دی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اور لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور میں خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

کراچی یونیورسٹی نے ان کی کتاب شائع کی اور مجھ سے کہا کہ اس موقع پر میں بھی ایک مضمون پڑھوں۔ میں نے مضمون لکھ لیا لیکن اسی عرصے میں مجھے "پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج" کے سیمینار میں شرکت کے لئے لاہور جانا پڑا۔ میں نے وہ مضمون منتظمین جلسہ کو بھیج دیا کہ وہ اُسے کسی سے پڑھوا دیں۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مضمون اس لئے نہ پڑھا جا سکا کہ منتظمین جلسہ کی لاپروائی سے وہ کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا چلئے دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد۔ ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا تو افسوس کرنے لگے۔ میں مرحوم کی شرافت۔ ان کے علم اور مثبت اندازِ نظر کا ہمیشہ قائل رہا ہوں۔ ڈاکٹر محمود حسین اُن لوگوں میں سے تھے جو تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں تو فیض پہنچاتے ہیں اور مرتے ہیں تو داستان بن جاتے ہیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

پاکستان میں آج بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر اردو کی حیثیت اور زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اردو کا پاکستان پر خاص حق ہے۔ اس لئے کہ اردو متحد اور آزاد پاکستان کی قومی زبان ہے۔ یہی قائدِ اعظم کا فرمان تھا، اور یہی مسلم جمہور کی خواہش ہے اردو کا یہ انتخاب وقتی جذبات لگاؤ یا سیاسی مصلحتوں کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ ٹھوس حقائق اور واقعات پر مبنی ہے۔ اردو پاکستان کے عرض و بلد میں سمجھی جاتی ہے اردو مسلمانوں کی اسلامی تہذیب و تمدن کی درخشندہ نشانی ہے۔ محمود حسین

جمیل الدین عالی

نفیس و بلیغ مسکراہٹ کا مالک

محبی فرمان صاحب

۱۰ اپریل کو ڈاکٹر محمود حسین کا انتقال ہوا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ تمام دنیا ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کے مناقب گنواتے نہیں تھکتی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ ان کی موت کے منتظر بیٹھے ہوں۔ ویسے یہ سسٹم ایک آسان سسٹم ہے۔ کسی عالم، فاضل، پیکرِ شرافت کو جیتے جی خراجِ عقیدت پیش کرنے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ اگر سبھی طلباء اپنے شیخ الجامعہ کی عزت کرنے لگیں تو پارٹی پالی ٹیکس کا کیا بنے گا۔ یہی ڈاکٹر محمود حسین تھے جنھیں چند مہینے پیشتر اسی جامعہ کراچی کے طلباء کے کسی گروہ نے اپنی گستاخیوں سے عاجز کر دیا تھا۔ یہی ڈاکٹر محمود حسین تھے جو جامعہ ملیہ کی گرانٹ کے سلسلے میں ٹریژری آفیسرز تک کے دفتروں کے باہر کرسی ملے بغیر گھنٹوں ملاقات کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں یہ عاجز اردو کالج کا مہتمم تھا اور وہ جامعہ ملیہ کے سربراہ ایک بار ڈپٹی کمشنر کراچی کے دفتر میں پہنچے تو اندر سے بکمال عنایت جواب آیا کہ فلاں اسسٹنٹ کمشنر صاحب سے مل لیا جائے۔ فلاں اسسٹنٹ کمشنر صاحب ایک تیس بتیس سالہ صاحبزادے تھے۔ مگر تھے سی۔ ایس۔ پی۔ انھوں نے میری آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو کامل ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرایا۔ کسی مقدمے کی سماعت نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ایک سینیئر کے ساتھ گپ کر رہے تھے۔ یہ ایسے پتہ چلا کہ وہ سینیئر صاحب باہر نکلے تو مجھے پہچان کر لپٹ گئے۔ ہائیں عالی صاحب آپ یہاں کہاں میں نے کہا بھائی کالج کے کام سے آیا ہوں۔ ان لاٹ صاحب سے ملنا ہے۔ بولے ارے آپ نے اطلاع دلوائی۔ میں نے کہا جی ہاں پیشکار صاحب اور چپراسی صاحب دونوں کو کارڈ دے دیئے ہیں۔ زبانی بھی یاد دہانی کرا رہا ہوں۔ بولے اوہو۔ سوری۔ دراصل میں ادھر سے گزرا تو اس نے بٹھا لیا۔ چائے پلا رہا تھا۔ کچھ گپ شپ ہو رہی تھی۔ آج کل کے دِگرگوں حالات میں ہماری سروس پر بھی پریشرز ہیں کچھ ان کی بات چل نکلی تھی، بھئی سوری۔ آیئے میں آپ کو اندر لے چلتا ہوں۔ میں نے

کہا آپ کی بڑی مہربانی ۔ خدا ملک کا جو چاہے کرے ۔ بس آپ کی سروس پر پریشر نہ پڑیں ۔ میں تو پھر حقیر فقیر آدمی ہوں ۔ یہ ڈاکٹر صاحب سامنے کھڑے ہیں بزرگ ہیں ، عالم فاضل ہیں ۔ قومی کارکن ہیں ۔ تحریک آزادی کے سرکاروں میں سے ہیں ۔ لاٹ صاحب سے فرمائیے چلیے ڈاکٹر صاحب کو باریابی کی اجازت دیں ۔

ڈاکٹر صاحب شانِ محبوبی سے مسکرائے ۔ انکی مسکراہٹ بڑی نفیس اور بلیغ ہوا کرتی تھی فرمایا حضرت واللہ میں تو اس انتظار میں بھی وہی لذت لے رہا ہوں جو کسی بڑے سے بڑے مفکر کو پڑھنے میں ملتی ہے ۔ بھائی یا تو اعزازی کام اپنے ذمے نہ لیجیئے ۔ لے لیئے تو پھر جیسے سب اہلِ غرض ایسے ہی آپ ۔ ہمارا معاشرتی اور سرکاری مزاج بدلتے بدلتے بدلے گا ۔ اس طرح بدمزہ اور بددل ہونے سے کام نہیں چلے گا آپ تو ماشاء اللہ بدمزہ اور بددل ہوتے کے ساتھ ساتھ بدزبان بھی ہوتے جاتے ہیں ۔ نہیں حضرت یہ درست نہیں ۔ ان راہوں میں تو مکمل طور پر نفی ذات کرنی پڑتی ہے ۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب پر اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ میں کیا کہوں : کیا اتنا کہنے کی اجازت ہے کہ حضرات وہ تو گئے جو اہلِ علم و فضل باقی ہیں کچھ انہی کی توقیر کر کے دکھا دو ۔ علم و فضل کی عزت ظاہر کرنے میں نہ تو اختیارات کم ہو جاتے ہیں نہ کوئی سیاسی نقصان ہو جاتا ہے نہ دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے ۔ تھوڑی سی بدنامی ضرور اٹھانی پڑتی ہے ۔ جیسے کہ جناب ممتاز حسن مرحوم کو اٹھانی پڑتی تھی ۔ وہ اہلِ علم اور اہلِ فضل اور اہلِ کمال کی عزت کرتے تھے اور ان کے چیرقناتی ہمعصر انھیں غیر افسر قرار دیتے تھے ۔ میں نے ان کے ادنیٰ ماتحتوں میں بھی کچھ لوگ دیکھے جو محض قیمتی سوٹ اور مفت میں ملی ہوئی لمبی کاروں پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے تھے ۔ ان کا نام ہی پرسنلیٹی اینڈ پون ٹیاک (PERSONALITY AND PONTIAC) رکھ دیا گیا تھا ۔ (پون ٹیاک ایک لمبی کار ہوتی تھی) ایسے حضرات تو جناب ممتاز حسن کو ان کی کتب بینی اور علم دوستی کی وجہ سے کبھی افسر ، غیر جینٹلمین ، غیر شریف تک کہا کرتے تھے اور لطیفہ دیکھیے کہ ایسے لوگوں کے مدارج ہمیشہ بڑھتے ہی رہے انھیں یحییٰ خاں کی حکومت میں تو بہت ہی خصوصی اور آؤٹ آف دی ٹرن ترقیاں ملیں ۔ اس حکومت کے دور میں بھی ان کی پرسنلیٹی اینڈ پون ٹیاک ہی انھیں مستعد اور صاحب اہلیت ثابت کر رہی ہے ماشاءاللہ مزید ترقیاں پا رہے ہیں ۔ بہر حال ایسے سگانِ دنیا بہت آئے اور بہت گئے انھیں جانتا کون ہے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

سات بھائیوں کا خاندان

۱۷۱۳ء میں محمد خاں بنگش نے اپنے سب سے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں فرخ سیر کو یہ بات ناگوار نہ گزرے ۱۷۱۴ء میں ان کے نام پر فرخ آباد بسایا اور اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ قائم خان جن کے نام پر قائم گنج آباد ہوا۔ روہیلوں کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ ۱۷۴۳ء میں محمد خاں بنگش ان کا جانشین ہوا۔ انھیں کے عہد میں سودا اور میر سوز نے کچھ روز فرخ اباد میں قیام کیا تھا۔ بعد میں مظفر جنگ اور تجمل حسین خاں کو۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے پنشن ملتی رہی۔ نواب تجمل حسین خاں کی مدح میں غالب نے کہا تھا۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

ہمارے مورث اعلیٰ حسین خاں تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۱۹ء کے لگ بھگ قائم گنج آکر آباد ہوئے ہمارے دادا غلام حسین خان بڑے آزاد منش آدمی تھے۔ وہ جس طبیعت کے شخص تھے اس کا کسی مطلق العنان حکمراں کے دربار میں ترقی کرنا ممکن نہ تھا۔ اگرچہ افسر الملک سے ان کی ذاتی کافی دوستی تھی لیکن مزاج کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ افسر الملک نے انھیں حیدر آباد میں رکھنا چاہا لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے حیدر آباد کی درباری زندگی کے مقابلے میں انہوں نے قائم گنج کی آزاد اور غیر مصنوعی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ انتہا درجے کے حق پسند صاف گو اور نڈر تھے۔ کوئی شخص چاہے دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی اونچا مرتبہ کیوں نہ رکھتا ہو ان کے نزدیک بس ایک معمولی آدمی تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا انسان افسروں کی ماتحتی بھی بس ایک حد تک کر سکتا ہے۔ اس حد کے آگے خود افسر کو ان سے توقع رکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔ فوج میں رہے تو بھی بڑی آن بان سے رہے۔ قائم گنج آئے تو کسی دولت مند کے سامنے اپنے کو ہیٹا نہیں سمجھا اگرچہ خود دولت مند نہیں تھے لیکن دولتمندوں

سے اپنا احترام کرانا جانتے تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے دلیر اور جری لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بڑے ذکی الحس اور غصہ ور تھے۔ آسانی سے کسی کی بڑائی نہیں مانتے تھے مگر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بڑی بردباری اور انکسار سے پیش آتے تھے۔ ان کے دروازے سے کوئی مانگنے والا خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ ان کا معمول تھا روز صبح بازار جاتے جانے سے پہلے محلے کی بیواؤں کے یہاں دریافت کرا لیتے کہ بازار سے کچھ سودا سلف تو نہیں منگانا ہے اگر کسی دن خود نہ جا سکتے تو بھی اس معمول پر عمل ہوتا اور سودا منگوا کر بھجوا دیتے۔

ہمارے والد فدا حسین خاں قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں حیدرآباد گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ شروع ہی سے انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ طبیعت میں نزاکت اور نفاست تھی گھر سے ہزار بارہ سو روپے لے کر نکلے تھے کہ اس سے حیدرآباد میں کچھ کاروبار کریں گے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں قائم گنج کے بعض لوگ پہلے سے موجود تھے۔ رائے پور کے محمد زماں خاں، ناظم فوجداری تھے۔ ہمارے والد نے بیگم بازار میں مرادآبادی برتنوں کا روبار شروع کیا۔ وہیں قریب میں شمالی ہند کے ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ ان کے یہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا عام طور پر والد شام کا وقت انہی کے دیوان خانے میں صرف کرتے تھے۔ دیوان خانے ہی میں وکیل صاحب کا کتب خانہ بھی تھا۔ والد نے وکیل صاحب سے مطالعہ کے لئے چند کتابیں مستعار لیں یہ کتابیں قانون کی تھیں جو انہوں نے چند دنوں میں پڑھ ڈالیں ______ اور کتابیں لائے وہ بھی پڑھ ڈالیں۔ اب والد کا دل ان کتابوں کے مطالعے میں لگنے لگا۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ قانون سے اس قدر لگاؤ ہے تو وکالت کے امتحان میں کیوں نہیں شریک ہو جاتے۔ امتحان میں شریک ہوئے اور اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے۔ اب انہوں نے تجارت چھوڑی وکالت کا پیشہ اختیار کیا جس میں خدا نے بڑی برکت دی۔ والد نے قانونی مسائل پر بیس سے اوپر کتابیں تصنیف کیں جو سب مطبع "آئین دکن" میں طبع ہوئیں۔

والد مرحوم کی وکالت حیدرآباد میں ایسی کامیابی سے چلی کہ عرصے تک وہاں کے لوگ اس کا چرچا کرتے تھے۔ انھیں ہائی کورٹ کی ججی قبول کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے

اپنی معذوری ظاہر کی۔ وہ جانتے تھے کہ وکالت کے علاوہ وہ جو عملی کام کرتے ہیں وہ جج ہونے کے بعد ترک کرنا پڑے گا۔ ان کی غیر معمولی کامیابی ان کی دیانت کا پھل تھی۔ وہ صرف ان مقدمات کی پیروی کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے جنہیں وہ پوری طرح حق بجانب خیال کرتے تھے۔ ممکن ہے اس دیانت اور راست بازی کے سبب سے انھیں عارضی طور پر کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا ہو لیکن بالآخر انھیں اس سے فائدہ ہوا جیساکہ زندگی میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ دیانت اور راست بازی اخلاقی خوبیاں ہیں اور عملی طور پر بھی دیکھا جائے تو ان سے انسان .... فائدہ ہی میں رہتا ہے اور اگر فائدہ نہ ہو تو بھی اخلاقی اقدار کے حصول کی کوشش ہر انسان کا فرض ہے انھیں سے ہماری زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے دادا اور نانا کے کیرکٹر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ دادا اگر جلال کا نمونہ تھے تو نانا جمال کا۔ دادا کا لوگ احترام کرتے تھے والد اور والدہ دونوں کی طبیعت میں انکسار اور بردباری تھی جس کا اثر کم و بیش ہم سب بھائیوں میں نظر آتا ہے لیکن بعض اوقات دادا اور نانا کے کیرکٹر کی جھلک بھی خلقی طبائع کے چوکھٹے میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہماری نانی جس طرح ہماری والدہ کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ وہ ہمارے نانا سے مشابہت رکھتی ہیں صورت اور سیرت دونوں میں۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں میں ذاکر میاں کے متعلق یہی بات دہراتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ اور سب بھائی تو دادا پر گئے ہیں لیکن ذاکر نانا پر گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب بھائیوں میں ددھیال اور ننھیال کی خصوصیات کا امتزاج ملتا ہے۔ کسی میں ددھیال کا پلہ ذرا بھاری ہے اور کسی میں ننھیال کا۔

والد نے ۱۹۰۷ء میں اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پائی وہ بیس سال کی عمر میں قائم گنج سے حیدرآباد گئے تھے۔ بائیس سال کی عمر میں وکالت شروع کی۔ انھوں نے اپنے پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور مشقت کی اور اپنی صحت کی مطلق پروا نہ کی وہ حیدرآباد میں دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ بیمار ہو کر حیدرآباد سے قائم گنج آ گئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ ہمارے مکان کے سامنے دادا کی قبر کے بازو میں دفن ہیں۔ والد کے انتقال پر ہمارے چچا عطا حسین خاں ہمارے ولی مقرر

ہوئے موت نے انھیں بھی مہلت نہ دی ۱۹۱۰ء میں انھوں نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے ہمارے چاروں بڑے بھائیوں کو اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ میں ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ گیا۔ چچا کی وفات پر ہمارے خالو حسن الدین خاں ہمارے ولی مقرر ہوئے اور جائداد کا سارا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ جو انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

ہماری والدہ کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش ان کے کوئی لڑکی ہوتی لیکن قضا و قدر نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ ان کے ہاں سب بیٹے ہی بیٹے ہوئے۔ دو چار نہیں پورے سات۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں تھے جن کی پیدائش ۱۸۹۳ء میں قائم گنج میں ہوی۔ والدہ کی شادی کے دو برس بعد۔ والد کا کام جب اورنگ آباد میں جم گیا تو وہ شادی کے لئے اورنگ آباد سے قائم گنج آئے۔ والدہ اگلے سال اپنے فرزند کو لے کر حیدرآباد گئیں۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی اور سب سے چھوٹے بھائی محمود میاں کے علاوہ جو قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ باقی سب نے حیدرآباد میں جنم لیا اس لئے وہ ملکی کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن حیدرآباد والے اس بات کو ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کے ملکی ہونے کے معیار کچھ اور تھے جن پر شاید ہم لوگ پورے نہیں اترتے تھے

والد کے انتقال کے بعد مظفر حسین خاں کی تعلیم اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول کے بعد علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں ہوئی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے۔ کچھ دنوں اکبر یار جنگ کی حیثیت سے وکالت کی۔ پھر محکمہ عدالت میں مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ تین سال کے قریب کارگزار رہے ہوں گے کہ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے یہ مرض ہمارے خاندان میں ایسا گھسا کہ اس نے تباہی بول دی۔ والد کا انتقال اسی میں ہوا۔ سب سے بڑے بھائی جنھیں ہم بھائی جان کہا کرتے تھے اسی مرض کا شکار ہوئے۔ بہت کچھ علاج معالجہ ہوا لیکن موت کے آگے کسی کی آج تک چلی ہے جو چلتی۔ ان کے دو بیٹے امتیاز و مسعود[1] ہوئے

---

[1] اردو کے مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر مسعود حسین خاں جو ان دنوں جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر ہیں (ف۔ف)

ہمارے منجھلے بھائی عابد حسین خاں تھے جنہیں ہم سب منجھلے میاں کہا کرتے تھے۔ میں نے متعدد جاننے والوں سے سُنا ہے کہ وہ ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے۔ ان کی تعلیم بھی اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول اور ایم۔ اے۔ او کالج میں ہوئی۔ ابھی پڑھتے ہی تھے کہ انھیں بھی دق نے آدبوچا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

ہمارے تیسرے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جنہیں ان کے چھوٹے بھائی، ذاکر میاں کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے فخرِ خاندان ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔

ہمارے چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے۔ ان کے متعلق میں نے بعض جاننے والے بزرگوں سے سُنا ہے کہ وہ صورت اور سیرت میں دادا سے مشابہت رکھتے تھے۔ انھیں قدرت نے ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین صحت مند اور قوی جسم عطا کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی ہاتھ کی کلائی بلا مبالغہ میری کلائی سے ڈیڑھ گنی چوڑی تھی۔

ان کا مقابلہ ذاکر میاں سے رہتا تھا جو اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن جسمانی قوت میں کم تھے ہر خاندان میں بیٹوں کے بھائیوں میں ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو۔ معمولی معمولی باتوں پر ان بن ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ اور بھی ہوتا ہے جب بھائیوں کی عمر میں زیادہ فرق نہ ہو۔ جسمانی لحاظ سے زاہد میاں ذاکر میاں کو مار لیتے تھے اسلئے کہ ان میں قوت اور توانائی زیادہ تھی۔ اکثر اوقات مجھے اچھی طرح یاد ہے ذاکر میاں ان سے کتراتے اور منہ نہیں لگتے تھے کبھی حکمت عملی سے انھیں قابو میں رکھتے تھے بعض دفعہ جب دونوں میں کھٹ پٹ ہو جاتی تو کئی کئی دن تک بات چیت بند رہتی لیکن پھر خود ہی میل ہو جاتا تھا۔ ان دونوں کے جھگڑوں کو بھائی جان چکایا کرتے تھے۔ جن کی ہم سب بھائی عزت کرتے تھے۔

بھائیوں میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ میں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوا۔ میری بسم اللہ کے کچھ عرصے بعد ہم سب والد کی علالت کی وجہ سے قائم گنج آ گئے۔ ۱۹۱۱ء میں قائم گنج میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ ایسی وبا پہلے کبھی نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ بستی کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو اور بعض گھروں کا تو سرے سے صفایا ہی ہو گیا۔ ہمارا گھر

بھی ان گھروں میں تھا۔ ہمارے گھر میں جو لوگ تھے سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا بھائی جعفر جس کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی اس ظالم وبا کا نشانہ بنا۔ پھر ہماری نانی حسینی پھر خود ہماری والدہ اور آخر میں اسلامی اور عبداللہ جنہیں ہماری والدہ نے دکن میں خریدا تھا جب کہ وہ بالکل بچے تھے۔ غرضکہ پورا گھر کا گھر صاف ہو گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی محمود کو جن کی عمر چار سال تھی چچی اپنے ساتھ لے گئیں اور انہیں نے ان کی پرورش کی۔ اب گھر میں ہو کا عالم تھا نہ آدم نہ آدم زاد۔ میں چند مہینے قبل اٹاوہ جا چکا تھا۔ وہاں والدہ کے انتقال کی خبر سُنی تو دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہماری والدہ کے انتقال کی اطلاع اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب کو ملی تو انہوں نے اُوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں مجھے بلوایا۔ پہلے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر یہ دل فگار خبر سنائی۔

مجھ سے چھوٹے بھائی جعفر کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہماری والدہ کو اپنے سات بیٹوں میں ایک جعفر کا داغ اپنی زندگی میں دیکھنا پڑا۔ چند سال میں اگر وہ تین جوان بیٹوں کو یکے بعد دیگرے نذرِ اجل ہوتے دیکھتیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی کیا حالت ہوتی۔

ہمارے سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں ہیں۔ یہ والد کے انتقال کے چھ ماہ بعد قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ قائم گنج میں ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور سب سے چھوٹے محمود میاں پیدا ہوئے۔ باقی ہم پانچ کی پیدائش حیدر آباد کی ہے۔ بیگم بازار والے مکان کی۔ والدہ کے انتقال کے بعد محمود میاں کی پرورش چچی نے کی۔ ۱۹۱۹ء میں جب میں بیمار ہو کر قائم گنج آ گیا تو انہیں قائم گنج کے جارج اسکول میں داخل کرا دیا پھر بعد میں وہ میرے ساتھ ۱۹۲۱ء میں جامعہ ملیہ میں آ گئے۔ جب وہ جامعہ ملیہ کے اسکول میں تھے تو انہوں نے ایک دستی اخبار "جوہر" نکالا تھا جو کئی سال تک نکلتا رہا اور طالب علموں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں جامعہ کی خبروں کے علاوہ طلبا کے مضمون بھی شائع ہوتے تھے۔ جامعہ کالج سے ۱۹۲۸ء میں وہ جرمنی چلے گئے۔ ہائیڈل برگ میں تین سال رہ کر وہاں سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ واپسی پر ۱۹۳۳ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا پھر وہیں وہ تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے اپنا تعلق برقرار رکھتے ہوئے وہ تھوڑے عرصہ کے لئے وزیر بھی رہے۔ انھوں

نے اس عرصہ میں ایک بڑا کام کیا یعنی کراچی سے دس میل کے فاصلے پر انھوں نے جامعہ قائم کی جس میں اعلیٰ تعلیم کا پورا انتظام ہے۔ یہاں نصاب تعلیم وہی رکھا ہے جو کہ کراچی یونیورسٹی میں ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں انہوں نے اپنی جامعہ کے لئے اس قدر شاندار اور وسیع عمارتیں کیسے بنوالیں۔ جنہیں دیکھے بغیر اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اتنا بڑا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہ ان کی نیک نیتی ارادے کی مضبوطی اور حوصلہ مندی کا نتیجہ ہے۔

محمود میاں کئی سال تک ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انہیں اساتذہ اور طلبا میں یکساں مقبولیت حاصل تھی بعض پالیسی کے معاملات میں حکومت سے اختلاف کی بنا پر وہ مستعفی ہو گئے اور کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے واپس آگئے۔ محمود میاں مرنجاں مرنج شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کا علمی ذوق بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ انہوں نے ٹیپو سلطان کے فوجی نظام پر ایک کتاب شائع کی ہے وہابی تحریک پر بھی وہ عرصے سے کام کر رہے ہیں اور علمی رسالوں میں انھوں نے اپنی تحقیقات شائع کی ہیں۔ بعد میں ان مقالوں کو ملا کر مستقل تصنیف کی شکل دینے کا قصد ہے۔ محمود میاں کو سیاسی زندگی میں ترقی کے مواقع حاصل تھے لیکن انھوں نے تعلیمی میدان کو ترجیح دی جس سے ان کی سلامتی اور علم دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ (اردو کی دنیا)

وہ خوشبو کے سفر میں

اُترا تھا لہو جس کا رگِ شاخِ ثمر میں
پایا تھا نمو پھول نے جس دستِ ہنر میں
رُوٹھا ہے گلستاں سے بہاروں کی طلب میں
بچھڑا ہے ہواؤں سے "وہ خوشبو کے سفر میں"

۱۳۹۵ھ

پروین شاکر

علامہ نیاز فتحپوری مرحوم

ملیر کا جامعۂ تعلیم ملّی اور ڈاکٹر محمود حسین

ستمبر ۶۳ء کی بات ہے ایک اتوار کو میں محمد احمد صدیقی کی گاڑی پر نیاز صاحب کو جامعہ ملّیہ دکھانے کے لئے ملیر لے گیا۔ نیاز صاحب کئی گھنٹے وہاں رہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی رہنمائی میں مرکزی کتب خانے اور مختلف تعلیمی اداروں کی سیر کی۔ اسی دن جامعہ کی نوتعمیر عالیشان مسجد میں مولانا منتخب الحق صاحب کی صدارت میں سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ نیاز صاحب نے اس میں بھی شرکت کی۔ واپسی پر اپنے تأثرات قلمبند کئے اور اکتوبر ۶۳ء کے نگار میں شائع کئے۔ یہ تأثرات، نیاز صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے، چونکہ ایک اہم اور تاریخی ادب پارے کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے تذکرہ کے طور پر قارئین کی نذر کئے جاتے ہیں۔ (فرمان فتحپوری)

ہر چند کراچی کے آنے کے بعد میں عزلت نشین سا ہوگیا ہوں اور یہاں کی علمی و ادبی تحریکات سے بھی بے تعلق ہوں لیکن ذہنی حیثیت سے یہاں کی زندگی، یہاں کے رجحانات، یہاں کی ہلچل محسوس کرنے پر ضرور مجبور رہوں، دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کیا کہوں بلکہ صرف اس لئے کہ کیوں کہوں۔

یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے اپنے بچوں کی تعلیم کا سوال میرے سامنے آیا جو بالکل ناگزیر سی بات تھی اور بہت کوشش کی کہ یہاں کے نظام تعلیم کو سمجھ سکوں لیکن اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اگر اساتذہ و طلبہ کے حقیقی تعاون و توافق کے بغیر نظام تعلیم کو ناممکن سمجھا جائے تو یہاں کے ارباب تعلیم نے اس کو ممکن کرکے دکھایا ہے۔ اس سلسلہ میں طلبہ کے مطالبات ان کے ہنگاموں اور ان کے احتجاج سے میں اتنا متأثر نہیں ہوتا جتنا کہ محکمہ تعلیم کی خوئے اعتراف سے۔ جسے آپ رواداری بھی کہہ

سکتے ہیں اور مجبوری بھی۔

خیر یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہوتی ہی رہیں گی۔ دُنیا کی رونق انھیں ہنگاموں پر قائم ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ سوال میرے سامنے آتا ہے کہ اگر پاکستان کی موجودہ نسل کا نشو و نما اسی اضطرار و اضطراب اور اسی سمجھ میں نہ آنے والی فضا میں ہُوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غیر معمولی انسان بننے کی کوشش میں معمولی انسان کے درجے سے بھی نیچے گر جائے (ممکن ہے آئندہ SUPERMAN کا مفہوم بدل کر کچھ ایسا ہی ہو جائے) ہو سکتا ہے کہ میرا یہ خیال درست نہ ہو لیکن تعلیم کا جو تصوّر میرے ذہن میں ہے اس کے پیشِ نظر جب میں اس عہد کے طلبہ، اس عہد کے اُصولِ تعلیم پر غور کرتا ہوں تو مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے لیکن اس کے سوا کہ

دل را در آتش افگنم و بوئے او کنم

اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔

اب سے ساٹھ ستّر سال پہلے میرے عہدِ طفلی میں جو اسلوبِ تعلیم رائج تھا اس کا تو خیر اب تصوّر کرنا بھی نادانی ہے اور اس میں شک نہیں کہ پچھلی نصف صدی میں انسان نے غیر معمولی ذہنی ترقی حاصل کر لی ہے لیکن یہ سوال کہ تعلیم کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ شاید اب زیادہ غور طلب ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تعلیم و تربیت دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں اور دونوں کو باہمد گر لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ میرے کانوں نے ہمیشہ یہی سُنا کہ تعلیم کا مقصود ہی تربیت ہے۔

لیکن اب صورت کچھ اور ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ تعلیم و تربیت کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہے بلکہ خود تعلیم کا مفہوم بھی بہت کچھ بدل گیا ہے اور تربیت کا تو خیر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ کہنا غلط تصوّر کیا جائے اور میری تردید میں اس تربیت کو پیش کیا جائے جس نے اس وقت انسان کو حدُودِ افلاک تک پہونچا دیا ہے۔ لیکن معاف کیجیے میں اس کو میکانکی و مادّی تربیت کی ترقی تو ضرور کہہ سکتا ہوں لیکن اخلاقی تربیت نہیں، حالانکہ انسان کا حقیقی شرف میرے نزدیک فرشتہ ہو جانا نہیں بلکہ انسان ہی رہنا ہے۔ اور انسان بنانا ہی تعلیم کا حقیقی مقصود ہونا چاہیے۔ لیکن خیر یہ ایک جُداگانہ بحث ہے جس کی تفصیل میں جانے کا فی الحال موقع نہیں، تاہم مختصراً اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ یہاں آنے کے بعد سب سے

پہلے مجھے یہاں کے نظامِ تعلیم ہی پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور افسوس ہے کہ میں کسی اطمینان بخش نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

مجھے پاکستان کے دوسرے شہروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن کراچی کی ۲۲ لاکھ کی آبادی کو دیکھتے ہوئے تعلیمی مدارس کی کمی یہاں بین طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ اور اسی لئے نئی نئی درسگاہیں قائم کرنا یہاں لوگوں کا پیشہ ہو گیا ہے جس کا مقصود تعلیم دینا نہیں بلکہ تعلیم کا سودا کرنا ہے۔ یہاں کی سرکاری درس گاہوں کا کیا حال ہے مجھے اس کی پوری واقفیت حاصل نہیں، لیکن ان درسگاہوں کے طلبہ کی بے راہ روی کو دیکھ کر بے اختیار میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ان کے اساتذہ سے گفتگو کروں (حالانکہ یہ بھی ایک بے نتیجہ سی بات ہو گی)

الغرض اسی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ ایک بار میرے سامنے کسی نے "جامعہ ملیہ ملیر" کا ذکر کیا۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس دانشگاہ کا اسلوبِ کار دُوسری دانشگاہوں سے مختلف ہے اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ اس کو دیکھ کر میرے دل کا زنگ بہت کچھ دُور ہو گیا۔

کسی پبلک ادارہ کا ذکر کرتے ہوئے کوئی ذاتی تذکرہ چھیڑ دینا مناسب نہیں، لیکن بعض صورتوں میں جبکہ پس منظر، منظر سے زیادہ اہم ہو یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اس ادارہ کے بانی و مؤسس "ڈاکٹر محمود حسین" پاکستان کے ان چند مخصوص افراد میں سے ہیں جن کے ذکر میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا شمار اُن نفوس میں ہے جن کے ذکر میں اگر قطعاً کسی قسم کے مبالغہ سے کام نہ لیا جائے تو بھی قحطِ انسانیت کے اس دور میں اسے مبالغہ یا قصیدہ نگاری ہی سمجھا جائے گا۔ اس لئے میں ان کی ذات سے قطع نظر صرف ان شواہد وعلائم کا ذکر کروں گا جو ڈاکٹر صاحب کی خصوصیاتِ کامنہ کی وہ صورِ ظاہرہ اور وہ تعینّاتِ مادّی ہیں جن کو آنکھ بند کر کے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اب سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ پاکستان اپنے عہدِ شیر خوارگی سے گزر رہا تھا اور اس کی سرپرستی کے حق دار بھی متعدد پیدا ہو گئے تھے لیکن صرف اس حد تک کہ اُن کا حقِ توریث ختم نہ ہو۔ اس طفلِ نوزائیدہ کے نشو و نما اور اس کی صحیح تربیت کی کسی کو فکر نہ تھی۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں مجھے

بھی یہاں آنے کا موقع ملا اور پاکستان کے مستقبل کے باب میں غلام محمد مرحوم سے (جو میرے قدیم کرم فرما اور اس وقت یہاں کے حاکم کل تھے) دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل صحیح نقشہ تھا اس وقت کے پاکستان کا۔ انھوں نے کہا:۔

"پاکستان کی حالت اس وقت ایک ایسی لاش کی سی ہے جسے چاروں طرف سے گدھ نوچ رہے ہیں اور کوئی ان "گدھوں" کو بھگانے والا نہیں"

میں نے کہا کہ

"خود آپ کیوں اس فرض کو ادا نہیں کرتے"

تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک بڑی معقول بات کہی، فرمایا کہ:۔

"یہ فرض صرف قوم کا لیڈر ہی انجام دے سکتا ہے اور مجھے قومی لیڈر ہونے کا شرف حاصل نہیں"

اس واقعہ کا ذکر میں نے صرف اس لئے کیا کہ ۵۲ء کے پاکستان کا موقف آپ کے سامنے آجائے۔ ظاہر ہے کہ اس آپا دھاپی میں بچوں کی اصلاحِ اخلاق یا تعلیم و تربیت کا خیال کس کو پیدا ہو سکتا تھا لیکن چونکہ موجیں پستی کی انتہا پر پہنچنے کے بعد ہی بلندی کی طرف مائل ہوتی ہیں اس لئے یہاں بھی اسی عالمِ حضیض میں بعض افراد صحیح بلند فطرت و فراست رکھنے والے نمودار ہوئے جن میں سے ایک ڈاکٹر محمود حسین بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت محکمۂ تعلیم کے بہت اُونچے درجہ پر ممتاز تھے اور جس حد تک دنیاوی فراغ و آسائش کا تعلق ہے وہ اس سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ وہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ وائس چانسلر کی اہم خدمات بھی انھوں نے انجام دیں اور اب بھی وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے صدر ہیں لیکن ان میں سے کوئی اعزاز ان کی ذہنی ناآسودگی و قلبی اضطراب کو دور نہ کر سکا اور تعلیم و تربیت کے اس صحیح تصور کو بروئے کار لانے کے لئے جس کی کوئی ہیئت اس وقت موجود نہ تھی۔ انھوں نے اس درسگاہ کی بنا ڈالی جو اس وقت جامعہ تعلیمِ ملی کے نام سے موسوم ہے لیکن شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ جامعہ دفعتًا وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ اس کے نشو و نما میں انھوں نے اسی تدریجی اصول کو سامنے رکھا جو ہر کام کی استواری کے

لئے ضروری ہے۔

یوں تو مجلس تعلیم ملی کا قیام یہاں تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہوگیا تھا اور اس کے صدر ڈاکٹر صاحب موصوف ہی تھے لیکن اس نے عملی صورت اختیار کی ۱۹۵۲ء میں جب کراچی سے ۱۸ فرسنگ دُور ملیر کی ایک مختصر سی شکستہ و بوسیدہ عمارت میں ابتدائی یا پرائمری اسکول کا افتتاح ہوا۔ پھر کسی ابتدائی مدرسہ کو جاری کر دینا تو کوئی نئی یا بڑی بات نہ تھی لیکن جس مقصد کے تحت یہ اقدام کیا گیا وہ یقیناً نیا اور بہت بڑا تھا۔ یعنی اس درسگاہ کے قیام کا مقصد صرف موجودہ علوم و فنون کا درس دینا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی ان اخلاقی روایات کو بھی قائم کرنا تھا جن کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور جن کا علم نہ ہونے سے ایک شخص تعلیم یافتہ تو بن سکتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔

ظاہر ہے یہ کام محض تعلیم علوم و فنون کا نہ تھا، بلکہ تعمیر انسانیت کا تھا اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو جن دشواریوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کو ڈاکٹر صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا ہم تو اس کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن انھوں نے جس خاموش عزم کے ساتھ اس خارزار کو طے کیا اس کی دوسری مثالیں ہم کو کم ہی مل سکتی ہیں۔

دنیا میں جتنے انقلابات ظہور میں آئے ہیں وہ پند و مواعظ یا صحایف مقدسہ سے ظہور میں نہیں آئے بلکہ وہ نتیجہ تھے محض شخصیتوں کے جوش عمل کے اور اگر میں یہ کہوں کہ اس جامعہ کا قیام اور اس کی ترقی بھی صرف شخص واحد "ڈاکٹر محمود حسین" کی عظیم شخصیت کا نتیجہ ہے تو میرا یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا۔

کون کہہ سکتا تھا یا اس کا تصور بھی کر سکتا تھا کہ ملیر کی یہ درسگاہ ابجد دس سال کی قلیل مدت میں اتنا عظیم الشان دانش کدہ بن جائے گی کہ اس کو دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ نہیں سوچتا کہ یہاں کیا کیا ہے بلکہ یہ کہ "یہ کیا نہیں ہے" اور جب میں نے ۱۵ ستمبر کو وہاں جاکر اس کی مختلف علوم و فنون کی تجربہ گاہوں کو دیکھا تو میں نے بھی یہی سوچا کہ "یہاں کیا نہیں ہے" اور دیر تک سوچتا رہا۔ حیرت تھی کہ اتنی قلیل فرصت میں اتنا کثیر کام کیونکر ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور اساتذۂ جامعہ کی معیت میں، میں نے ہر ہر چیز کا بغور متحیرانہ مطالعہ کیا اور جب وہاں سے لوٹا تو اسی

تحیّر کو ساتھ لے کر لوٹا جو اب تک دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

میں نے یہاں کی تمام سائنسی علوم کی تجربہ گاہوں کو دیکھا جن میں طبیعیات، حیاتیات، نباتیات، حیوانیات، اقتصادیات، سیاسیات و تشریحات اور خدا جانے کیا کیا شامل ہے اور ان کے نظم و ترتیب سے اتنا متاثر ہوا کہ دل و دماغ پر بوجھ سا محسوس کرنے لگا اور یہ بوجھ شعبۂ نقاشی میں پہنچ کر کم ہونا شروع ہوا اور وہ اس طرح کہ جب یہاں ایک نیم عریاں رقاصہ کے مجسمہ کو دیکھا جس میں وہ رقص پر جانے سے پہلے اپنے پاؤں میں گھونگرو باندھ رہی ہے تو معاً حافظ کی "حدیث از مطرب و مے گو" والی فضا سامنے آگئی اور میں سب کچھ بھول گیا۔ اس وقت مجھے تو اس کی کمر کا بل، اس کی گردن کا خم اور اس کی کانٹے پر تلنے والی جوانی دیکھ کر کلیو پیٹرا یاد آرہی تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب اسے دیکھ کر یادِ خدا میں مصروف ہو گئے ہوں کہ احساسِ حسن و جمال کا انتہائی تأثر صوفیہ کے یہاں اسی جذبہ پر ختم ہوتا ہے۔

جب میں نے دریافت کیا کہ یہ مجسمہ کس کی تخلیق ہے تو سامنے کی دیوار پر ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا گیا جو اس شعبہ کے اُستاد کی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس "ریشِ افلاطون" رکھنے والے انسان سے ملوں[1] اور پوچھوں کہ یہ مجسمہ بنا کر انھوں نے اپنے کن "ناکردہ گناہوں" کا انتقام قدرت سے لیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ علیل تھے اور بعد میں جب ان کو دیکھا بھی تو بالکل سرسری طور پر اور دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ زندہ رہا تو اس "قتالہ" کا حال ضرور ان سے پُوچھوں گا۔

میں جب اس صنم کدہ سے باہر آیا تو مغرب کا وقت تھا، طلبہ نماز میں مصروف اور یہ (بڑا لطف دے گیا۔

اتفاق سے اسی دن مسجد جامعہ میں پرائمری اسکول کے طلبہ کی طرف سے مجلس میلاد النبی بھی منعقد ہونے والی تھی جس میں مَیں نے بھی شرکت کی اور سب سے پہلے یہیں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کتنی بلند و پاکیزہ شخصیت رکھنے والے انسان ہیں اس سے قبل وہ میرے ساتھ

---

[1] جامعہ ملیہ کے بہت پرانے اُستاد اور ملک کے ممتاز آرٹسٹ جناب سجاد صاحب کی طرف اشارہ ہے (ف۔ ف)

میری ہی طرح برہنہ سر چل پھر رہے تھے۔ لیکن جب مسجد میں پہنچے تو انھوں نے ٹوپی اپنے سر پر رکھ لی اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ ذکرِ نبویؐ سننے میں محو ہو گئے۔ میں اس وقت کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میرے کپڑے کسی نے اُتار لئے ہیں اور ساری دنیا مجھ پر ہنس رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اپنی ذلت کا احساس لئے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ کر گھر واپس آ گیا اور یہ یقین لے کر واپس آیا کہ اگر علومِ جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے جو اسلام کا نصب العین ہے تو اس وقت کراچی کی تمام درس گاہوں میں صرف جامعۂ ملیہ ملیر ہی ایک ایسی درسگاہ ہے جو اس ضرورت کو پُورا کر رہی ہے۔

خدا ڈاکٹر صاحب کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے اور جامعہ کے ارکان و اساتذہ و طلبہ کو انھیں کے کردار و پاکیزگیٔ اخلاق کی تقلید کی توفیق عطا کرے

اگر کبھی "کشاکشِ غمِ پنہاں" نے فرصت دی تو ایک بار پھر وہاں جاؤں گا تاکہ کچھ دیر یہاں کی پُر سکون فضا میں سانس لے کر دل و دماغ کا زنگ دُور کر سکوں۔

اک عالمِ نکتہ داں کی رحلت
دراصل ہے اک جہاں کی رحلت
سچ ہے کہ عظیم حادثہ ہے
"محمود حسین خاں" کی رحلت

۸۷۷

۸۷۷ + ۵۱۸ = ۱۳۹۵ھ

رئیس امروہوی

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم

کچھ یادیں کچھ باتیں

زندگی میں یہ بھی ہونا تھا کہ ڈاکٹر محمود حسین ہم سے یوں چھن جائیں اور میں ان کے سوگ میں اپنے تاثرات پیش کرنے کو اٹھ رہوں ۔ ایسی ہی کچھ صورت حال کے لئے رشید صدیقی صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ بعض دوستوں عزیزوں کی موت ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیے جانا بے غیرتی سی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کو یوں سمجھئے کہ میرا ساتھ تو ان کے بڑے بھائی ذاکر صاحب کا تھا اور کیسا کچھ گہرا ساتھ علی گڑھ میں، جرمنی میں، پھر دہلی اور خصوصیت کے ساتھ قرولباغ والی دہلی میں ۔ اس نسبت سے محمود صاحب ایسے کچھ جوان عمر نہ رہے ہوں لیکن میرے لئے تو جوان ہی تھے ۔ ان کے کتنے ہی تعزیتی جلسوں میں شریک ہوا اور مشکل سے ہچکیوں کے وقفوں میں کچھ کہہ پایا ۔ کیسی پیاری شخصیت تھی مرنے والے کی لیکن موت کی جیت تو بس ایک لمحہ کی ہوتی ہے زندگی کی حقیقی ابدیت مسلّم ہے اور اس ابدیت کا کچھ نہ کچھ پر تو محمود حسین کی جیسی زندگیوں کے حصے میں ذات باری کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے ۔

یادوں کے سلسلے میں کہاں سے شروع کروں ۔ مجھے بھی تعلیم ختم کر کے جرمنی سے واپس آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا یہی کوئی چار پانچ سال، یہ شاید ۳۳-۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ ایک دن ذاکر صاحب کے ساتھ جرمنی سے تازہ وارد ڈاکٹر محمود صاحب بھی ملنے آئے کیا گل و گلزار نقشہ تھا کہ دیکھتا رہ گیا اور شخصیت میں جوانی کی شوخیوں کے ساتھ ایک دل موہ لینے والا بھولپن ۔ پھر بعد میں ان سے ملنا کم ہی کم ہوا کیونکہ وہ کانے کوسوں ڈھاکہ جا رہے ۔ قرولباغ کی محفل تتر بتر ہوئی جامعہ اوکھلے اٹھ گئی اور پھر میں بھی آج کہیں کل کہیں یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں کراچی آ نکلا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ محمود صاحب وزارت کی کسوٹی پر کسے جا رہے تھے ۔ اس سلسلے سے مجھے بھی ان سے کچھ نہ کچھ لے رہنا تھا اور یقیں ملٹری ہاسپٹل

کی چار خالی بارکیں جن میں پی، سی، ایس، آئی، آر نے اپنی لیبارٹریاں قائم کیں جو وہاں سے دس بارہ سال تک کسی طور نکالے نہ نکلیں۔ اس عنوان سے سائنس اور خاص کر اطلاقی سائنس ان کی کتنی کچھ رہینِ منت ہیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا اس کا ذکر نگار کے اس خصوصی نمبر کے دوسرے مضامین میں آچکا ہوگا۔

اسی دوران میرے ساتھ جوان کا معاملہ ہوا وہ یہ تھا کہ میں جب ۱۹۶۶ء میں سائنس کونسل کی چیرمینی سے سبکدوش ہوا تو اس کے دوسرے ہی دن محمود صاحب ڈاکٹر افضال قادری مرحوم کے ساتھ گھر پہنچے کہ اب آپ یونیورسٹی آجائیں ہمیں اسی دن کا انتظار تھا۔ میں نے کہا بھائی آؤں تو کچھ کرنے کے لئے آؤں اور اس کی یہی ایک صورت ہے کہ یونیورسٹی، کیمسٹری کی پوسٹ گریجوئیٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کرے۔ انھوں نے بات اصولاً مان لی اور سات آٹھ سال کے دوران برابر ہر سطح پر منواتے رہے یہاں تک کہ کیا خوشی تھی ان کی جب ساری تگ و دو کے بعد حسین ابراہیم جمال فاؤنڈیشن کی طرف سے انسٹیٹیوٹ کے لئے پچاس لاکھ کا گرانقدر عطیہ ملا اور اسکے سہارے وزیر اعظم بھٹو کے ہاتھوں اس کی عمارت کے سنگ بنیاد نصب کرنے کی تقریب ۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء کو قرار پائی۔ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں کہ یہ خوشی وہ نہ دیکھ پائے۔ ہوا یوں کہ ۵ اپریل کو سنڈیکیٹ کی میٹنگ تھی آفس پہنچے تو ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ اسی تقریب کے لئے اپنے خطبہ استقبالیہ کو اسلام آباد بھیجنے کی جلدی میں کچھ اور لکھ کر ختم کر رہے تھے کہ ان کی جنبشِ قلم لہرا گئی۔ زندگی کے آخری لمحوں میں قلم سے وابستگی شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد تو پھر سانسوں کی گنتی رہ گئی تھی جو دس اپریل کو صبح ہوتے پوری ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا۔

محمود صاحب کی شخصیت اور کردار کی عظمتوں کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو ایک امانت کا درجہ دے رکھا تھا اور اس کا حق جس طرح انھوں نے ادا کیا ہے وہ خدا جانتا ہے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ محض ایک کہنے کی ہی بات نہیں ہے۔ ان کی دس مارچ سے لے کر دس اپریل تک کی ڈائری کے صفحات اس کی پوری گواہی دیں گے۔ اور شاید ہمارے نوجوانانِ چمن کی زندگیوں کے لئے ایک سبق

بھی چھوڑ جائیں۔

ایک اور بات بھی سنتے چلئے۔ ذاکر صاحب اکثر قائم گنج کے پٹھانوں کی بستی کے واقعات بیان کرتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے ہی عزیز کے گھر کا لطیفہ بھی آموں کی فصل تھی۔ کھانے کے بعد ان کی باری آئی تو ایک چار پانچ برس کے صاحبزادے کسی بات پر نوکرانی سے جز بز ہوئے اور اس پر چاقو تان بیٹھے۔ ماں نے ہاتھ پکڑ لیا باپ بھڑ پڑے کہ تم نے پٹھان بچے کا پہلا وار روک دیا۔ تو صاحب اس ماحول میں پلے بڑھے اور ایسا کچھ حلم و تحمل جوان کی طبیعت میں تھا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ جس دن سہ پہر کو انھیں دورہ پڑا ہے ایک ڈیڑھ بجے میرا ان سے ملنا ہوا۔ دیر تک بات رہی ایسا کچھ مسئلہ آن پڑا تھا کہ میں نے قدرے تلخی کے ساتھ کہا کہ یہ تو ایک مذاق ہوگا، اس پر انھوں نے کہا اور کئی بار کہا کہ "آپ اس کا خیال نہ کریں۔ آپ اس کا خیال نہ کریں"۔ یہ تھے ان کے تلقین صبر کے آخری لفظ جو ان کانوں نے سُنے اور جو دل میں کھٹکتے ہیں اور کھٹکتے رہیں گے۔

اب ان کے مزاج کی بے پناہ احتیاطوں کو لیجئے۔ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق میں نے ایک تفصیلی نوٹ پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ جرمن حکومت نے اس کے نئے اسٹیٹس مارک کی اصولاً منظوری دے دی ہے۔ یہ بات انھیں کھٹکی۔ کہنے لگے کہ یہ مانا کہ سارے قرائن اس کے ہیں لیکن جب تک جرمن وزارت کا سرکاری مراسلہ اس ضمن میں نہ آجائے اس وقت تک اِسے ذمہ دارانہ تحریر میں نہیں لا سکتے۔ اس کے لئے "اصولاً" کا لفظ بھی انھوں نے کافی نہ سمجھا اور "اِٹ اِز انڈر اِسٹڈ"[1] یعنی "اطلاعات کے مطابق" کی شرط پر راضی ہوئے۔ یہ تو صرف ایک مثال تھی۔ گزشتہ چار پانچ سال کی سنڈیکیٹ اور ساری ہی دوسری علمی اور انتظامی کمیٹیوں نے ان کا یہی دستور دیکھا۔ جتنی بات ہوا تنی کہتے اور جو کہتے اسے حتی الامکان پورا کرتے۔ لیکن یوں بھی تھا کہ جب کسی بات پر اَڑ جاتے تو اڑے رہتے اور ایسے میں پھر انھیں ٹس سے مس ہوتے کم دیکھا۔

اپنی صحت کی طرف سے ان کی جو بے اعتنائیاں رہیں اس کا ایک الگ کارخانہ

---

[1] IT IS UNDERSTOOD

تھا۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ ذاکر صاحب کے انتقال پر دہلی گئے تھے تو انھیں وہاں دل کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ کچھ دنوں تو انھوں نے اس کا خیال رکھا لیکن بعد میں جس طرح انھوں نے اپنی صحت کو روندا اس کا اندازہ ان کی گذشتہ چند مہینوں کی دیوانے کے خواب جیسی ڈائری کے صفحات سے ہوگا۔ ایک مرتبہ تو میں نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ آپ ماشاء اللہ جوان سہی لیکن خدا کے لئے اتنی جوانیاں نہ بگھاریں۔ مسکرا کے کہنے لگے کہ "کیا کروں" نہیں کرتے نہیں بنتی"۔ ایک سو دو درجہ کے بخار کے ساتھ سیمنار میں تقریر بھی کرنی ہوئی اور سارے ہی دوست واحباب کے بچوں اور بچیوں کی خانہ آبادی میں شرکت بھی۔ شاید وہ اس کے قائل تھے ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ایک اور واقعہ۔ عرصہ ہوا ان کی ڈاکٹر قریشی کے ساتھ کسی انتظامی معاملے میں شکر رنجی ہوگئی تھی۔ یہ بات ڈاکٹر قریشی صاحب نے بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں مجھے سنائی۔ میں وہاں سے اٹھ کر سیدھا ان کے پاس گیا سبھی کچھ کہا لیکن چہرے سے وہ ٹس سے مس ہونے والا نقش ہٹا کے نہ دیئے۔ پھر اٹھ کر چلتے ہوئے میں نے کہا کہ بھئی دیکھئے کبھی کبھی بزرگوں کا کہا بھی مان لیتے ہیں۔ اور پھر یہ کہا مان لیا گیا۔ ان آٹھ برسوں میں بزرگی کا حق میں نے صرف ایک بار اور ان سے مانگا اور پایا۔ یہ اسی سال کی بات ہے کہ یونیورسٹی کے جیسے کچھ حالات ہوگئے تھے ان سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے اس سے مستعفی ہونے کی ٹھان لی تھی۔ اس موقعہ پر بھی میں نے بہتیرا کچھ کہتے اور اکثر کہنے کے بعد بالآخر اپنی بزرگی جتائی اور وہ چپ ہوگئے۔

آخر میں صرف یہ کہنا رہ جاتا ہے کہ ذاکر صاحب نے ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے جشن سیمیں کے موقعہ پر اپنے دل ہلا دینے والے استقبالیہ کے آخر میں غالب کا جو شعر پڑھا تھا، اور جس پر جلسہ میں ایک سناٹا سا چھا گیا تھا کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل　　قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

یہی شعر ڈاکٹر محمود حسین کی ساری زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کے لوحِ مزار کی زینت بننے کا حق رکھتا ہے۔

عبدالواحد سندھی

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں رخصت ہوگئے میں نے ان کو قریب سے بھی دیکھا اور دور سے بھی وہ اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ کردار کے ایک پیکر خیر و برکت اور مروت تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شر کا کوئی پہلو ان کو دیا ہی نہیں گیا تھا۔

میں پہلی مرتبہ ان سے علی گڑھ میں ملا تھا بات یہ تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں رکھی تھی ۱۹۲۲ء میں اس جامعہ میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی پڑھائی کا انتظام ہوا۔

جامعہ ملیہ کا شہرہ سن کر میرے دل میں یہ تمنا کروٹ لینے لگی کہ میں کسی صورت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کروں، لیکن خود ہی یہ تمنا مجھے نقش بر آب معلوم ہوتی تھی۔ میں سندھ کے ایک دور دراز گاؤں "ودمن مہر" میں پیدا ہوا۔ سندھ میرا وطن ہے اور سندھ مجھے اس قدر عزیز ہے کہ میں اب سندھی کی نسبت سے پکارا جاتا ہوں۔ میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ میں سندھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا جس کا نام "ودمن مہر" ہے یہ ضلع سکھر میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ شرافت اور غربت میرا مقدر تھی۔ میں ایک غریب اور شریف گھرانے میں پیدا ہوا ولولہ بلند رکھتا تھا لیکن ہاتھ دولت سے خالی تھا۔ جامعہ کی تعلیم کی تمنا رکھتا تھا لیکن وسائل معدوم تھے۔

خدا کی قدرت کہ صوبہ سندھ سے حاجی عبداللہ ہارون کی طرف سے چھ غریب طالب علموں کے لئے جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے چھ وظیفے مقرر کئے گئے ان چھ خوش نصیب طالب علموں سے ایک میں بھی تھا اس وقت میری عمر تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی اس غیبی امداد پر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نے فوراً دہلی کا ٹکٹ لیا اور دہلی پہنچا۔ نیا ماحول، اجنبی ملک، میں اردو سے نابلد یہ سب باتیں مجھ پر اثر انداز ہوئیں اور فطرتاً گھبراہٹ محسوس کرنے لگا، پھر میں نے دل میں سوچا کہ وہ "ہرچہ بادا باد۔ ما کشتی در آب انداختیم"، اس خیال نے سکون بخشا وہ رات میں نے سرائے میں گذاری۔ صبح آفتاب طلوع ہوا۔

ایک اجنبی جو نہ راستوں سے واقف اور نہ اس جگہ سے واقف جہاں اسے جانا ہے۔ میں نے ایک یکے والے سے کہا کہ مجھے "ڈگی" کوٹھی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) پہنچادو جب میں ڈگی تالاب کے پاس پہنچا تو ایک لڑکے کو دیکھا نہایت نفیس کھدر کا لباس پہنے ہوئے چہرے سے اعلیٰ خاندانی شرافت کا نور عیاں، موسم سرما کی وجہ سے ایک خوبصورت دلائی اوڑھے ہوئے تھا تالاب کے کنارے پر دھوپ میں چہل قدمی کر رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کا نور نظر تھا۔ تندرست و توانا، بڑی بڑی آنکھیں، شہابی رنگ، ہونٹوں پر مسکراہٹ، گفتگو میں شیرینی، متانت اور سنجیدگی اجنبی کے لئے ہمدردی اور غم گساری، میں نے اس کی پہلی ہی گفتگو میں محسوس کر لی۔

میرا یہ عالم تھا کہ سندھی زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لڑکے نے مجھ سے پوچھا "بھائی کہاں جاؤ گے؟ اور کہاں سے آئے ہو؟" میں نے اس سے کہا کہ میں سندھ سے آیا ہوں اور جامعہ جاؤں گا" اس لڑکے نے خندہ پیشانی سے یکے والے سے کہا کہ "ہمارے پیچھے آؤ" تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک دفتر میں لے کر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک نہایت پر وقار شخص صاف و شفاف فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے مجھے ساتھ لے کر آنے والے لڑکے سے پوچھا "محمود میاں" یہ نیا لڑکا کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے۔ اس بزرگ کے کہنے پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہمدرد لڑکے کا نام محمود ہے۔ پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ بزرگ علی گڑھ کی مشہور شخصیت مسٹر حسن حیات ہیں جن کو مولانا محمد علی جوہر ان کے اعلیٰ فیشن کی وجہ سے "لارڈ حیات" کہتے تھے۔ جو جامعہ ملیہ کے رجسٹرار ہیں۔

میں نے اپنے داخلے کے کاغذات جناب حسن حیات کو پیش کئے۔ صاحب موصوف نے میرے ہمدرد لڑکے سے کہا ان کو "فرید منزل" میں داخل کرا آؤ۔

جیسے ہی ہم "فرید منزل" پہنچے تو میرے لباس اور وضع قطع کو دیکھ کر لڑکوں نے مسکراتے ہوئے کہا" بھئیا محمود اس بانگڑو لڑکے کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟ حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت میرا حلیہ بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ کپڑے میلے سفر کی وجہ سے ہیئت کذائی عجیب و غریب لڑکے مجھے ایک تماشا سمجھ کر دیکھ رہے تھے اور مجھے لانے والا لڑکا اپنے دل میں بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ یہ تھی میری پہلی ملاقات ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم و مغفور سے۔

انھوں نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں اپنی ہمدردی اور اعلیٰ اخلاق کا میرے قلب پر ایسا گہرا نقش

کیا تھا جو کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات بڑھے وہ نویں کلاس میں تھے اور میں چھٹی کلاس میں اسی وقت سے محسوس کرتا تھا کہ خدا نے محمود صاحب مرحوم کو لڑکپن ہی سے علمی ذوق، ذہانت، غیر معمولی قابلیت اور غیر معمولی شخصیت اور شائستگی سے نوازا ہے۔ ضرور ایک دن آگے چل کر ان کی شخصیت عہد آفریں شخصیت ہوگی۔

جامعہ ملیہ اسکول میں ان کا کردار یہ تھا کہ وہ اساتذہ کے فرماں بردار، نہایت مہذب، مؤدب و شائستہ، ہم جماعتوں کے لئے نہایت ہمدرد و مددگار اور اقامت گاہ کے نوکروں اور کام کرنے والوں کے لئے بھی خواہ اور غمگسار۔

اس وقت جامعہ کے اسکول میں تقریباً چار سو طلبا رہتے تھے لیکن جو دلکشی ان کی شخصیت اور ہردلعزیزی ان کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اسکول کی کلاسوں، اقامت گاہ کے کمروں اور کھیل کے میدان ان کے لطیفوں اور ان کے قہقہوں سے گونجتے رہتے تھے۔ خود ہنستے تھے اور ساتھیوں کو بھی ہنساتے رہتے تھے۔

محمود صاحب کی بڑی خوش نصیبی اور مقبولیت کی علامت یہ تھی کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر جو جامعہ میں ہی سکونت پذیر تھے جب ملک کے سیاسی دوروں سے لوٹ کر آتے تو سب سے پہلے محمود صاحب کو بلواتے اور ان سے دلچسپ لطیفے سنتے اور کچھ اپنے لطیفے سناتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ان کی خیریت پوچھتے اور اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین جو جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے، ان کی خیریت اور خطوں کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی قوت گویائی اور پراثر تقریروں کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا تھا جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکول میں ایک انجمن "بزم کمال" کے نام سے قائم ہوئی۔ مرحوم اس انجمن کے نائب صدر منتخب ہوئے اور صدر بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور انہوں نے اس موقع پر جو صدارتی خطبہ پڑھا تھا وہ اس قدر بہترین اور ولولہ خیز تھا کہ اس کی لذت اور شیرینی کو آج بھی نہیں بھول سکتا ہوں۔ اس خطبہ کی مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ کے تمام اساتذہ نے محمود حسین کو مبارکباد دی۔

اسی زمانے میں جامعہ کے طلبا نے مرحوم محمود حسین کی رہنمائی میں ایک مزاحیہ قلمی رسالہ "طوفان" کے نام سے نکالا۔ ابتدا میں یہ قلمی رسالہ مزاحیہ مضامین اور لطیفوں پر مشتمل ہوتا تھا لیکن کچھ عرصے کے

بعد اس کا نام بدل کر "جوہر" رکھا گیا۔ اب اس میں سنجیدہ ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین شامل ہونے لگے۔ اس کی ادارت کے فرائض مرحوم محمود حسین خاں ادا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کی یاد میں "جوہر" کا ایک خاص نمبر جامعہ کے تمام طلباء اور اساتذہ نے مل کر نکالا جو کافی معیاری تھا۔ تعلیمی اور ادبی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور وہ جامعہ ملیہ کی ہاکی ٹیم کے ایک عرصہ تک کیپٹن بھی رہے۔

مرحوم محمود حسین خاں نے سال ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں فرسٹ آئے اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرحوم مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی تجویز کے مطابق علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا گیا۔ دہلی میں جامعہ ملیہ کا تعلیمی کام پورے زور شور سے شروع ہوا۔

جامعہ کے تمام طلبہ اور اساتذہ علی گڑھ کے بجائے دہلی پہنچے مرحوم محمود حسین صاحب انٹر آرٹس میں پڑھتے تھے ۱۹۲۶ء میں انٹر کا امتحان دیا اس میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی بی۔ اے کرنے کے بعد جرمنی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے تیاری شروع کر دی۔ چند ماہ کے بعد "ہائیڈل برگ" جرمنی روانہ ہوئے روانگی کے موقع پر جامعہ کے اساتذہ اور طلباء نے دل کھول کر پارٹیاں دیں۔

بمبئی جانے کے لئے فرنٹیر میل پر شام کو مرحوم محمود صاحب کو الوداع کہنے کے لئے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے تمام اسٹاف کے اراکین اور طلباء جمع ہوئے میں اُن کی مشہور مسکراہٹ اور قہقہوں کی گونج ابھی تک نہیں بھول سکتا ہوں۔ اس موقع پر ان کے مہربان استاد مولانا شرف الدین ٹونکی، جو مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے اٹاوے کے اسکول میں اُستاد تھے۔ اور محمود حسین خاں کے جامعہ میں اُستاد تھے انھوں نے محمود حسین مرحوم کی کامیابی کے لئے دعا مانگی اور فرنٹیر میل روانہ ہو گئی۔ ہم سب لوگ بھی مرحوم محمود حسین خاں صاحب کامیابی و کامرانی کے لئے دل میں دعائیں مانگتے ہوئے جامعہ کے ہوسٹل کو لوٹے۔

مرحوم محمود حسین خاں نے ۱۹۲۸ء دہلی سے ہائیڈل برگ جرمنی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۲ء میں "ہائیڈل برگ" یونیورسٹی جرمنی سے تاریخ اور سیاسات میں پی ایچ ڈی کر کے وطن لوٹے۔ دہلی میں مرحوم محمود صاحب کے دوستوں نے شاندار استقبال کیا۔ اور ان کو پارٹیاں دی گئیں اور محفلیں منعقد ہوئیں۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر محمود حسین خاں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر تعلیمی کام شروع کیا۔ آخر میں صدر شعبہ اور بین الاقوامی اُمور

کے ہیڈ مقرر ہوئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دو سال کے لئے ڈیپوٹیشن پر ریڈیو کے مشیر مقرر ہوئے ۱۹۴۱ء میں پھر واپس ڈھاکہ تشریف لے گئے ۱۹۴۶ء میں مشرقی پاکستان اسمبلی سے دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ سے کراچی تشریف لائے۔

مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں، قیام پاکستان کے بعد جب کراچی میں مستقل اقامت پذیر ہوئے تو انھوں نے "مجلس تعلیم ملی" کی سرپرستی قبول فرمائی۔ یہ ادارہ مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں کے ڈھاکہ سے کراچی تشریف لانے سے پہلے ۱۹۴۸ء میں قائم ہوا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں نے اس ادارہ کی بڑی محنت اور توجہ سے سرپرستی اور رہنمائی فرمائی۔

اس حوصلہ مند ماہر تعلیم نے گزشتہ ۲۳ سال یعنی ۱۹۵۲ء میں جب جامعہ ملیہ ملیر میں کام شروع ہوا اس وقت سے اپنی وفات تک اپنے خالی وقت اپنی راحت و آرام قربان کر کے اس تعلیمی ادارے کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہے۔

مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں کو قدرت نے، بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ ڈاکٹر مرحوم ایک عظیم مقرر، مورخ، ماہر تعلیم اور مصنف تھے۔ ان کی کئی کتابیں علم تاریخ کے شائقین اور طلبار کے لئے نہایت مفید ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں کو خدا نے جس طرح بیرونی شکل و شباہت سے نوازا تھا اسی طرح انھیں اندرونی خوبیوں میں سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا۔ وہ مجسمہ مروت و مودت اور ہمدرد تھے۔ وہ اپنے بڑے بھائی مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

مرحوم ڈاکٹر محمود حسین خاں کی طبیعت پر ہمارے قومی رہنماؤں میں سے مولانا محمد علی جوہر کے اعلیٰ کردار اور ان کے اخلاق کا نہایت گہرا اثر تھا۔ اور ان کے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے تعلیمی دلچسپی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔

پاکستان میں جامعی برادری کے لئے ایک سہارا تھے ان کے دکھ درد کی مداوا تھے۔ جامعی برادری کو یتیم کر کے چلے گئے۔ ان کی محبت آمیز مسکراہٹ دکھی دلوں کے لئے مرہم تھی۔ خدا انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ اے ہم نفساں رفتید، ولے نہ از دل ما

ڈاکٹر حامد محمود

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے آخری ایّام

ڈاکٹر محمود حسین کے متعلق کچھ لکھنا آسان بات نہیں ہے، ایسے ہمہ گیر اوصاف کے انسان کی کن کن باتوں کا احاطہ کیا جائے اور کن باتوں کو چھوڑا جائے۔

میری نیاز مندی ڈاکٹر صاحب قبلہ سے اسی وقت شروع ہو چکی تھی جبکہ وہ جامعہ کراچی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے آتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے جامعہ میں ایک صحیح معنوں میں بھاری بھرکم شخصیت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ شکیل، وجیہہ، خوش گفتار، خوش پوش اور وضعدار۔ میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے ویسے تو اُن کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے ذریعہ اس وقت سے غائبانہ متعارف تھا جب ذاکر صاحب علیگڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے لیکن باقاعدہ ملاقات کراچی آکر پہلی بار ہوئی۔

معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جامعہ ملیہ دہلی کے طرز پر کراچی سے قریب ایک جامعہ تعلیم ملی نام کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ میں ان دنوں اپنے عزیز کے ہاں لانڈھی میں مقیم تھا اس لئے کئی بار جامعہ ملیہ جانے کا اتفاق ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد جبکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کالج قائم کیا اور اس میں سائنس کے تجربہ خانوں کی تعمیر اور تشکیل شروع ہوئی تو مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرنے اور ان کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ میرے استادِ محترم کی وساطت سے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر ہو سکے تو میں جامعہ میں ان سائنسی تجربہ خانوں کی تشکیل میں مدد دوں۔ چنانچہ موسمِ گرما کی تعطیلات میں تقریباً روزانہ چند گھنٹے میں جامعہ جاتا اور ماسٹر عبدالحیٔ صاحب کے ساتھ سائنسی تجربہ خانوں کے متعلق کاریگروں اور دیگر کارکنان سے تبادلہ خیال کرتا چنانچہ ان ہی چھٹیوں میں یہ تجربہ خانے تکمیل کو پہنچے اور اس قابل ہوئے کہ سالِ آئندہ سائنسی کلاسوں میں داخلے ہو سکیں۔

اس کے بعد انجمن اساتذہ میں جس کے ڈاکٹر صاحب کئی بار صدر رہے مجھے ان کے ساتھ کام

کرنے کا اتفاق ہوا میں یہ بات انتہائی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی رہبری میں انجمن نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ دیگر جامعات کی انجمنیں اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور بطور مثال پیش کرتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب بعدازاں کچھ عرصہ کے لئے ڈھاکہ چلے گئے اور میں بھی ان دنوں پاکستان سے باہر رہا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ڈھاکہ سے مستعفی ہو کر کراچی تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب کی میعاد ملازمت ختم ہوئی تو سب کی خواہشات کے عین مطابق ڈاکٹر صاحب کو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلری کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ کراچی یونیورسٹی کو ایک انتہائی باوقار وائس چانسلر مل گیا۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب، اپنی کمزور صحت کے سبب اس بار کو نہ اٹھا سکیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب ایسی قوتِ ارادی کے مالک تھے کہ تادمِ آخر اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور ذمہ داری عملاً قبول کرنے کا حق ادا کر دیا۔

ان دنوں یونیورسٹی کی انتظامیہ میں کئی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ رجسٹرار صاحب ریٹائر ہوئے، ان کی جگہ اساتذہ میں سے ایک صاحب کو ڈاکٹر صاحب نے یہ ذمہ داری سونپی اور تقریباً ایک ڈیڑھ سال کی خدمت کے بعد جب وہ صاحب بیرونی ملازمت پر جانے لگے تو ایک دن دفعتاً میری طلبی ہوئی اور میری توقع کے خلاف اچانک ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ میرے کانوں سے ٹکرایا کہ "حامد محمود صاحب میں آپ کو ایک ذمہ داری سونپنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ڈاکٹر رئیس احمد خاں صاحب جا رہے ہیں آپ ان سے چارج لے لیں۔" میں نے عرض کیا "یونیورسٹی میں ملازمت پڑھنے پڑھانے کے لئے کی تھی نہ کہ رجسٹراری کرنے کے لئے" تو اس کا برجستہ جواب یہ تھا کہ "بہت سے کام، انسان کو اپنی آسائش یا منفعت سے بالا ہو کر کرنے پڑتے ہیں، اس لئے آپ انکار نہ کریں۔"

چنانچہ ۸ / اکتوبر سنہ ۱۹۷۳ء کی صبح کو میں نے کراچی یونیورسٹی کے رجسٹرار کا چارج لے لیا اور اس کے بعد میرا تعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم سے انتہائی قریبی ہو گیا۔ میرے لئے ان کی قوت فیصلہ اور اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی خوبی ایسی تھی جو میں نے کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ ان کے کام کرنے کا اصول یہ تھا کہ دفتر کا کام دفتر ہی میں نمٹا دیتے تھے۔ چنانچہ وہ صبح ۹ بجے سے دوپہر ۱ بجے تک تقریباً بغیر کسی آرام یا مہلت کے کام کرتے۔ اسی دوران میں میٹنگ اور لوگوں سے ملاقات کا وقت بھی نکال

لیتے تھے۔

اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت سی ذمہ داریاں متعدد کمیٹیوں ۔۔۔۔ کو سونپ دی تھیں۔ کام کرنے کا فلسفہ یہ تھا کہ جس قدر زیادہ لوگوں کو شامل کیا جائے اس قدر بہتر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان سب کی ذمہ داری وہ اپنے اُوپر لے لیتے تھے۔

انتقال سے چند ہفتے پہلے ڈاکٹر صاحب پر کام کا بار کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ کئی اہم معاملات تھے، مثلاً انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کا سنگ بنیاد جس میں وزیراعظم کی تشریف آوری، فارمیسی میں طلبہ کا داخلہ اور سب سے بڑھ کر یونیورسٹی کا مالی بحران جو کہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ان سب کا اثر ڈاکٹر صاحب کی صحت پر پڑ رہا تھا، لیکن یہ کسی کے گمان میں نہ تھا کہ ان اثرات کا ردِعمل اس قدر شدید آناً فاناً ہوگا۔

جمعہ ۴ر اپریل کی شام کو ڈاکٹر صاحب میرے مکان تشریف لائے اور یونیورسٹی انجینئر اور ڈاکٹر قدیر کو بھی بلوا لیا، تاکہ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کے سلسلے میں انتظامات کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ہم سب اس جگہ کا معائنہ کرنے گئے جہاں عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جانا تھا۔ ان تمام انتظامات کو دیکھنے کے بعد کوئی ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر صاحب مطمئن ہو کر گھر واپس گئے۔ غالباً ان کی یہ آخری شام تھی جو انھوں نے کہیں جا کر گزاری اور ۵ر اپریل کی صبح حسبِ معمول اپنی گھما گھمیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب پروگرام کے مطابق ۹ بجے دفتر آئے۔ اس دن کئی مسائل پر غور کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے انجمن طلباء کے صدر و معتمد سے ملاقات کی۔ میں بھی اس وقت دفتر میں موجود تھا۔ گفتگو انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کے سنگ بنیاد کے سلسلے میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کے رہنماؤں سے کہا کہ "سنگ بنیاد کی تقریب ۱۴ر اپریل کو ہے اور وزیر اعظم صاحب تشریف لائیں گے اس لئے اس کو بطور خاص کامیاب بنانا ہے کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہونی چاہیے"۔ ہمارے طلباء کا مطالبہ تھا کہ قبل اس کے کہ وزیر اعظم صاحب یونیورسٹی کی کسی تقریب میں تشریف لائیں وہ طلباء کے نمائندوں کو ملاقات کا شرف بخشیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے زور دے کر فرمایا کہ آپ سے ملاقات بھی ہوگی اس کا ذکر وہ خود وزیر اعظم سے کر چکے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد طالب علم رہنما مطمئن ہو گئے اور ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے

جس میں بطور خاص اس خطبہ پر نظر ثانی کرنا تھی جو ان کو حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کے سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر پیش کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ضروری مواد کے لئے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو یاد کیا وہ ضروری کاغذات لے کر آگئے اور تبادلۂ خیال کیا۔ اسی دن دو اہم میٹنگیں تھیں۔ ایک ۱۱ بجے دن کو جس میں ان طلباء کے مقدموں پر غور کرنا تھا جن پر دوران امتحان نقل یا اسی قسم کی دوسری حرکات کرنے کے الزامات تھے دوسری میٹنگ ۴ بجے شام کو سنڈیکیٹ کی تھی۔

۱۱ بجے کی میٹنگ پروگرام کے مطابق شروع ہوئی اور فرداً فرداً ہر طالب علم کے مقدمہ پر غور کیا گیا اس میٹنگ میں ڈاکٹر صاحب اتفاق سے طلباء کو شک وشبہ کا فائدہ دینے پر زیادہ مائل تھے۔ چنانچہ طلباء کی ایک کثیر تعداد کو اسی بناء پر کمیٹی نے بری قرار دیا۔ میٹنگ خاصی طویل تھی کوئی ۱½ بجے ختم ہوئی، اس کے بعد تھوڑے عرصے کے لئے پھر ڈاکٹر سلیم الزماں سے انسٹی ٹیوٹ کے پروگرام کے متعلق گفتگو کی اور ساتھ ہی ایک خط کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جو کہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک رکن نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو لکھا تھا اور اس میں کچھ ناخوشگوار باتیں تحریر تھیں۔ چلتے وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب سے کہا کہ آپ ان باتوں سے پریشان نہ ہوں۔ ان دونوں بزرگوں کی یہ آخری گفتگو تھی۔

ڈاکٹر صاحب دو بجے سے کچھ پہلے مکان کے لئے انتہائی خوش و خرم روانہ ہوئے لیکن یہ ضرور تھا کہ اس وقت ان کے ذہن پر کوئی آدھے درجن مسائل سوار تھے۔ چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ "میٹنگ سے ۱۰ منٹ پہلے آجاؤں گا۔ میں سہ پہر کو پونے چار بجے اپنے دفتر پہنچا۔ اس وقت انتظامیہ کی عمارت کی نچلی منزل میں طلباء کا ایک گروہ، پوسٹر اور بینر لگانے میں مصروف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا مطالبہ فارمیسی میں داخلے کا تھا اور اس سلسلے میں سنڈیکیٹ کے ممبران کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔

دفتر پہنچنے کے بعد نیچے سے کچھ نعروں کی آواز آئی اور اس کے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آچکے ہیں اور چند ممبران سنڈیکیٹ بھی پہنچ گئے ہیں۔ ممبروں میں جسٹس ابراہیم محمود، جناب بھرگری، انیتا غلام علی صاحبہ، جناب جمیل اختر صاحب، جناب رئیس صاحب اور جناب حفیظ زیدی صاحب شامل تھے۔ ابھی میٹنگ کے وقت میں چند منٹ باقی تھے کورم بھی پورا نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے

دفتر میں کرسی پر بیٹھے ایک چھوٹے بیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ میں نے جاکران سے میٹنگ کے متعلق عرض کیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ایک یادو لفظ کے بعد رک جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مناسب الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔ میرا خیال اس وقت مثلاً اس طرف گیا کہ چونکہ نیچے طلبہ مظاہرہ کر رہے ہیں اس لئے شاید ڈاکٹر صاحب کچھ اعصابی تناؤ محسوس کر رہے ہیں اور انھیں بات کرنے میں تکلف ہو رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی میری نظران کے قلم پر پڑی جو کہ صحیح طور سے نہیں چل رہا تھا اور پھر جب میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو دائیں جانب جو کچھ نظر آیا اس سے مجھے شبہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب پر خدانخواستہ لقوہ کا حملہ ہو رہا ہے۔

میں نے وہاں موجود سنڈیکیٹ کے اراکین سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ہے اور میں ڈاکٹر کو طلب کر رہا ہوں۔ چنانچہ فوری طور پر وائس چانسلر کی موٹر بھیجی کہ ڈاکٹر محی الدین کو لے آئیں اور میں اپنی موٹر میں ڈاکٹر منظور عالم کو لینے چلا گیا۔ دونوں ڈاکٹر کیمپس ہی میں رہتے ہیں۔ کوئی ۳ بجکر ۲ منٹ پر دونوں پہنچ گئے۔ ممبران سنڈیکیٹ کی مدد سے ڈاکٹر صاحب کو صوفے پر لٹا دیا گیا تھا۔ ان کے جسم کا داہنا حصہ مفلوج ہو چکا تھا، گفتگو پر قدرت باقی نہیں رہی تھی البتہ وہ اس وقت تک لوگوں کو پہچان سکتے تھے اور تھوڑے بہت ردعمل کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ تشخیص فالج کی ہوئی اور ماہرین سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ طے پایا کہ محترم وائس چانسلر کو ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ ان کے گھر بھیج دیا جائے۔

کوئی ۵ بجے کے قریب یونیورسٹی کی ایمبولنس کے ذریعہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو ان کے مکان پر پہنچا دیا گیا اور ان کے ساتھ ہی اس وقت موجود ممبران سنڈیکیٹ اور راقم الحروف بھی مکان پہنچے۔ وہاں سے ٹیلی فون پر مزید ماہرین سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور سب سے پہلے ڈاکٹر ذکی حسن اور اس کے بعد ڈاکٹر حامد شفقت پہنچے۔ دونوں نے ڈاکٹر صاحب کا ازسرِ نو معائنہ کیا اور یونیورسٹی کے ڈاکٹروں کی تشخیص اور جو کچھ علاج اس وقت تک ہوا تھا اس سے اتفاق کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کو امراضِ قلب کے اسپتال میں منتقل کیا جائے اور وہاں کم از کم ۷۲ گھنٹے ——— رکھا جائے۔ اگر اس دوران کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی تو پھر جناح اسپتال میں منتقل کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کمانڈر شوکت سید نے جو کہ امراضِ قلب کے اسپتال کے ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر حامد شفقت سے فون

پر گفتگو کی اور کمرہ کا بطور خاص انتظام کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر رتب اور ڈاکٹر ہارون بھی پہنچ گئے تھے۔ تشخیص سب کی فالج کی تھی۔ کوئی ۶ بجے شام ڈاکٹر صاحب کو اسپتال پہونچا دیا گیا، وہاں INTENSIVE CARE UNIT میں جگہ ملی جہاں جدید ترین آلات لگے ہوئے ہیں۔

شام کی خبروں میں ڈاکٹر صاحب کی علالت کی خبر عوام کو ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ دی گئی۔ پھر کیا تھا اسپتال میں عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر فرد اس اچانک خبر سے بے حد دل برداشتہ تھا۔ آنے والوں میں اکابرین شہر، یونیورسٹی اور جامعہ تعلیم ملی کے اساتذہ وطلباء وملازمین اور بے شمار دیگر حضرات شامل تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادیوں، داماد اور صاحبزادے کو مطلع کر دیا گیا تھا، اس خبر کے سنتے ہی وزیر تعلیمات حکومت سندھ جناب الآنہ صاحب اسپتال تشریف لائے اور ڈاکٹروں سے مرض کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ اسپتال میں ایک اور کمرہ بیگم صاحبہ و دیگر عزیزوں کے لئے جناب الآنہ صاحب کے توسط سے مختص کر دیا گیا تھا۔

سب لوگ پُر اُمید تھے کہ فالج کا یہ دورہ دو ایک دن میں ہلکا پڑ جائے گا۔ دوسرے دن معالجین کی رپورٹ خاصی اطمینان بخش تھی۔ میں بھی صبح و شام اسپتال حاضری دیتا تھا۔ اتوار ۶ اپریل کو معالجین کی رپورٹ تھی کہ "ڈاکٹر صاحب کی حالت قابل اطمینان ہے"۔ یہی کیفیت شام تک رہی۔ البتہ نیم غشی طاری تھی۔ پیر ۷ اپریل صبح چار بجے اسپتال سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور ان پر قلب کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس کے نظام تنفس میں بھی خلل واقع ہو گیا اور تنفس کے لئے مشین سے مدد لی جا رہی ہے۔ اسی دن میں وزیر تعلیم حکومت سندھ کیبنٹ میٹنگ سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کی عیادت کو آئے اور تھوڑی دیر بعد قائم مقام گورنر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ معالجین اپنی بھرپور کوشش میں مصروف تھے لیکن اب سب لوگ نا اُمید ہو چکے تھے۔ شام تک معالجین نے کوئی اُمید افزا خبر نہ دی۔ یہ کیفیت ۸ و ۹ اپریل تک قائم رہی اور اسی حالت میں ۹ و ۱۰ کی شب کو آخر کار ڈاکٹر صاحب کی قوت مزاحمت جواب دے گئی اور کوئی ۲ بجکر ۴ منٹ پر وہ ایک خلقت کو سوگوار چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

سید محمد نجم الدین

ایک ہمہ گیر شخصیت

اب سے کوئی بائیس سال پہلے ایک دن اچانک ریڈیو پاکستان نے اپنی رات کی نشریات میں اعلان کیا کہ سربراہ مملکت کے ایک حکم کے تحت وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی کابینہ برطرف کردی گئی۔ اس خبر کے نشر ہوتے ہی معزول شدہ کابینہ کے ارکان کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین کے بارے میں جو علمی دنیا کی نہایت ممتاز شخصیتیں تھیں۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد ڈاکٹر محمود حسین صاحب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر کردیے گئے اور ان کی تقرری کی خبر نے یونیورسٹی کے حلقوں سے مختلف النوع تاثرات ظاہر کئے۔ ایک طرف ایک ممتاز علمی شخصیت کی شمولیت کو یونیورسٹی کی صفِ اساتذہ میں قابلِ قدر اضافہ سمجھا گیا تو دوسری طرف ایک سابق مرکزی وزیر کا جس کی تحویل میں وزارتِ تعلیم کا قلمدان رہ چکا تھا، یونیورسٹی میں شامل ہونا مساوات اور توفق کے مسئلے پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد دیکھا یہ گیا کہ اندیشے، اندیشے ہی نکلے۔ ڈاکٹر محمود حسین کی منکسر مزاجی، بے نفسی اور بے تکلفی نے جو ان کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے۔ لوگوں کو بیحد متاثر کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ جب وزارت سے کنارہ ہوکر یونیورسٹی میں آئے تھے۔ وہ ان کے لئے محض ایک اتفاقی حادثے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ علمی اور تدریسی ماحول میں آکر ہی زیادہ مطمئن اور مسرور نظر آئے۔ یہ اہل علم کی شان ہوتی ہے کہ جب وہ خود جاہ و منصب کے حامل ہوتے ہیں تو ان کی طبیعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ وہ دوسرے صاحبان جاہ و منصب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اسی شان کے انسان تھے۔ ان کا انداز فکر یہی تھا اور ان کے اس انداز فکر کے وجوہ و دلائل کی دریافت کوئی زیادہ مشکل امر نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے صغر سنی سے ہی علمی ماحول میں زندگی

بسر کی۔ ان کے برادرِ معظم ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی بڑی نمایاں مثال ان کے آگے تھی جنھوں نے باوجودیکہ یورپ اور ہندوستان سے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کیں مگر علم کو محض کسبِ معاش اور جاہ و منصب کے حصول کا ذریعہ بنانے سے احتراز کیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی یا سرکاری ملازمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور جامعہ ملیہ کی خدمت کرنا اپنا نصب العین بنایا اور جس کے لئے ایک نہایت قلیل معاوضہ لینا گوارا کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کا علم سے گہرا دلی لگاؤ ہی تھا جس نے انھیں ایسے اقدام پر آمادہ کیا۔ اپنے برادرِ محترم کی اس نمایاں مثال کے بعد۔ ڈاکٹر محمود حسین کی طبیعت میں علمی شاغل کی قدر و منزلت کا موجود ہونا فطری امر تھا۔

کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں قائم ہو چکی تھی مگر پرنسس اسٹریٹ میں یونیورسٹی کو جو اسکولوں کی متروکہ سات عمارتیں۔ دفتر اور تدریسی شعبوں کے لئے مخصوص کی گئی تھیں بڑے عرصے تک مہاجروں کی جائے پناہ ہونے کے باعث بوسیدہ اور خستہ حال ہو چکی تھیں اور یونیورسٹی کے لئے قابلِ استعمال نہیں تھیں لہٰذا جیسے جیسے عمارتوں کی مرمت ہوتی گئی استعمال میں لائی جانے لگیں۔ یونیورسٹی کے قیام کے کئی مہینے بعد تک دفتر کے کام وائس چانسلر پروفیسر ابو بکر احمد حلیم مرحوم کی قیام گاہ پر ہوتے رہے اور بالآخر ستمبر ۱۹۵۱ء میں اپنی عمارت میں منتقل ہوئے پھر تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی تقرری کے بعد جب مزید دفاتر اور تعلیمی شعبے قائم ہوئے تو مختلف عمارتوں منتقل ہوتے گئے۔ تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کا تقرر کراچی یونیورسٹی میں جولائی ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ اس وقت وہ عمارت جو شعبہ تاریخ کے لئے مختص کی گئی تھی ابھی ناقابلِ استعمال تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب مرحوم میرے دفتر کے کمرے میں آکر تشریف رکھتے۔ میرا دفتر ایک اوسط طول و عرض کے نصف کمرے میں تھا اور دوسرے نصف حصے میں رجسٹرار مرزا اختر حسین کا دفتر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ روزانہ معمول اس وقت تک رہا تاآنکہ ان کے شعبے کی عمارت حسبِ ضرورت مکمل نہ ہو گئی۔ وہ بلاناغہ تشریف لاتے اور یونیورسٹی کے تدریسی اوقات کی مکمل پابندی فرماتے۔ سارا وقت میرے کمرے میں ایک کرسی پر مصروفِ مطالعہ ہوتے یا پھر یونیورسٹی کی لائبریری میں مطالعہ کتب ہوتے۔ کتب بینی میں ان کا یہ انہماک

دیکھ کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ انھوں نے اپنے عہدِ وزارت میں بھی علمی مشاغل کو جاری رکھا تھا۔ میں اس وقت اسسٹنٹ رجسٹرار تھا۔ ان کی بے تکلفی اور خلوص نے جلد ہی مجھے ان سے قریب کر دیا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت فرماتے۔ چنانچہ جب وہ اپنے شعبے میں منتقل ہو گئے اور وہاں کے تدریسی مشاغل میں پوری طرح مصروف ہو گئے اور ان کی ذمہ داریاں بے حد بڑھ گئیں تو بھی وقت نکال کر کچھ دیر کے لئے میرے پاس ضرور تشریف لاتے۔ اس مختصر سے وقت میں مزاج پرسی بھی ہو جاتی اور شعبے کے سلسلے میں اگر کچھ کام ہوتا تو وہ بھی بتا جاتے۔ شعبے کے امور سے متعلق بھی وہ اتنی ہی فکر مندی کا اظہار کرتے جتنی کسی کو اپنے ذاتی امور سے ہوتی ہے۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا، میں ڈپٹی رجسٹرار ہوا اور پھر رجسٹرار، جناب ڈاکٹر صاحب اسی خلوص سے میرے پاس تشریف لاتے رہے۔ اور یہ سلسلہ بیس سال تک قائم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق اس وقت سے ہی استوار ہو چکا تھا جب یونیورسٹی ایکٹ کا مسوّدہ مرتب کیا جانے لگا۔ ان دنوں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرکزی وزیر تھے۔ دونوں کو علمی امور میں بڑا شغف تھا اور وسیع تعلیمی تجربہ بھی۔

جب یونیورسٹی میں آرٹ فیکلٹی کے ڈین کا عہدہ قائم ہوا تو ڈاکٹر محمود حسین صاحب اپنی علمی صلاحیت اور مقبولیت کی بناء پر بہ اتفاقِ رائے ڈین منتخب کر لئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت پروفیسر اور ڈین اکیڈمک کونسل، سینڈیکیٹ اور اس وقت کی سینٹ کے بھی رکن منتخب ہوتے رہے۔ وہ میٹنگ کی کارروائیوں میں پوری دلچسپی سے حصّہ لیتے تھے۔ اور مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے تھے۔ ایسے موقعے پر جب دوسرے اراکین جزئیات پر اپنی توجہ مرکوز کرتے۔ قانونی موشگافیاں کرتے اور موافق و مخالف دلیلوں میں الجھ جاتے تو ڈاکٹر صاحب نفسِ معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے اور بہت جلد کوئی نہایت معقول تجویز پیش کر دیتے۔ ان کا مشاہدہ بہت صاف اور واضح ہوتا۔ بیحد حساس تھے اور مسائل کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی

کوشش کرتے تھے۔ انسان غلطیاں تو اس وقت کرتا ہے جب توازن پر تعصب غالب آجائے مگر ڈاکٹر صاحب تو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر تھے اور یہی وجہ تھی کہ تمام لوگوں کو ان پر مکمل بھروسہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب سنڈیکیٹ میں ان کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب اگر کسی فیصلے سے اتفاق یا اختلاف کا اظہار کرتے تو ان کی رائے نہایت معقول بنیادوں پر قائم ہوتی اور وقتی مصلحتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ان کا کسی فیصلے سے اتفاق نہ ہوتا تو وہ اپنا اختلافی نوٹ درج کرا دیتے۔

اہلِ علم "سلسلۂ روز و شب" کو "نقش گرِ حادثات" سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے کم تر متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب وزیر تھے تو اس وقت بھی اپنے اہل و عیال پر ہمیشہ یہ بات واضح کیا کرتے تھے کہ ان کی اصل حیثیت ایک معلم کی ہے۔ وزارت ان کے لئے ایک وقتی اور غیر یقینی چیز ہے۔ چنانچہ اسی اندازِ فکر نے ان کو دوبارہ تدریسی مشاغل اختیار کرنے پر بآسانی راغب کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات ایک انجمن تھی وہ جہاں بیٹھ جاتے اپنی بذلہ سنجیوں اور حسنِ بیان سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے تھے۔ ان کو چٹکلے اور واقعات بہت یاد تھے جن کے بیان سے ان کی گفتگو بہت ہی دلچسپ اور شگفتہ ہو جاتی۔ ان کا ادبی ذوق بھی بڑا ستھرا تھا۔ اشعار بہت یاد تھے با موقع و برمحل استعمال سے ان کی باتوں میں بڑی حلاوت آجاتی۔

ڈاکٹر صاحب کے عالمانہ مزاج اور درویشانہ شخصیت کا اندازہ ان باتوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ظاہری کر و فر اور لباس میں تکلف سے دور رہا کرتے تھے، سادہ لباس، سادہ غذا اور سادہ رہن سہن ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی۔ نیکی، شرافت اور حق پسندی ان کا نصب العین تھا۔ سیاست میں بھی وہ تمام گھٹیا چالوں اور ناجائز ریشہ دوانیوں سے الگ تھلگ رہے۔ وہ بڑے حساس آدمی تھے۔ دوسروں کا دکھ درد بڑی شدت سے محسوس کرتے

۱۳ مارچ کی شب، جب ٹی، وی پر جبری ریٹائرمنٹ کی زد میں آنے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی سنا تو اسی وقت یونیورسٹی کی میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور بہت پژمردہ و ملول دکھائی دیئے۔ فرمایا "یہ کیا اندھیر ہے؟ تم کو آخر کس گناہ کی سزا ملی؟" مگر جب آپ مجھ کو بہت مطمئن پاکر ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ پہلے تو میں نے انھیں تشریف رکھنے کو کہا۔ پھر عرض کیا، آپ پریشان نہ ہوں۔ آخر مشرقی پاکستان میں اللہ کے بندوں پر کیسی کیسی قیامتیں نہ گذر گئیں۔ وہ جان و مال، عزت و آبرو کیا کیا نہ کھو بیٹھے۔ مجھ پر تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی ہے اور اسی چیز نے مجھ کو بڑا سکون بخشا ہے۔ اللہ کی ذات پر میرا بھروسہ ہے، میرا ضمیر صاف اور مطمئن ہے اور یہی میرے لئے بڑی نعمت ہے۔ میری باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ کچھ دیر تک ان سے دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ اب رات زیادہ آگئی تھی لہٰذا گھر تشریف لے گئے۔ پھر اسی سلسلے میں وہ دوسرے ہی روز ممتاز علی بھٹو گورنر سندھ سے ملے جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے افراد کی اس فہرست میں شمولیت سے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ بادی النظر میں تو یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے ڈاکٹر صاحب کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔

سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے عہدے کی میعاد جب ختم ہونے کو آئی تو انھوں نے سندھ کے اس وقت کے گورنر رحمٰن گل کو جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے لکھ بھیجا کہ ان کے عہدے میں اب مزید توسیع نہ کی جائے گورنر نے ڈاکٹر قریشی صاحب کو ایک روز طلب کیا اور پہلے تو ان سے یہ کہا کہ وہ اپنے عہدے میں مزید کچھ مدت کی توسیع قبول کرلیں لیکن جب ڈاکٹر قریشی اس پر رضامند نہ ہوئے اور معذرت پیش کی تو گورنر نے ان سے کسی ایسے آدمی کا نام پیش کرنے کی درخواست کی جو اس عہدے کے لئے ہر لحاظ سے موزوں و مناسب ہو۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے دل کی آواز بن چکے تھے۔ چنانچہ قریشی صاحب نے فوراً ہی ڈاکٹر محمود صاحب کا نامِ نامی پیش کر دیا۔ گورنر ہاؤس سے واپسی کے بعد ڈاکٹر قریشی صاحب نے مجھے اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو جو اُس وقت میرے ہی دفتر میں تشریف فرما تھے بلایا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم سے وائس چانسلری

کا عہدہ قبول کر لینے پر اصرار کیا اور کہا کہ آپ سے زیادہ موزوں اور کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا یونیورسٹی کے مفاد میں بھی یہی ہے کہ آپ اس عہدے کو قبول کر لیں کیونکہ یونیورسٹی کے سارے معاملات سے آپ کا تعلق ابتدا سے ہے اور آپ جملہ امور میں شریک رہا کئے ہیں۔ دیر تک ڈاکٹر صاحب اپنی خرابیٔ صحت کا عذر پیش کرتے رہے۔ میں نے بھی حتی المقدور اس عہدے کو قبول کر لینے کے لئے ان پر زور دیا۔ غرض بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس عہدے کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو گئے اور ڈاکٹر قریشی صاحب نے ملٹری سکریٹری کے ذریعے گورنر سندھ سے ان کی ملاقات کا وقت مقرر کروا دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب گورنر ہاؤس تشریف لے گئے۔ ان کے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد گورنر کے ملٹری سکریٹری نے ڈاکٹر قریشی صاحب کو فون پر بتایا کہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے وائس چانسلر کا عہدہ قبول کر لیا ہے۔ ابھی ہم لوگ اسی موضوع پر ہی باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب گورنر ہاؤس سے واپس تشریف لے آئے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی فرمایا "آپ لوگوں نے کہاں پھنسا دیا؟" پھر بیٹھ گئے؟ پھر مزید باتیں تفصیل سے ہوئیں۔ غرض ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے ڈاکٹر قریشی صاحب کی ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد وائس چانسلر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ تمام حلقوں میں ان کے تقرر کا خیر مقدم کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر معذرت کا اظہار کیا تھا اور واقعی یہ دیکھا گیا کہ نئے عہدے کا بار ان کی صحت پر خاصا اثر انداز ہونے لگا۔ چنانچہ ان کے انتقال سے محض چند ہفتے پہلے میں نے ایک ملاقات کے دوران ان کی صحت کو اس قدر مضمحل دیکھا کہ انھیں کم از کم چند مہینوں کے لئے دفتری مشاغل سے کنارہ کش ہو کر آرام کرنے کا مشورہ دیا اور اب جبکہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں تو مجھے یہ احساس ستاتا ہے کہ میں نے بھی تو انھیں وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

گذری ہوئی شخصیت کے کارناموں کی تفصیل پیش کرنا ایک روایت بن گئی ہے اور یقیناً یہی تفصیلات اجنبی حلقوں کو ان کے کارناموں کا معترف بناتی ہیں۔ لیکن ان کا حلقۂ احباب اور ان کے اعزہ فی الواقع ان کی جس چیز کو یاد رکھتے ہیں وہ ان کی "انسانیت"

ہے۔ انسانیت سے مراد ہے دوسرے انسانوں کا احترام، ان سے ہمدردی، انکی لغزشوں سے چشم پوشی اور اپنے بارے میں مجموعی طور پر ایک سچے اور ستھرے انسان کا تاثر دینا۔ جن لوگوں کو بھی ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کے قریبی حلقوں میں شمولیت کا شرف حاصل تھا وہ انھیں نہایت ہی صاف ستھرا اور سچا انسان سمجھتے تھے اور یہی کسی انسان کا منتہائے انسانیت ہے۔

فلسفۂ توحید لازمی طور پر ایک اور فلسفہ کو جنم دیتا ہے اور وہ ہے فلسفۂ مساوات انسانی۔ جو حریت اور آزادی کی بنیاد ہے۔ اسلام کے ساتھ جب یہ خیال دنیا کے سامنے آیا تو یہ ایک انقلابی تصور تھا اس لئے کہ دنیا تو مدتوں سے انسانوں کے مابین اونچ نیچ کی قائل رہی تھی۔ ایک قوم دوسری قوم کو ذلیل اور اپنے سے کمتر سمجھتی تھی۔ یونان نے فلسفہ، سائنس اور آرٹ میں دنیا کو کیا کچھ نہیں بخشا۔ مگران بلندیوں کے باوجود جواس نے جواس نے چھوئیں۔ کیا اہل یونان دوسری اقوام کو وحشی خیال نہ کرتے تھے۔ اور کیا ان کے نزدیک غلامی جائز ہی نہیں ضروری نہ تھی۔ یہودی اپنے کو خدا کا چہیتا اور دوسروں کو راندۂ درگاہ کہتے تھے۔ ہندو تو پوری طرح ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اعلیٰ ادنیٰ ذاتوں میں اور دوسری اقوام کو ملیچھ ہی سمجھتے تھے۔ عرب بھی دوسری اقوام پر اپنی برتری کے قائل تھے اور انھیں عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ سارے عالم میں غلاموں کی حالت بڑی ابتر تھی۔ اب اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم کو ملاحظہ فرمائیے جو انقلابی نوعیت کی تھی۔

ارشاد ہے کہ خدائے واحد نے انسان کو نفس واحد سے پیدا کیا ہے۔ خلقکم من نفس واحدۃ

محمود حسین

شبیر علی کاظمی

عالمِ باعمل

ڈاکٹر محمود حسین خان کے ساتھ میری تیس سال پرانی یاد اللہ گذشتہ ماہ ان کی رحلت پر ختم ہو گئی۔ ان کی جدائی سے میری گرانباری غم میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ان کی تسلیوں سے مجھے اپنے بارِ الم میں کچھ کمی محسوس ہونے لگتی تھی۔ میں ان کا ہمسر و ہم رتبہ بھی نہ تھا اور بے تکلف شرکائے کار یا احباب میں بھی میرا شمار نہ ہوتا تھا پھر بھی گفتگو ہمیشہ بامقصد اور بے حجابانہ ہوتی تھی۔ وہ میرا لحاظ کرتے تھے اور میں ان کا احترام۔ یہ لحاظ و احترام دونوں ان کی شرافت کی پیداوار تھے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

نجی زندگی کے تفکرات و آلام تو لازمۂ حیات ہیں لیکن اس کے باوجود مرحوم کی زندگی قابلِ رشک حد تک کامیاب رہی۔ ان کے کارنامے تکریم کے مستحق ہوئے اور مجھے یقین ہے کہ تعلیمی دنیا میں ان کی اصابت رائے اور دور اندیشی کے تمام پہلو رفتارِ زمانہ کیساتھ مزید اُجاگر ہوں گے۔ اور یہی ان کی حیاتِ جاوید کی بشارت ہوگی۔ زندگی بھر دنیوی مصائب ان کے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ عہدے پیرایہ بدل بدل کر انہیں گھیرتے رہے لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ پاکستان کے مشرق و مغرب میں جہاں کہیں بھی رہے انہوں نے اپنے اصولوں کو مصلحت پر بھینٹ نہیں چڑھایا۔ انتظامی دشواریاں ہر عہدے کیساتھ ہوتی ہیں اور ایسے حالات میں فرائض سے عہدہ برآ ہونا شخصیت اور کردار کا امتحان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کی تکمیل کی خاطر شخصیت کو جھکانا اور کردار کو داغدار بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر محمود حسین خان پر یہ مثال صادق نہیں آسکتی۔ وہ نہایت وسیع معنوں میں ایمان دار شخص تھے انہیں عہدے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا آتا تھا

وہ مرتبے سے محجوب ہونا نہیں جانتے تھے ان کے باطن میں علم کی جو دیوی پوشیدہ تھی وہ ہمیشہ ملیا پر آوازے کستی رہی۔ یہ جرأت قول و عمل دراصل ان کی سرشت بے نیازی اور مطالعہ وافر کا نتیجہ تھی۔ علم مشاہدے کی چیز نہیں، اس کی کسوٹی عمل ہے۔ مرحوم عالم با عمل تھے۔

مرحوم سے میری ملاقات جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی تھی۔ میں عزیزالرحمان ہاشمی کی ہمراہی میں ذاکر حسین صاحب سے ملنے گیا تھا۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ کون کون بزرگ اس وقت ذاکر صاحب کی نشست گاہ میں براجمان تھے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ پروفیسر حبیب بھی وہاں موجود تھے۔ محفل گرم تھی۔ وقتی سیاست موضوع بحث تھی۔ محمود حسین خاں بھی شریک گفتگو تھے۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوا کہ وہ نظریۂ پاکستان کے حامی ہیں۔ اسی محفل میں پروفیسر حبیب نے یہ الفاظ کہے تھے "جب پوری قوم پاکستان کے مطالبے پر تلی ہوئی ہے تو اس کو مان لینا چاہیے میری تقدیر بھی قوم سے وابستہ ہے البتہ راہ عمل مختلف ہو سکتی ہے۔" یہ خیالات میرے دل پر آج تک نقش ہیں۔ گفتگو بالکل نجی تھی مگر قوم پرست مسلم مفکرین کے ما فی الضمیر کی ایک اہم جھلک یہاں ضرور دیکھی گئی۔ ملاقات اور ضروری گفت و شنید کے بعد ہم باہر نکلے تو محمود صاحب دور تک ہمارے ساتھ آئے اور حبیب صاحب کے الفاظ پر تبصرہ ہوتا رہا۔ محمود صاحب اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھے۔ ہاشمی صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرار تھے اور کوئی تحقیقی کام بھی کر رہے تھے اور میں ملٹری اکیڈمی پونا سے رخصت پر آیا ہوا تھا۔

وقت گذرتا گیا پاکستان بن گیا۔ ۱۹۵۰ء میں عترت حسین زبیری مرحوم نے راجشاہی یونیورسٹی کی اسکیم تیار کی۔ پورے صوبے میں نئی یونیورسٹی کے قیام اور مقام کے متعلق خیال آرائیاں شروع ہو گئیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے بشمول ڈاکٹر سجاد اس اسکیم کی مخالفت کی۔ حالانکہ یہی حضرات بعد کو راجشاہی یونیورسٹی کے کرتا دھرتا ہوئے۔ زبیری صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر تھے انہوں نے وہاں راج شاہی یونیورسٹی کے متعلق ایک میٹنگ بلائی تھی۔ میں راجشاہی سے بحیثیت نائب معتمد یونیورسٹی کمیٹی ڈھاکہ گیا تھا اور شعبۂ انگریزی میں بیٹھا دوسرے احباب کے ساتھ مصروف گفتگو تھا کہ محمود حسین خاں صاحب مسکراتے ہوئے داخل ہوئے مرحوم

اس وقت مرکزی حکومت سے وابستہ تھے اور شاید تعلیمی پالیسی تیار کر رہے تھے۔ نئی یونیورسٹی سے متعلق مصروف گفتگو ہوئے اور انہوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کی موافقت کی۔ مخالفین کی تنگ نظری پر افسوس کیا۔ باتیں زیادہ وضاحت سے نہیں ہوئیں اور وہ حضرت مرحوم کو اسکیم کی کامیابی کی دعائیں دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اس ملاقات سے مجھے یہ تاثر ملا کہ مرحوم میں معلمانہ صفات نمایاں تھیں۔ وہ تعلیمی معاملات کو ذاتی منفعت سے ہٹ کر دیکھتے تھے اور ہمیشہ نڈر ہو کر خدا لگتی بات کہتے تھے۔

محمود حسین خاں مرحوم جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو وہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔ مارشل لاء کا خوف طلبہ کے دلوں سے نکل چکا تھا۔ اساتذہ کی گروہ بندی اور صوبائی عصبیت عروج پر تھی۔ تمام تعلیمی ادارے خلفشار کو ہوا دے رہے تھے۔ کہیں حکومت کے خلاف نعرے لگتے تھے اور کہیں صدر مملکت کو سیاہ جھنڈیاں دکھائی جاتی تھیں۔ ڈھاکہ اور راجشاہی میں طلبہ کی تعداد صوبے میں سب سے زیادہ تھی۔ یہاں کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ ان ہنگاموں سے خاصی پریشان تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں دو چار واقعات بڑے ناخوشگوار رونما ہو چکے تھے۔

یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے مرحوم کی اصول پرستی عیاں ہوتی ہے —— یونیورسٹی کے طلبہ اپنے کچھ مطالبات پر مصر تھے اور مرحوم کو اُن مطالبات سے اتفاق نہ تھا۔ ایک شام لڑکوں نے انہیں گھیر لیا اور کہا ہم آپ کو اس وقت تک نہ جانے دیں گے جب تک آپ ہمارا مطالبہ نہ مان لیں۔ مرحوم طلبہ کے حلقے میں برضا و رغبت کھڑے ہوگئے۔ کافی وقت گذر گیا اور بالآخر طلبہ اکتا گئے اور چلے گئے۔ مرحوم اپنے مکان میں داخل ہوگئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے چہرے سے کسی پریشانی یا اضمحلال کے آثار نمایاں نہ تھے بلکہ ان کی اصول پرستی کی یک گونہ کامیابی نے انہیں بشاش بنا دیا تھا۔ یہ تھی ایک اُستاد کی شان۔ جو اپنی عزت آپ کراتی ہے البتہ یہ جبھی ممکن ہے کہ جنون و تشدد کا انتہائی رجحان نہ ہو۔ استاد اور شاگرد کے جوہر افہام و تفہیم میں کھلتے ہیں۔

مرحوم مشرقی پاکستان میں ایک مقبول استاد اور محترم شخصیت بن کر رہے۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات

پر وہ خون کے آنسو روتے تھے اور تعلیمی پراگندگی کو اس تباہی کا موجب ٹھہراتے تھے۔ مجھے ان کی کسی بات سے اتفاق نہ ہوتا تو برملا اس کا اظہار کر دیتا۔ لیکن وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔

مرحوم جس زمانے میں ڈھاکہ میں وائس چانسلر تھے کسی کام سے راجشاہی آئے تھے۔ کالج کی لائبریری دیکھنے چلے آئے لائبریری میں کتابوں کی حالت دیکھ کر فرمایا "میاں! تمہاری کتابیں تو گرد و غبار میں دفن ہیں" کارکنوں نے مجبوریاں بیان کیں لیکن انہوں نے ایک سستی اور پورے عملے کو تساہل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے وہ اُردو سیکشن میں پہنچے جہاں انہیں اُردو میں سائنس پر قدیم کتابوں کا سیٹ نظر آیا۔ کتابوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ ان کتابوں سے بہت مفید کام نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر افضال قادری اور میجر آفتاب حسن جب راجشاہی پہنچے اور انہوں نے ان کتابوں کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ ان کی نشاندہی محمود حسین خاں صاحب نے کی تھی۔ اس معمولی سے واقعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرحوم ترویجِ علم اور اشاعتِ زبان کے سلسلے میں معمولی سے معمولی بات کو بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

میں ۱۹۷۱ء سے کراچی میں مقیم ہوں۔ مرحوم سے اکثر بات چیت رہی۔ ہمیشہ مجھے تسلی دیتے اور بعض کام کرنے کے مشورے بھی دیتے۔ میں نے فنِ تعلیم سے متعلق ایک کتاب تالیف کی جس پر مرحوم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب نیشنل بک کونسل کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مسودے میں مرحوم نے اپنے قلم سے حذف و اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا نام بھی انہی کا تجویز کردہ ہے۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات نیشنل میوزیم میں ہوئی جہاں انجمن ترقیٔ اُردو کے مخطوطات کی تقریب نمائش تھی۔ دورانِ گفتگو فرصت نہ ملنے کی شکایت کرتے رہے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ کام سے دبے جا رہے ہیں۔ آخر کار اسی بارِ امانت کے نیچے شہید ہو گئے۔

خدا نے انہیں علم و شرافت سے نوازا تھا۔ انہوں نے اس نعمت کا شکرانہ اپنے عمل سے ادا کیا۔ علم کا مان رکھا۔ عالم اور متعلم کی ہمیشہ عزت کی۔ فروغِ تعلیم کو جزوِ ایمان سمجھا اور اسی کوشش میں اپنے خالق سے جا ملے۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے حتیٰ کہ درسِ شہادت بھی۔

ضیاء الحسن موسوی

شیشے کے گھر سے مٹی کے گھر تک

"عالم کی موت عالم کی موت ہے"۔ جامعہ ملیہ اور جامعہ کراچی کے ہر گوشے سے ہر استاد اور ہر علم طلب طالب علم کے دل سے یہی آواز آرہی ہے۔ وہ آفتابِ دانش تھے اس لئے ہر ذرّہ ان کو اپنا سمجھتا تھا۔ وہ مثالی استاد تھے اس لئے ہر دانش جوان کو اپنا سمجھتا تھا۔ وہ بااخلاق تھے اس لئے ہر جاننے والا ان کو اپنا سمجھتا تھا۔

یوں تو موتمر عالم اسلامی۔ احتفال علمائے اسلام۔ موتمر نوجوانانِ عالم اسلامی اور پنجاب یونیورسٹی اسلامک کلوکیم بہت سے علمی اور اسلامی اجتماعات میں میں نے ان کو قریب سے دیکھا۔ ان کے افکار سے استفادہ کیا مگر جب ۱۹۵۶ء میں وہ فریضۂ حج کی ادائی کے لئے جدّہ پہنچے اور نابغۂ عصر مولانا عبدالعزیز میمنی کے ساتھ میرے مہمان ہوئے تو مجھ پر ان کی روزمرہ زندگی کے عجیب راز منکشف ہوئے۔ مختصر ملاقات اور اجتماعات میں عظیم نظر آنا اور بات ہے۔ کم علموں میں علم کا رعب پیدا کرنا بالکل مختلف چیز ہے مگر گھر میں ہر وقت ساتھ رہ کے سیرت کی عظمت کے نقوش قائم کرنا بالکل دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین کا فقط ایک چہرہ تھا۔ خلوت و جلوت میں وہ یکساں تھے اور بالکل غیر مصنوعی اور اصلی انسان تھے۔ میں ان کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین مصنف روحِ اقبال کا شاگرد رہ چکا ہوں اور کلامِ اقبال اُن سے پڑھا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے جو سب سے بڑے بھائی تھے تھوڑی سی نیازمندی تھی۔ انھوں نے جب وہ علی گڑھ میڈیکل کالج کا ایک وفد لے کر سعودی عرب گئے تھے فقط میری ہی ایک غیر سرکاری دعوت قبول کی تھی اور جب ہر بڑا آدمی اُن کے ساتھ تصویریں کھچوا رہا تھا تو انھوں نے خود مجھے آواز دے کر اپنے ساتھ تصویر کھنچوانے کا شرف عطا کیا تھا۔ اُن کی عظمت تو رشید احمد صدیقی ہی خوب جانتے تھے اور ان کو مرشد گردانتے تھے مگر ڈاکٹر محمود حسین کی عظمت سے کچھ میں بھی آگاہ ہوں۔ جب سعودی حکومت کو اطلاع ہوئی کہ عبدالعزیز میمنی جیسا عظیم عالم اور ڈاکٹر محمود جیسا بلند استاد حج کے لئے آیا ہے تو وزارتِ خارجہ نے ان کو سرکاری مہمان بنانے کی پیشکش

کی گراں دونوں نے مجھ طالب علم کے غریب خانے کو چھوڑ کے شاہی مہمان خانے میں جانے سے انکار کر دیا۔ اور بڑے اصرار کے بعد فقط سرکاری کار یں قبول کر لیں۔ ان کی بدولت مشرق وسطیٰ کے مایۂ ناز اہل علم خیر الدین زرکلی جنہوں نے دس جلدوں میں الاعلام کے نام سے مشاہیر مصنفین اسلام کا تذکرہ لکھا ہے شیخ محمد نسیف مرحوم جن کا کتب خانہ عالم اسلام کے عظیم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور شیخ سرور صبان مرحوم سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی رات کو دو دو بجے تک میرے گھر پر رہتے اور ان دونوں سے تاریخ و ادب و لغت اور کتب خانوں کی وہ باتیں کرتے جن سے اندھیری راتیں جگمگا اٹھتیں۔

ایام حج میں منیٰ پہنچتے ہی ڈاکٹر محمود حسین پاکستانی سفارت خانے کی عمارت سے یکایک غائب ہو گئے۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی بڑی تلاش کے بعد دیکھا کہ ایک خیمے کے سامنے چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کیا آپ راستہ بھول گئے؟ بولے کہ نہیں صحیح راستے پر آگیا ہوں۔ یہ اسی معلم کا کیمپ ہے جس کا نام میں لکھوا چکا تھا میں حج کرنے آیا ہوں اور عام مسلمانوں کے ساتھ یہ دن گزارنا چاہتا ہوں چند دن کے بعد پھر تمہارے پاس آجاؤں گا میں نے کہا خواجہ شہاب الدین سفیر پاکستان بھی متردد ہیں انھوں نے کہا ہے کہ اپنے مہمان کو تلاش کر کے لاؤ!

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ لوگ حج کے ساتھ پاکستان کی سفارت کی ذمہ داریاں بھی پوری کر رہے ہیں حج تو وہ عبادت ہے کہ بادشاہ سے لے کر ٹریفک کا سپاہی اور حمال بھی اپنے فرائض کے ساتھ اس کو انجام دیتا ہے مگر میں۔ میں تو چھٹی لے کر فقط حج کرنے آیا ہوں اور گمنام رہ کے یہ دن گزاروں گا اور دیکھوں گا کہ چند ہی دن کے لئے سہی غربار کے ساتھ کیسی گذرتی ہے؛ پھر انھوں نے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

عیش منزل ہے غریبانِ محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم

اور یہ تاکید کی کہ میں کسی کو ان کا پتہ نہ بتلاؤں؛ میں تھوڑی دیر چٹائی پر ان کے پاس بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ جس انسان نے تیرے غریب خانہ کو چھوڑ کے شاہی مہمان خانے جانا پسند نہ کیا اس کو یہاں سے کونسی طاقت ساتھ لے جا سکتی ہے۔۔۔

حج کے بعد ان کی زندہ دلی میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہونے کے ساتھ بڑے زندہ دل تھے۔ دستور کے مطابق سعودی عرب پہنچتے ہی حاجی کا پاسپورٹ اس کا معلّم اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور واپسی کے وقت دیتا ہے جب ان کو میں ایرپورٹ سے اپنے گھر لایا اس شام کو معلم سے ان کا اور میمنی صاحب کا پاسپورٹ بھی لے آیا تھا۔ حج کے بعد جدّہ واپس ہو کر میمنی صاحب کو اپنا پاسپورٹ یاد آیا ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔ "آپ کیوں گھبراتے ہیں واپسی سے قبل آپ کو مل جائے گا" اس کے بعد روز ڈاکٹر صاحب صبح شام پاسپورٹ کا ذکر کرتے اور اس کے گم ہونے کی شکل میں جو مشکلات پیش آسکتی تھیں ان کو بیان کرتے اور میمنی صاحب کو اختلاج شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب ان کا ساتھ بھی دیتے اور خوب ہنستے بھی۔ میں کہتا اگر خدانخواستہ آپ کا پاسپورٹ گم بھی ہو گیا تو نیا بن جائے گا! یہ سن کے اگر میمنی صاحب خاموش ہو جاتے تو ڈاکٹر صاحب فرماتے :۔ جناب اس پاسپورٹ پر میمنی صاحب نے سارے عالم اسلام کا سفر کیا ہے اور وہ ایک تاریخی دستاویز ہے موسوی صاحب آپ کسی طرح ڈھونڈھ کے لائیں ورنہ مولانا کو بڑا صدمہ ہوگا .... اور میمنی صاحب کو پھر اختلاج شروع ہو جاتا۔

اسی زمانۂ قیام میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب اور میاں نسیم حسین مرحوم سفیر پاکستان برائے لبنان کے درمیان میرے ہی گھر میں سمدھی بننے کا خوش گوار تصفیہ ہوا پاکستانی مٹھائی کہاں ملتی ایک شاہی ریستوراں سے میٹھے سموسے خرید کے ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کا منہ میٹھا کیا۔ ڈاکٹر صاحب جدّہ سے روانہ ہونے کے لئے میرے گھر کی سیڑھیاں اترنے لگے تو میں نے ایک تصویر لی جو اب تک میری متاعِ عزیز ہے! —— جب ۱۲ر اپریل ۱۹۷۵ء کی سہ پہر کو لوگ ڈاکٹر محمود حسین کو جامعہ ملّیہ ملیر میں ان کی آخری آرامگاہ کی طرف لے چلے تو بے اختیار مجھے وہ دن یاد آگیا جب وہ خدا کے گھر کا حج کر کے اپنے گھر واپس ہو رہے تھے اور میں نے ان سے گلے مل کے ان کو خدا حافظ کہا تھا۔ آج وہ اس دُنیا سے اپنے خدا کی بارگاہ میں جا رہے تھے... میں نے بے اختیار خدا حافظ کہا اور واپس ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی آخری تقریر دسمبر ۷۴، ۱۹ء میں تھیوسوفیکل ہال میں سُنی تھی یوم انیس میں وہ "انیس بحیثیت معلّمِ اخلاق" کے موضوع پر بولے تھے وہ تاریخ اور بین الاقوامی سیاست

کے ماہر تھے اور جب تک کسی موضوع پر وسیع مطالعہ نہ ہوتا کبھی اس پر لب کشائی نہیں کرتے تھے ظاہر ہے کہ تاریخ و فلسفۂ پاکستان اور ارتقائے فکر اسلامی کے سلسلہ میں انھوں نے علامہ اقبال کے افکار و اشعار کا سیر حاصل مطالعہ کیا تھا اور اقبال کے اشعار اکثر پڑھتے تھے مگر مجھے اُس دن یہ اندازہ ہوا کہ انھوں نے میر انیس کے کلام کا ایک نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے اور یہ زاویہ ایک اُستاد ایک معلم اور ایک ایسا عالم ہی تلاش کر سکتا ہے جو شب و روز قوم سازی اور تعمیر ملی کے لئے شمع کی طرح جلتا ہو اور زندگی کے واضح مقاصد متعین کر چکا ہو۔

وہ اُستاد تھے ان کو انتظامی مسائل میں اُلجھانا ان کے ساتھ زیادتی تھی۔ آجکل نوجوان نسل کی حالت آتش فشاں کی سی ہے ظاہر ہے کہ اس کو وہ اپنی محبت اور عظمت سے قابو میں رکھتے تھے اور طالب علم اُن سے والہانہ محبت کرتے تھے لیکن ان کا اپنا دل پسند مشغلہ یہ تھا کہ وہ فقط اُستاد رہیں۔ اور انتظامی مسائل میں ان کا وقت ضائع نہ ہو۔ اُستاد فقط ایک سیدھی ڈگر پر چلتا ہے اور بچّوں کی طرح بھولا ہوتا ہے وہ خود بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ امریکہ گئے جہاں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب پاکستانی ثقافت پر درس دینے گئے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر قریشی کے ساتھ ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے گئے اور دو دروازوں والی ایک شیورلیٹ پسند کر کے خرید لی اور پاکستان پہنچانے کی فرمائش کر کے روانہ ہو گئے جب کار کراچی پہنچی اور وہ اس کو گھر لائے تو دیکھا کہ پچھلی سیٹ ندارد تھی۔ جہاز کمپنی سے استفسار کیا اُس نے امریکہ میں بیچنے والوں سے پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا جناب یہ بات تو اس کے اگلے شیشے پر لکھی ہوئی تھی کہ اس میں پچھلی سیٹ کم ہے! ڈاکٹر قریشی نے ڈاکٹر محمود حسین کو خط لکھا کہ "بھائی جب دو پروفیسر کار خریدنے نکلیں گے تو یہی حشر ہوگا۔ کاش ہم کسی طالب علم کو ساتھ لے لیتے!۔ یہ لطیفہ بیان کر کے ان کا ہنسنا کبھی نہ بھولے گا۔ دوسروں پر تو سب ہنستے ہیں بڑا آدمی وہی ہے جو خود اپنے آپ پر ہنسنے کی ہمت رکھتا ہو۔ اور ڈاکٹر محمود حسین ہر طرح بڑے آدمی تھے!،

پروفیسر حسنین کاظمی

ڈاکٹر محمود حسین خاں

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

جناب آلِ رضا کا ایک مقطع ہے۔ ؎

انسانوں کا عجائب خانہ ہے تو رضاؔ دلچسپ مقام
جس کو دیکھو، جس سے بولو سمجھے کم سمجھائے بہت

غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں ہماری موجودہ معاشرتی زندگی کی ایک بڑی کمزوری کی جانب بہت لطیف اور بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب اجتماعی زندگی میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ ہو جائیں تو اسی نسبت سے باتیں زیادہ اور کام کم ہوتے ہیں۔ زندگیوں میں دکھاوا بڑھ جاتا ہے، صداقت کم ہو جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں جو لوگ ظاہر پسند اور ظاہر پرست ہوتے ہیں وہ وقتی طور پر اہمیت اختیار کر لیتے ہیں اور جو مصلحتِ وقت کو اپنے عمل کا معیار نہیں بناتے وہ نام و نمود سے زیادہ گوشۂ گمنامی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بقول احسانؔ دانش ؎

کم ظرف لئے پھرتے ہیں اعزاز کے پرچم
وہ لوگ ہیں چپ جنکے کھرے نام نسب ہیں

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "نمائش" کو "حقیقت" پر برتری حاصل ہو جاتی ہے اور صدق و صفا کے مقابلے میں کذب و افترا فتح پا لیتے ہیں۔ عزت، احترام، سربلندی اور نیک نامی قیمتاً بیچی تو جا سکتی ہیں، خریدی نہیں جا سکتیں۔ پروپیگنڈہ الگ شے ہے اور کردار کی عظمت الگ۔ پروپیگنڈے سے سستی شہرت تو مل سکتی ہے، کردار کا اعتبار نہیں مل سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ماحول ساتھ نہ دے تو کردار کی روش پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہی مشکل شخصیت میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے درمیان بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کی ذات میں ڈاکٹر محمود حسین کی شخصیت جیسا نکھار اور کشش نظر آئے۔

ڈاکٹر صاحب شرافت، مروّت، رواداری اور انسان دوستی کا پیکر تھے۔ انھیں دیکھ کر ان سے مل کر اور ان کی باتیں سُن کر زندگی کی اعلیٰ قدروں پر اعتماد کر لینا خسارے کا سودا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ان کے لہجے کی بے تکلفی اور اُن کے بھرپور قہقہوں کی بے ساختگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ زندگی اپنی گہرائیوں میں بناوٹ اور تصنع سے کتنی پاک ہے اور اس میں کس بلا کی جاذبیت ہے۔ ایک سہ پہر خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ چار پانچ دن اُمید و بیم میں کٹے اور پھر ڈاکٹر صاحب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ چار پانچ دن بظاہر موت و زیست کی کشمکش کے تھے لیکن ممکن ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ اس میں بھی ڈاکٹر صاحب کی شریف النفسی موت سے نبرد آزما رہی۔ ان چار پانچ دنوں میں وہ بھی جو ان کے اعزا تھے اور وہ بھی جو ان کے لئے اعزا کے جیسے تھے وہ سب ذہنی اور جذباتی طور پر اس بات کو سننے کے لئے تیار ہو گئے تھے جو ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جدائی کی خبر اگر ناگہانی انداز میں آتی تو غم شدید تر ہو جاتا۔ غم کے احساس سے بچا لینا تو ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا ہاں انھوں نے ہمیں غم کی شدت سے بچانے کی کوشش ضرور کی۔

ڈاکٹر صاحب قیام پاکستان کے وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ جب وہ رخصت ہوئے تو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ درمیان کے ۲۷، ۲۸ برسوں میں ڈاکٹر صاحب نے معاشرتی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ پھر وہ وزیر مملکت بنے، پھر نائب وزیر اور پھر مکمل مرکزی وزیر۔ انھیں اور بھی بہت سے علمی اور معاشرتی اور سیاسی اعزاز ملے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی ذات کو سامنے رکھیئے تو بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا شخصی وقار اور احترام اپنی سطح پر برقرار رہا۔ سیاسی اقتدار حاصل ہو جانے سے اس میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس سے محرومی اس میں کوئی کمی پیدا نہیں کر سکی۔ ڈاکٹر صاحب اُن گنے چُنے لوگوں میں سے تھے جن کی وفات عہدوں اور اقتدار کے منصوبوں میں عزت و احترام کا رنگ بھر دیتی ہے۔ ایسے لوگ اب کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

کچھ دن گزرے کہ ڈاکٹر صاحب ٹیلیویژن کے ایک پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ اس پروگرام میں گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب نے بڑی سادگی اور سچائی سے

ایک بات کہی تھی۔ شاگرد اور اُستاد کے رشتے کو عموماً باپ اور بیٹے جیسا رشتہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس رشتے میں کچھ اور گہرائی، سچائی اور تقدس پیدا کر دیا جب یہ کہا کہ اُستاد اور شاگرد کے درمیان رشتہ ماں اور بیٹے جیسا ہوتا ہے۔ ماں کی زبان سے اولاد کے لئے ہمیشہ دعا نکلتی ہے اولاد لاکھ بُری ہو جائے لیکن ماں کا دل اولاد کے لئے ہمیشہ آرزوؤں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کا رشتۂ امید کبھی نہیں ٹوٹتا۔ بُرے سے بُرے بچّے کے لئے ماں کے دل میں یہ توقع قائم رہتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے پس منظر میں یہ الفاظ ان کے سچے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ بات دل سے نکل رہی تھی لہٰذا دل پر اثر کر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی درس تدریس کے لئے وقف رہی۔ وہ سیاسی منصب پر فائز رہنے کے لئے وقف رہی۔ وہ سیاسی منصب پر فائز رہنے کے ساتھ ساتھ بھی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہاں انھوں نے یہ درس دیا کہ اختیار اور اقتدار انسانی صفات اور آدمیت کے لئے کس طرح ایک مرحلہ آزمائش بن جاتا ہے اور انسان کو اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کس طرح ایسے مراحل سے کامیاب گزرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب طلباء سے اور طلباء ڈاکٹر صاحب سے ان کی زندگی کے کسی حصے کسی دور میں جدا ہونا تو الگ بات ہے دور بھی نہیں ہوئے انھیں اپنے طلباء سے اپنی قوم کی نئی نسل سے محبت تھی اور اسی جذبۂ محبت کا اثر تھا کہ طلباء بھی ان کے لئے اپنے دلوں میں محبت و عقیدت کے سچے جذبات رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جولائی ۱۹۷۴ء میں جب یہ اعلان ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا منظور کر لیا ہے تو اس کی سب سے زیادہ خوشی طلباء کو ہی ہوئی تھی۔ اس سال کی ابتدا میں اپنی صحت سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے جب اس عہدے سے رخصت چاہی تو طلبا کے جذبات ہی ان کے لئے سدِ راہ بن گئے۔ پانچ سال قبل محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات کے موقع پر ڈاکٹر صاحب عارضۂ قلب میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انھیں آرام کی بھی ضرورت تھی۔ وہ آرام کے حقدار بھی۔ جب کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کی محبت آمیز ضد سے مجبور ہو کر اپنی رخصت کی درخواست واپس لے لی ہے۔ تو خیال پیدا ہوا کہ کیا ڈاکٹر صاحب اپنی اس قلبی کیفیت کے ساتھ اس فضا کو جو

ہمارے تعلیمی اداروں کی امتیازی صفت بنتی جارہی ہے برداشت کرسکیں گے۔ بات مشکل نظر آئی
خود ڈاکٹر صاحب کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ آرام کرنے کا اپنا حق استعمال کرتے اور رخصت
پر چلے جاتے یا طلبار کی خواہشات کے احترام میں جان بوجھ کر اپنی زندگی مستقل خطرے کی زد پر رہنے
دیتے۔ انھوں نے طلبار کے جذبات کے احترام کو ترجیح دی۔ اپنی زندگی کے بارے میں ان کے جو اندیشے
تھے وہ چار ماہ کے اندر ہی درست ثابت ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مندوں اور طلباء کی یہ واقعی محبت کا اظہار تھا جب وہ کہتے تھے کراچی
یونیورسٹی کے لئے ڈاکٹر صاحب کی موجودگی بڑی ضروری ہے کسی بھی شخص کے لئے یہ بڑا اعزاز ہے
کہ اس کی ذات کو کسی ادارے کے لئے ضروری قرار دیا جائے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ
شخصیتیں اداروں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن قوموں کی زندگی کی ایک پہچان
یہ بھی ہے کہ ان کے ادارے شخصیتوں کے محتاج نہیں رہتے۔ کوئی ملک یا کوئی قوم اگر کسی ایک شخص
کی وجہ سے زندہ ہے تو یہ بڑے اندیشے کی بات ہے۔

زندگی اور موت تو خالق حیات و کائنات کے اختیار میں ہے لیکن انسانی اعمال اور فیصلے اس
پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ میر نے کسی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا بلکہ بڑی سچی اور کھری بات کہی
تھی کہ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

اللہ کی انسانوں پر یہ بہت بڑی رحمت ہے کہ ان کے درمیان اچھے لوگ پیدا ہوتے رہتے
ہیں۔ ایسے اچھے لوگ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر جدا ہوں۔ ان کی جدائی قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ ایسے
لوگ اللہ کی نعمت ہوتے ہیں نعمتیں بچانے کے لئے ہوتی ہیں۔ ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتیں ہم
نے اجتماعی حیثیت سے زندگی کی جو روش اٹھارہ بیس برس سے اختیار کر رکھی ہے اس میں سب کچھ
ضائع زیادہ ہو رہا ہے، تعمیری نتائج کم نکل رہے ہیں۔ زندگیاں، صلاحیتیں، توانائیاں، تجربات،
علم، اس میں سے بہت کچھ ضائع ہوا ہے۔ اس پورے دور میں تخریب زیادہ ہوئی ہے تعمیر کم۔ ڈاکٹر
صاحب تعمیر کی علامت تھے۔ ان کی حفاظت قومی ذمہ داری تھی، قوم کی ذمہ داری تھی۔ نہ جانے
کتنا عرصہ گزر گیا۔ ہم بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی خاطر بہت بڑے بڑے نقصانات سے گریز نہیں

کرتے۔ ذرا ذرا سے انفرادی اور پیش پا افتادہ مفادات کے لئے ہم بڑے بڑے قومی نقصانات کا خطرہ مول لینے سے باز نہیں آتے۔ نہ جانے قومی فائدے کو اپنا فائدہ اور قومی نقصان کو ہم اپنا نقصان کیوں نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر صاحب کو تو تیسری اپریل ۱۹۷۵ء کی صبح دو بج کر چالیس منٹ پر اپنے خالق حقیقی کے حضور حاضر ہونا ہی تھا لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری سیماب مزاجی، کور نگاہی اور عاقبت نااندیشی بھی ڈاکٹر صاحب کی شمع زندگی کی لو کو تیزسے تیز تر کرنے میں مصروف عمل رہی ہو۔ اگر ہم فہم و فکر سے بالکل ہی عاری نہیں ہو گئے ہیں تو یہ اور ایسی ہی کئی اور باتیں ہمارے لئے غور طلب ضرور ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا سفرِ آخرت بھی ان کی زندگی کی طرح سادہ اور پُر اثر تھا۔ زر پرستی اور جاہ پسندی کے اس دور میں بھی ڈاکٹر صاحب کو شایانِ شان انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ چھوٹے اور بڑے، طلباء اور طالبات اپنے اور پرائے سب ہی موجود تھے۔ مشینوں کے اس دَور میں مروت کے احساسات بہت کچھ کچل گئے ہیں۔ بالکل فنا نہیں ہوئے۔ بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی جو وہاں موجود تھے اور اس سے بڑی تعداد ان لوگوں کی جو کسی باعث وہاں نہیں تھے، ان سب نے غمزدہ دل اور افسردہ نگاہوں سے ڈاکٹر صاحب کو زندگی کی اس آخری منزل تک پہنچایا جس کے بعد ابدالآباد تک کا سارا سفر ہر انسان تنہا طے کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہم سب کے لئے اور خاص طور سے نئی نسل کے لئے ایک سرمایہ چھوڑا ہے۔ نرم روی، نرم خوئی اور حُسنِ تکلم کا سرمایہ، شرافت کی روایت اور عزم و ارادے کی دیانت کا خزانہ۔ اگر ان کی زندگی میں ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ ان کی بڑائی کے اعتراف کا حق ادا نہیں ہوا تو اس کا مداوا اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ سرمایہ اور یہ خزانہ جو انھوں نے چھوڑا ہے اس میں سے اپنا بھرپور حصہ لے لیں اور یوں ڈاکٹر صاحب کے جو حقوق ہم ادا نہیں کر سکے اس کی تلافی اس طرح کریں کہ دوسرے انسانوں کے جو حقوق ہم پر ہیں ان کی ادائیگی کی کوشش کرتے رہیں۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

زندہ آدمی

ڈاکٹر محمود حسین خاں کو ہم سے بچھڑے ہوئے دو تین دن ہوئے تھے کہ احمد ہمدانی نے کہا "ریڈیو کے ادبی مجلّہ میں ڈاکٹر صاحب پر ایک مختصر سا مضمون اس ہفتے مناسب رہے گا۔ آپ لکھ دیجئے یا فرمان صاحب سے کہہ دیجئے۔" میں نے اقرار کر لیا کہ ہم دونوں میں سے کوئی مضمون پڑھ دے گا۔

اس رات جب میں مضمون لکھنے بیٹھا تو قلم نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور میں اپنے آپ کو بھی یہ بات نہ بتا سکا کہ کیا لکھوں؟ — فیض نے تو اپنے رقیب سے ایک بات کہی تھی، محمود حسین خاں کے رفیق ایک دوسرے سے کہہ سکتے ہیں۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ

اور محمود حسین خاں کا چہرہ آپ کے مطلعٔ ذہن پر ابھر کر اس مصرع کو عاشقانہ فضا سے نکال کر انسانی کردار اور ذات کی دنیا میں لے جائے گا۔ محمود حسین خاں کی پیشانی جیسے فکر، بلند طالعی اور ذہانت کی سجدہ گاہ تھی۔ اُن کے رخساروں کی تمتاہٹ عزت کا اشارہ تھی اور اُن کے ہونٹ سچائی کا نشیمن تھے۔

میں بات اُس رات کی بات کر رہا تھا۔ وہ رات بیت گئی اور میں مضمون نہ لکھ سکا۔ اس رات کی صبح میں اپنی بے خواب نگاہوں میں درد کی امانت لئے فرمان صاحب کے پاس پہنچا وہ لان پر ٹہل رہے تھے یا یوں کہئے کہ اپنی بے چینی اور اضطراب کو چہل قدمی کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بات مضمون کی فرمائش سے شروع ہوئی اور پھر گفتگو کے دائرے جانے والے کی یادوں اور شخصیت کے گرد پھیلنے لگے، اور جب میں اُن سے رخصت ہوا یا ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت

ہوئے تو ہم دونوں ہی رو رہے تھے۔ ہمارے غم نے ہماری سنجیدگی، موت کے بارے میں ہماری قلندر طرازی اور بحرِ حیات و مرگ کے اسرار سے شناسائی۔ سب ہی کچھ چھین لیا تھا۔ اسی لمحے مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ ابھی تو غمِ محمود حسین کا آغاز ہے۔ آنے والے ماہ و سال کے ساتھ اُن کی یاد اور بھی شدید اور غم اور بھی گہرا ہو جائیگا ۔۔۔ کیونکہ یہ قحط الرجال کی فصل ہے، جو شجر گرتا ہے۔ وہ اعلیٰ اقدارِ حیات، شرافت اور پاس داری وفا و وضع کی جنس کو نایاب تر کر جاتا ہے۔ اور بارہ سال کے بعد محمود حسین خاں کی موت نے غالب کے اس شعر کی تفسیر ایک بار پھر میرے سامنے پیش کر دی ۔۔۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے ۔۔۔ !

آج میں ڈاکٹر صاحب پر لکھنے بیٹھا ہوں۔ فضا بہت گرم ہے، حبس اور گھٹن سے سانس سینے میں رک رک کر آ رہی ہے ۔۔۔ یہ فضا اور ماحول ان کی یادوں کیلئے کتنا سازگار اور غیر سازگار ہے۔ یہ تضاد ایک وحدت ہے بالکل محمود حسین خاں کی شخصیت کی طرح ۔۔۔ وہ شخصیت جس نے شرق و غرب کو اپنی ذات میں سمو لیا تھا۔ ان کے علم میں مشرق کا گریۂ نیم شبی، مغرب کی نگاہِ تیز سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ ان کی فکر میں اقدارِ مشرق کا احترام تھا اور مغرب کے علمی افق سے آگے بڑھ جانے کی آرزو بھی۔

ڈاکٹر صاحب سے وابستہ ذاتی یادیں اور باتیں مجھ سے اپنا حق مانگ رہی ہیں مگر اس سے پہلے کچھ اور باتوں کی اہمیت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ انہیں پیش کر دوں۔ ذاتی یادیں پھر کبھی سہی ۔۔۔ !

محمود حسین خاں کے باب میں یہ بات مجھے بیحد نمایاں نظر آتی ہے کہ انھوں نے جس مشن یا کام کو اپنایا اسے وقعت عطا کر دی اور تحریک کے درجہ تک پہنچا دیا۔ وہ مروت میں اپنے نام کو استعمال کرنے کی اجازت کسی کو نہ دے سکتے۔ دوستی اور مروت کے ہنگام میں وہ برج کھیلتے لطیفے سناتے، قہقہے لگاتے، شعر و شاعری سے دل بہلاتے ۔۔۔ مگر وہ کسی کام کو کھیل یا وقت گزاری نہ سمجھتے۔ وہ مشکل ہی سے کسی کام پر تیار ہوتے، وہ بھی اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ

لے کر، اس کی اہمیت کا تخمینہ لگاکر — اور جب وہ تیار ہوجاتے تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ "کام" ایک مشن اور تحریک بن جاتا — آج کتب خانہ کی تحریک، ہمارے ملک کی ایک وقیع تحریک ہے۔ اسے عملی طور پر آگے بڑھانے میں حکیم محمد سعید، ڈاکٹر انیس خورشید اور ایسے ہی دوست احباب و حضرات کا بڑا حصہ ہے، مگر اسے تحریک بنانے والے ڈاکٹر محمود حسین خاں ہی تھے۔ جو کتب خانے کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور عالم گیر جامعہ سمجھتے تھے۔ ایسی جامعہ جس میں سقراط سے لے کر آج تک — سبھی استاد موجود ہیں — کتب خانہ اور علم کتاب داری پر ڈاکٹر صاحب کے مقالات و خطبات کتابی شکل میں شائع ہوگئے ہیں۔ یہ تحریک اب ایک تحریک ہے، اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں جلد سے جلد پیش کیا جائے۔

محمود حسین خاں کے باب میں دوسری نمایاں چیز ان کی تخلیق میں قدرت کی فیاضی ہے۔ وہ فیاضی جس کی بنا پر TOWERING PERSONALITY کا لقب انھیں زیب دیتا ہے۔ دل اُن کا ایسا آئینہ تھا جو گرد و کدورت سے سدا صاف رہا، ذہن ایسا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کا تجزیہ دیکھتے ہی دیکھتے کر لیتے اور خد و خال ایسے کہ پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں — ان کے ماتھے پر شرافت کا غرور اور ہونٹوں پر صداقت کا نور چمکتا تھا۔ ان کی جنبشیں اور ہاتھ اور چہرہ کی حرکات ان کی باتوں، روح اور ذات سے پیوستہ رہتیں۔ یوں لگتا کہ جیسے ان کے جنبش کرتے ہوئے ابرو اور آنکھوں کی مسکراہٹ کا ان کی گفتگو میں وہی حصہ ہے جو اچھے شعر کی تعمیر میں استعارہ اور تشبیہہ کا ہوتا ہے۔ میں نے ان کی ذات کے لئے TOWERING PERSONALITY کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اردو میں کئی کئی لفظ مل سکتے ہیں جیسے "دیو قامت شخصیت" — لیکن اسے آپ میرا لسانی عجز سمجھئے کہ مجھے انگریزی کی یہی ترکیب محمود حسین خاں کی شخصیت کا بوجھ اٹھاتی نظر آتی ہے۔

محمود حسین خاں کی ذات اور شخصیت کا ایک پہلو ان کی قیادت کی صلاحیت اور دوست داری کی یک جائی ہے۔ انھوں نے ان دونوں خوبیوں کو ملا کر ایک کر دیا تھا — اس سلسلہ میں شاید ہی کسی اور کو ان کا حریف قرار دیا جاسکے۔ قیادت کا دیو — دوستی کی سبز پری کو کس طرح نگل جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اور مطالعہ ہم ہر روز کرتے ہیں۔ دوستیاں قیادت کو

برقرار رکھنے کی خاطر دشمنی اور دشنام طرازی میں بدل جاتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا ذاتی رشتہ تعلق خاطر اور دوستی، اس حیات بے ثبات میں انسانی اقدار، محبت اور عظمت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل تھی۔ ہر سطح کے لوگ ان کے دوستوں اور شناساؤں میں شامل تھے، اور ڈاکٹر صاحب نے کبھی کسی کو ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ایک بار برطانوی یونیورسٹیوں کی اہم شخصیت کا ایک وفد جامعہ کراچی آیا۔ لوگ، اس وفد کے ارکان میں گم تھے۔ ہاں ایک صاحب ایک کونے میں کھڑے جیسے اپنی تنہائیوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ڈاکٹر صاحب بڑے بڑے قدم اٹھاتے ان صاحب تک پہنچے۔ پھر گردن کے خم کے ساتھ مزاج پرسی ــــ " کہئے آپ اچھے ہیں " اور پھر سلسلۂ گفتگو کے ساتھ ہی انھیں اپنے کرے کے مرکزی حصے تک لے گئے اور ہر اہم مہمان سے تعارف کرایا۔ یہ خصوصیت جیسے ہمارے دور میں محمود حسین خاں اور ممتاز حسن مرحوم کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

یہ مساوات، ہر سطح کے آدمی سے یکساں تعلق اور احترام آدمی، ان کی ذات و صفات کی پہچان تھی۔ میں نے بہت سے اچھے اور شریف آدمیوں کو بھی ہمیشہ موٹر کا دروازہ کھولنے کے لئے شوفر کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر محمود حسین خاں کو یہ بات گوارا نہ تھی۔ پھر ان کا فعال اضطراب اور عمل کے لئے بے چینی انھیں اس کا موقع ہی کب دیتی ان کی گاڑی یونیورسٹی کی عمارت انتظامیہ کے پورچ میں آکھڑی، شوفر کے اترنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ اور لیجئے دو چار " قدموں " میں لفٹ کے دروازے تک پہنچ گئے، مسکرا کر لفٹ مین کو سلام کیا یا اس کے سلام کا جواب دیا۔

بات سے بات نکلتی آرہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ احساس مساوات اتنا شدید اور قوی تھا کہ ان کا نواسا، جامعہ کے نرسری اسکول میں پڑھنے آتا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے بچے کو اسکول میں اتارتے اور پھر اپنے دفتر آتے۔ میری بہن حمیرا نے روتی آنکھوں کے ساتھ ایک واقعہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب کی موت سے چند دن پہلے کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی نرسری اسکول کے سامنے رکی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے نواسے کے ساتھ گاڑی سے اترے ــــ

میری بہن اپنی پانچ سالہ بچی سنبل کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جھکے۔ سنبل کے گالوں کو پیار سے تھپکی دی اور آگے بڑھ گئے۔ کسی لفظ کی ادائیگی کے بغیر محبت کا یہ اظہار انھیں کا شیوہ تھا۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُن میں مساوات کا احساس بہت شدید تھا۔ ان کا نواسا کسی مشہور اور معیاری مشنری اسکول کی نرسری میں بھی جا سکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس اسکول کو چنا جس میں جامعہ کے بہت سے اساتذہ کے بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

یہ مساوات عام آدمی سے محبت کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ انھیں اپنی اقدارِ حیات سے محبت تھی اور تعلیم گاہوں میں اسلامی معاشرہ کے خواہاں تھے اور ان کی یہی خواہش جامعہ کی صورت میں سنگ و خشت کے لباسِ سنگیں میں جلوہ گر ہوئی، جامعہ ملیر، جس کی خاک کو محمود حسین خاں کے جسم کی امانت ودیعت ہوئی، ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو ڈاکٹر صاحب کے حسین خوابوں میں سے ایک خواب کی جھلک ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کے تسلسل کا دستاویزی اور عملی ثبوت بھی ہے۔ ہم سرحد کے اس پار اپنے حسین اور زندہ جاوید نقوش چھوڑ آئے ہیں، قطب مینار تاج محل، جامع مسجد سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ دہلی تک۔ مگر وہ روح اور جذبۂ تعمیر تو ہمارے ساتھ ہی پاکستان آگیا ہے۔ جس نے ان نقوش کو جنم دیا تھا۔ یہ بات ہم سب ہی کرتے ہیں، مگر اسے سچ کر دکھایا محمود حسین خاں کے جذبۂ عمل نے۔

ڈاکٹر صاحب تقریباً ہر اتوار جامعہ ہی میں گزارتے۔ جامعہ کے استادوں کے علاوہ جامعہ اور جامعہ کی تعلیمی تحریک سے وابستہ لوگ اور ڈاکٹر صاحب کے دوست بھی وہاں جمع ہو جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے "ماحضر" تک، سب کچھ وہاں موجود ہوتا۔ یہ مجلسیں ایک طرف آرام کا وسیلہ تھیں اور دوسری طرف ایسی ہی صحبتوں میں نئے خیال اور تجویزیں سامنے آتیں اور عمل کے قالب میں ڈھل جاتیں۔

تجویزوں کے عمل کے قالب میں ڈھلنے سے خودبخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب دوسروں کا تعاون اور مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ ان کی شخصیت کی

موہنی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے عزم پختہ کا کارنامہ۔ جب ڈاکٹر صاحب اپنے کسی منصوبہ کا ذکر کرتے تو ان کے لہجے سے سننے والا یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے منصوبہ کو حاصل شدہ حقیقت سمجھ کر بات کر رہے ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی جماعتی حس کا اظہار بھی ہے۔ اس حس کے بغیر کوئی شخصیت مکمل اور متوازن نہیں ہو سکتی۔ مختلف شعبہ ہائے علم کے منتہی اسکالر اور عالم اسی جماعتی حس سے محروم ہونے کی وجہ سے دوسروں کے عمل کے دھاسے کو کسی متعین سمت میں نہیں موڑ پاتے۔ ڈاکٹر صاحب کو عمل کے دھارے کو کسی مقصد کی طرف موڑنا آتا تھا۔ صرف یہی ایک بات ان میں ہوتی تو بھی انھیں مدتوں یاد رکھنے اور یاد کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ یہ جماعتی حس شاید ان میں ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی عملی مثال اور اتباع سے پختہ تر ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ایک اور اعتبار سے بھی بڑے آدمی تھے۔ اس اعتبار سے ہمارے درمیان ان کی موجودگی ہی کافی تھی۔ آج کے ادبی اور غیر ادبی جلسوں میں پڑھے لکھے لوگ ایک دوسرے کے گریبان اور آبرو سے کس طرح کھیلتے ہیں۔ اس سے تو آپ باخبر ہیں۔ یونیورسٹی کی دنیا اس سے مختلف نہیں۔ اساتذہ اپنے جلسوں میں میزیں اور ڈیسکیں بھی بجاتے ہیں اور شور بھی مچاتے ہیں اور اپنے مخالفوں کی بات بھی نہیں سنتے۔ مچھلی بازار پھیلتے پھیلتے اور بڑھتے بڑھتے دانش گاہوں تک آگیا ہے۔ پہلے یہ صورتِ حال نہ تھی۔ استادوں میں ایسی شخصیتوں کی کمی نہ تھی جن کے رفیق ان کی شخصیت کے سامنے سپر ڈال دیتے۔ ڈاکٹر قریشی کی سبکدوشی اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کی موت کے بعد آج کراچی یونیورسٹی میں مجھے کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس کے سامنے لوگ اپنے اسالیب گفتگو میں ترمیم کریں۔ ٹھہر کر اور ذمہ داری کے ساتھ لب کشائی کریں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں کے علمی کارنامے ان کے علم اور فکر کا مکمل اظہار نہیں ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ مگر محدود معانی میں۔ محمود حسین خاں نے فن تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں گہرائی، نظر کی پختگی اور رچا ہوا تاریخی شعور ہے۔ مگر یہ درست ہے کہ وہ جو کچھ اور جتنا لکھ سکتے تھے۔ اتنا انھوں نے نہیں لکھا مگر یہ نیم صداقت ہے۔ گزشتہ سطور میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی روشنی میں اسے سمجھا جاسکتا ہے،

محمود حسین خاں صرف گوشہ نشین عالم نہیں تھے بلکہ وہ اس دنیا میں دوسروں کے عمل کے دھاروں کو موڑنے کے لئے بھی آگے رہتے ۔ وہ منشی ذکا اللہ کے معنوی وارث نہیں، بلکہ انھوں نے سرسید کی وراثت کو اپنایا تھا ۔ اپنے ماضی قریب کی کئی قدآور (TOWERING PERSONALITY کے لئے قدآور برا لفظ تو نہیں) شخصیتوں کے بارے میں یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے جو تحریری ورثہ چھوڑا ہے وہ ان کی شخصیت، علم اور فکر کی پوری نمائندگی نہیں کر سکتا ۔ مولانا سلیمان اشرف، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حسین احمد مدنی، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر ہادی حسن ۔ پروفیسر اے ۔ بی حلیم وغیرہ ۔ لیکن ان لوگوں نے ہماری قومی زندگی اور نوجوانوں کے ذہن پر جو نقوش مرتسم کئے ہیں ۔ ان سے انکار کرنا اپنے شعور کی توہین کے مترادف ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قومی تحریکوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور ان تحریکوں میں زندہ رہتے ہیں ۔

محمود حسین خاں مر کر بھی زندہ ہیں ۔ جامعہ کی صورت میں، جامعۂ کراچی کی صورت میں، کتب خانہ تحریک کی صورت میں اور یاد بن کر ہمارے ذہنوں میں ۔

> اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم کو زندہ قوموں میں نام لکھوانے کے لئے اپنے ادب کی پرورش کرنی چاہئے ۔ ہر زندہ قوم کا اپنا ادب ہوتا ہے ۔ یہ ادب اس قوم کی جدوجہد اور اس کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے فلسفۂ حیات اور اس کی اُمنگوں کی ترجمانی کرتا ہے ۔ دنیا ہماری تہذیب کو ہمارے ادب ہی کے ذریعہ پرکھ سکتی ہے اور ہمارے ادب ہی کے ذریعہ ہماری صحیح عظمت کا اندازہ لگا سکتی ہے ۔ دنیائے ادب میں پاکستان کے لئے ایک بلند مقام پیدا کرنا ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا اہم فریضہ ہے ۔
>
> محمود حسین

سید عبدالحمید

شرافت کے حضور

موت انسان کا مقدر ہے۔ موت کی فاتحانہ یلغار بڑے سے بڑے آدمی سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے فرد تک۔ سب کو ایک ان جانے ماضی سے اس مستقبل تک لے جاتی ہے جس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اقبال کے الفاظ ہیں ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
یہ ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

ڈاکٹر محمود حسین، جو ایک ممتاز مورخ تھے، اب خود تاریخ اور یادوں کے ایوان میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن جب ایسے کردار اور پائے کے افراد کی موت کی خبر ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو انہیں جانتے ہیں اور ان کے مرتبہ شناس ہوتے ہیں تو انہیں تامل اور فکر پر، اور رک کر اپنے اردگرد نظر ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور پھر ایک نیا احساس۔ دکھ اور درد کا احساس، ان کے سارے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے اور وہ اپنے چاروں طرف ایک خلا محسوس کرتے ہیں، اور ہچکیوں کے درمیان چلّا اٹھتے ہیں — "وہ ایک انسان تھا — وہ بھی چلا گیا" (۱)

جامعہ کراچی سے ڈاکٹر محمود حسین کی وابستگی فخر و مباہات کی بات تھی۔ ان کی ذات سے زیادہ جامعہ کے لیے، کیونکہ ان جیسی حیثیت اور مرتبہ کے لوگ اس سے بھی بلند مرتبوں کا حق رکھتے ہیں۔ کوئی کرسی بھی ان کی ذات سے بلند تر نہ تھی۔ لیکن جامعہ کی سربراہی زندگی میں ان کا آدرش

---

(۱) یہ وہی فریاد ہے "انسانم آرزوست۔" دیو جانس کلبی دن میں چراغ لیے ہوئے گھر سے نکلا۔ لوگوں نے تمسخر سے پوچھا "کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ کہنے لگا "انسان کی تلاش کر رہا ہوں۔"

تھی ۔ انہوں نے مثالی طور پر اپنے نصب العین کی خدمت کی ۔ اور اس آدرش کو آخری سانس تک اپنی بہترین صلاحیتوں سے موقر اور بلند تر کر دیا۔

وہ جامعۂ کراچی میں ایک ایسے دور میں آئے جب جامعہ کی مشکلات و مسائل کے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جامعہ کو ان مشکلات کے بھنور سے نکالنا انسانی اختیار سے باہر کی بات ہے جنہوں نے جامعہ سے اس کی علمی فضا اور ماحول کی درخشانی و تابناکی اور بھینی بھینی مہک بڑی حد تک چھین لی تھی ۔ مسئلہ یہ تھا کہ علم و دانش کے اس بڑے ادارہ کو کس طرح تعلیمی معیار، علمی ہم آہنگی تنظیم اور تعاون کی مطلوبہ بلندیوں تک پہنچایا جائے اور مالی بحران سے نجات دلائی جائے ۔" مقاصد کو حالات ہی نے ان کے سامنے نہیں رکھا بلکہ ان کو خود ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیے چن لیا۔ ان کی فطرت کی بلندی کا تقاضا تھا ۔ اور اسی نصب العین کے حصول کے راستے میں ڈاکٹر صاحب نے ان قوتوں کو للکارا جو فانی انسان پر ہمیشہ خندہ زن رہی ہیں ۔ وقت اور موت ۔ وہ ایک بیمار آدمی تھے ۔ بہت سے شریف النفس انسانوں کی طرح دل کے مریض ۔ اور پھر خون کے دباؤ اور ذیابیطس میں بھی مبتلا تھے ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے انہیں بیماریوں کے ساتھ جنگ نہ کی بلکہ انہوں نے ان کی طوفانوں کے رُخ کو بدل دیا جو گذشتہ ایک دو برسوں سے مختلف عنوانوں سے اس جامعہ کے وجود کو جیسے نابود کرنا یا اسے بدلنا چاہتے تھے ۔ ان کا کردار اور انسانی مرتبہ شخصیت اور ذاتی وجاہت ، دلکشی ، تجربہ اور علم ، اس جنگ میں ان کے وجود اور جامعہ کے وجود کے لیے جیسے سپر بن گئے ۔ ان کی یہی شخصی خصوصیات تھیں جن کے بغیر اس ادارہ کے پروگراموں اور منصوبہ بندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ، جس کے وہ سربراہ تھے ۔ ہر حلقہ میں ان کی عزت کی جاتی تھی۔ عوامی حلقوں میں بھی ، سرکاری حلقوں میں بھی ، کیونکہ انہیں سیاست ، جوڑ توڑ ، سازش ، غرور اور بیجا امنگوں سے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ یہ چیزیں ان کے خمیر میں شامل ہی نہ تھیں ۔

جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کی رفاقت یا سربراہی میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ان کے لیے وہ ایک راہبر اور مینارۂ نور تھے ۔ شفقت اور مہربانی ، انکساری اور لحاظ ، آدمیت شائستگی اور نفاستِ طبع ۔ ان کے کردار اور شخصیت کی وہ خصوصیات تھیں جن پر ہم رشک بھی کرتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے پسند بھی کرتے تھے ۔

شیخ الجامعہ کی حیثیت سے وہ کریم النفسی، عالی ظرفی اور بلند نظری کی علامت اور ایک شریف آدمی کی مکمل مثال تھے ۔ ہاں وہ لغت کے دو لفظوں کے مفہوم اور استعمال سے ناآشنا تھے ۔ اور وہ لفظ ہیں "کینہ" اور "انتقام" ۔ اکثر انہیں حقیر، کم مایہ اور ناقابل توجہ افراد اور مسائل سے واسطہ پڑتا تھا، لیکن وہ ان سے ایسی خوش اسلوبی اور نجابت سے عہدہ برآ ہوتے جو اُن کا اور صرف ان کا حصہ تھی ۔ کوئی آدمی کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکتا جب ڈاکٹر محمود حسین کے کسی عمل میں انتقام یا کینہ کی ادنیٰ سی جھلک اور شائبہ تک نظر آیا ہو ۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ اتنی چھوٹی باتوں سے ان کا علاقہ ہو ہی نہیں سکتا ۔

انکی شرافت طبع اور تہذیب نفس ان کے اعمال سے آشکار تھی اور ان کے اعمال اس حقیقت کا اظہار تھے کہ " ان کی ذات انسانیت کے باغ کا شجرِ ثمر آور تھی ۔ ایسا درخت جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی جھک جاتا ہے ۔" کئی سال پہلے کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا ۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کلیۂ فنون کے ڈین تھے ۔ میں نے انہیں ایک کلرک کے دفتر میں بیٹھے اس کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا ۔ ان کے احترام کے پیش نظر میں ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا " آپ کس کام کے لیے کلرک کا انتظار کر رہے ہیں ۔ اور کیا میں کوئی خدمت انجام دے سکتا ہوں ؟ ۔ ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے اپنی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا اور فرد متعلقہ کا انتظار کرتے رہے ۔ میں اپنے دفتر چلا گیا ۔ چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتا دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر محمود حسین میرے کمرے میں تھے ۔ میں ہکا بکا رہ گیا ۔ وہ دو چار منٹ میرے کمرے میں ٹھہرے، میری خیریت پوچھی، ایک دو باتیں ادر کیں اور چلے گئے ۔ اخلاق کے حقیقی اور عملی اظہار میں کوئی ان سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا ۔

پچھلے دنوں کی بات ہے کہ کراچی کے ایک اسپتال میں جامعہ کے ایک ڈرائیور کا آپریشن ہوا ۔ مجھے نہیں معلوم کہ یونیورسٹی کا کوئی آدمی اس بیمار ڈرائیور کو دیکھنے گیا تھا ۔ مگر اس کا وائس چانسلر ضرور گیا تھا ۔ اس کا " کی ضمیر جامعہ اور ڈرائیور دونوں کا بیک وقت احاطہ کرتی ہے ۔

اُن کی عادات و اطوار، شائستگی اور آدابِ زیست ان بہت سے " ضابطہ پرست " حاکموں اور نوکر شاہی کے نمائندوں کے لئے ایک مثالی سبق کی حیثیت رکھتے تھے جو ان کرسیوں پر

براجمان ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور ظرف سے کہیں اونچی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوپہر کو جب ڈاکٹر صاحب اپنے گھر جارہے تھے انہوں نے کیمپس کے ایک اسٹور کے قریب دفتر کے ایک اسسٹنٹ کو دیکھا جو اپنے راشن اور سودا سلف کے دو بھاری تھیلے مشکل سے اٹھائے اپنے گھر جارہا تھا۔ وائس چانسلر کی گاڑی رکی، انہوں نے اسسٹنٹ کو اپنے پاس بٹھایا اور پھر اسے اس کے گھر تک چھوڑنے گئے۔ یہ تھی ان کے کردار کی اور شخصیت کی ایک جھلک۔

خوشامد اور چاپلوسی بہت سے انسانوں کی زندگی کا ایک ایسا تسکین بخش تجربہ ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کبھی نہیں گذرے۔ کوئی تحسین آمیز کلمہ یا ممنونیت کا اظہار بھی جیسے انہیں مضطرب کردیتا، بلکہ وہ الجھ جاتے۔ غصّہ کے لمحات ان کی زندگی میں بہت کم آتے، اور اگر آتے بھی تو بہت مختصر ہوتے۔ ان کا غصّہ حسرت کے الفاظ میں "جمالِ سرگرانی" تھا جو ان کے ماتھے پر چمک اٹھتا تھا۔

ڈاکٹر محمود حسین کا احساسِ مزاح، ان کا علم اور دلچسپ واقعات ولطائف کی یادداشت، ... اور پھر بیان اُن کا۔ ان کے ملاقاتی مسرت اور قہقہوں کی دنیا میں سفر کرنے لگتے۔ انہیں خود بھی ان واقعات کے بیان میں لطف آتا۔ دراصل بات لطیفہ گوئی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس طرح وہ دکھ بھری اس دنیا میں مسرتوں کے پھول لٹاتے۔ ان کی ذات ایک ایسا جزیرہ تھی جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوں، اور نیلے آسمان پر خوشیوں کا سورج چمک رہا ہو۔ اور ہر طرف سایہ دار درخت ہوں جن کے نیچے لیٹ کر آپ سائے اور دھوپ کی آنکھ مچولی کا تماشا دیکھ سکیں۔

محمود حسین خاں برج کے رسیا تھے اور ان کے اس محبوب کھیل کی اصطلاحوں کو استعمال کرتے ہوئے میں آخر میں بس یہی کہوں گا کہ وہ صرف "Dia mand" نہیں تھے بلکہ "King of Hearts" تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین

لطائفِ محمود

سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر محمود حسین لطیفہ سنج بھی تھے اور لطیفہ گو بھی، ان کو درجنوں لطیفے یاد تھے اور موقعہ کی موزونیت کے لحاظ سے وہ کوئی نہ کوئی لطیفہ چھیڑ دیتے تھے لطیفہ سنانا بھی خاصی فنکاری چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ فن خوب آتا تھا۔ ایسے سلیقے سے سناتے تھے کہ ہنستے ہی بنتی تھی۔ آخر کو خود بھی زوردار قہقہہ لگاتے تھے۔ لطیفے کے خاص نکتے کو بار بار دہراتے تھے اور مخاطب کو کچھ اس طرح متوجہ کرتے تھے کہ کتنے ہی روکھی طبیعت و صورت کا آدمی کیوں نہ ہو قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ہم نے چاہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب صاحب کے سارے پسندیدہ لطیفے یکجا کر دیئے جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا تاہم میری گزارش پر ظہور الحق صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے تین اہم لطیفے مرتب کر دیئے ہیں تینوں لطیفے سنے سنائے نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کی تخلیق ہیں اور ڈاکٹر صاحب انھیں اپنی ذات کے حوالے ہی سے سنایا کرتے تھے۔ (ف - ف)

(۱)

اٹاوہ اسکول میں پڑھتا تھا ایک استاد تھے جن کو سب مولانا کہتے تھے شاعری کرتے تھے اور ہم جیسے دو تین شاگرد تھے جن کے معمول میں شامل تھا کہ ان کے شعر سنیں اور تعریف کریں۔ مولانا اپنی شاعری کا مقابلہ بیدمؔ سے کرتے تھے۔ شعر سنانے کا طریقہ یہ تھا کہ وقت مقررہ پر ہم لوگ حاضر ہو جاتے تھے اور وہ شعر سنانا شروع کرتے تھے پہلے اپنا شعر سناتے، ہم سب جانتے تھے کہ پہلا شعر مولانا کا ہے اس لیے دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ دوسرا شعر بیدمؔ کا سناتے ہم سب یک آواز ہو کر کہتے کہ بودا شعر ہے نہ کوئی معنی نہ مطلب۔

بدقسمتی سے ایک دن نہ معلوم کیوں اور کیسے شعر کی ترتیب بدل گئی۔ پہلا شعر سنایا تو ہم نے پڑھ چڑھ کر قاعدے اور اپنی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے تعریف کی ایک ایک لفظ کے معنی کی مفہوم کی تعجب یہ ہوا کہ مولانا کے چہرے پر خوشی کے آثار کم تھے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ضبط سے کام لے رہے ہیں۔

دوسرا شعر سنایا۔ ہم نے کہا لاحول ولاقوۃ کیسا شعر ہے کہ درج سمجھا۔ یہ بھی کوئی شعر ہوا مولانا کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ غصہ سے منہ لال ہو رہا تھا جب ضبط نہ کر سکے تو نہایت غصے سے کھڑے ہو گئے اور ڈنڈا اٹھا کر فرمانے لگے۔

خیریت اسی میں ہے کہ فوراً چلے جاؤ۔ ورنہ میں خون کر دوں گا۔

محمود مجھے خبر نہ تھی کہ تم اچھے اور بُرے میں تمیز نہیں کر سکتے ہو آج تک میری اور بیدم کی شاعری میں فرق محسوس نہیں کر سکتے ہو۔ مجھے کم از کم اپنے شاگرد سے یہ امید نہیں تھی۔

ہم سخت شرمندہ تھے اور اسی میں خیر جانی کہ وہاں سے کھسک جائیں۔

(۲)

ایک محفل میں ایک بزرگ صورت قریب آئے۔

السلام علیکم۔ وعلیکم السلام

آپ نے پہچانا مجھے؟

جی۔ جی نہیں۔

ارے محمود۔ تم نے پہچانا نہیں۔ تعجب ہے۔ بھئی میرا نام عبدالقدوس ہے۔ اب تو یاد آیا کچھ۔

اچھا اچھا۔ اب یاد آیا۔ قدوس صاحب۔ کہیئے ٹھیک تو ہیں آپ۔

ہاں بھئی ٹھیک ہوں۔ تم کو معلوم ہے۔ اکبر میاں کا انتقال ہو گیا۔

کب؟

بہت دن ہو گئے۔

افسوس ہوا۔ بہت اچھے آدمی تھے۔
اور ہاں میاں نصیر بھی ختم ہو گئے۔
بےخیالی میں میرے منہ سے نکل گیا۔
کون نصیر؟
ارے میرے چھوٹے بھائی۔ تم کو یاد نہیں۔ وہ تو تمہارے ہم عمر اور ساتھیوں میں تھے۔ تم کو اکثر پوچھا کرتے تھے۔ تعجب ہے تم کو یاد نہیں۔
مجبوراً مجھے کہنا پڑا۔ ہاں۔ یاد آیا۔ معاف کیجئے گا اب یادداشت کچھ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔
بڑا افسوس ہوا۔ اور یہ کہہ کر میں نے دونوں بازو پھیلا کر قدوس صاحب کو سینے سے لگا لیا۔
قدوس صاحب معاف کیجئے گا اب آپ کو بھی پہچان لیا۔
قدوس صاحب کی خوشی اور اطمینان دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کی خوشی کا اب بھی جب خیال آتا ہے دل کو بڑا سکون ہوتا ہے۔
جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میں کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں ہوں جس کا نام عبدالقدوس ہے۔

(۳)

ایک میٹنگ میں کسی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک صاحب بحث کے سلسلے میں بار بار قاعدے کا ذکر کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ قاعدے کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔
میٹنگ میں چائے کے لئے وقفہ ہوا۔ پھلکیاں کھاتے جاتے تھے اور لطیفے سنا رہے تھے۔ کہنے لگے
قائم گنج میں ایک خان صاحب تھے۔ ہر وقت مونچھوں پر تاؤ دیتے گلیوں میں اکڑتے پھرتے تھے دعویٰ یہ کرتے تھے کہ بنوٹ لکڑی چلانے کے ماہر ہیں۔ اور ایسے ماہر کہ ایک طرف یہ تنہا ہوں اور دوسری طرف دس لکڑی چلانے والے تو یہ اکیلے ان

سب پر بھاری ہوں گے۔ دعویٰ کی اصلیت کیا تھی، کسی کو معلوم نہیں تھا۔

ایک دن ایک اجنبی کا گزر گاؤں سے ہوا۔ اس کے کان میں بھی یہ بات پڑی اور اس نے ان کا چیلنج منظور کر لیا۔

دن تاریخ اور جگہ کا فیصلہ ہوا اور مقابلے کے دن ایک میلہ سا لگ گیا۔ لوگ اس اجنبی کے لئے دعائیں کر رہے تھے اور بڑی رحم کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں میدان میں اُترے لکڑیاں چلنی شروع ہوئیں۔ اجنبی کی ہر لاٹھی خان صاحب کی پیٹھ پر، سر پر، ٹانگوں پر پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خان صاحب چند منٹ میں زمین پر منہ کے بل پڑے نظر آئے۔ لوگ تعجب سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے خان صاحب کو دو ٹرکران کے چیلوں نے اٹھانے کی کوشش کی مگر چوٹوں کی زیادتی کی وجہ سے ان کا اٹھنا ممکن نہ تھا مجبوراً لوگ ان کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے چلے۔

سب آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ پتہ نہیں خان صاحب کو کیا ہوا۔ اجنبی نے کوئی جادو تو نہیں کر دیا تھا۔ خان صاحب ہوش میں آچکے تھے۔ غصے میں بُرا بھلا کہنے لگے اور پھر لوگوں نے سُنا کہہ رہے تھے۔ کہ قسم لے لو۔ جو اُس اجنبی نے ایک لاٹھی بھی "قاعدے" میں ماری ہو۔

سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کیلئے تین علاج تجویز کئے۔ ایک پان اسلام، دوسرے جمہوری طریقہ حکومت اور تیسرے اسلام کی تجدید۔

سید جمال الدین افغانی دورِ جدید میں اسلام کے یا بین الملیت کے سب سے پہلے علمبردار اور مبلغ ہیں وہ وطن دوست تھے وہ وطن پرست یا قوم پرست نہیں تھے اس لئے کہ وطن پرستی اسلام کے تصورِ ملت اور اسکی عالمگیر روح کے منافی ہے یوں بھی ان کا خیال تھا کہ مغربی دول جو اسلامی ممالک کو ایک ایک کر کے ہڑپ کرتی جا رہی تھیں اگر انہیں اسلام کی متحدہ قوت سے مقابلہ کرنا ہو گا تو اس کے لئے کامیابی ایسی سہل نہ ہو گی۔

محمود حسین

ڈاکٹر سید معین الحق

ڈاکٹر محمود حسین بحیثیت مورّخ

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم سے تخلیق پاکستان کے بعد اس وقت نیاز حاصل ہوا جب حکومت پاکستان نے اس کی صدارت میں ایک بورڈ برصغیر کی ایک مختصر تاریخ تیار کرنے کی غرض سے قائم کیا، بورڈ کے سکریٹری جناب ایم بی احمد تھے اور جوائنٹ سکریٹری کے فرائض راقم الحروف کے سپرد کئے گئے بورڈ نے سارے ملک سے بیس مورخین کا انتخاب کیا اور ان سے مختلف عنوانات پر مضامین لکھوائے ۱۹۵۵ء میں یہ کتاب "اے شارٹ ہسٹری آف ہند و پاکستان" تیار ہوئی اور اس کا حق تصنیف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کو دیا گیا۔ اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب پانچ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہی نہیں تھے بلکہ ان کو مسلم لیگ حکومت میں پہلے نائب وزیر بعد میں وزیر بھی مقرر کیا گیا جس کی وجہ سے انتظامی امور سے متعلق ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ لیکن ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ذمہ داریوں کی گراں باری اور کام کی زیادتی سے کبھی نہیں گھبراتے تھے بلکہ ان کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتے اور انتہائی دیانتداری اور محنت سے کام انجام دیتے تھے۔ ان مصروفیات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علمی و ادبی ذوق کو جس کی نشو و نما یونیورسٹی کی پروفیسری کے زمانہ میں ہوئی تھی، زندہ و قائم رکھنے کے لئے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور فرائض منصبی کے سلسلے میں اپنی مصروفیات کے باوجود علمی دنیا سے عملی طور پر تاحیات منسلک رہے۔

۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان نے ایک بورڈ آف ایڈیٹرز اس غرض سے قائم کیا کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی پر ایک مبسوط اور مستند کتاب تیار کرے اس کا صدر بھی ڈاکٹر صاحب (مرحوم) کو مقرر کیا گیا۔ سکریٹری کے فرائض راقم الحروف کے سپرد کئے گئے۔ بورڈ ۱۹۶۰ء میں ختم کر دیا

گیا۔ اس طرح کم وبیش آٹھ سال تک مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ ایک نہایت اہم علمی منصوبہ میں شریک کار رہنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب اور بورڈ کے دیگر اراکین[1] نے اس مدت میں جس قدر محنت کی اور کتاب کے ابواب پر تفصیلی نظر ثانی کے سلسلے میں جتنا وقت صرف کیا اس کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں۔ تین تین چار چار گھنٹوں کی مسلسل نشستوں میں جن کی تعداد اب محفوظ نہیں، مسودات کو لفظ بہ لفظ پڑھا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان پر بحث بھی ہوتی تھی۔ اور جہاں ضرورت ہوتی ترمیم وتصحیح بھی کی جاتی تھی۔ بعض مقامات پر ضروری تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ اس طرح اراکین بورڈ کو خاصی محنت کرنا پڑی، اتنی طویل نشستوں میں متواتر کام کرنے سے ہم لوگ تھک کر پست ہو جاتے لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندہ دلی اور مزاحیہ لطیفوں سے کام میں ایک خاصی دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور اکثر وبیشتر شب کے نو بجے تک یہ نشستیں جاری رہتیں۔ جس مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب سنجیدگی سے رائے قائم کر لیتے۔ آسانی سے اس میں تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابتدا ہی میں بورڈ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کتاب میں اشخاص ومقامات کے ناموں کو رومن خط میں تحریر کرنے کے لئے ان قواعد وضوابط کی پابندی کی جائے یا نہیں جو مستشرقین نے وضع کئے ہیں، محققین اس کو ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں کہ السنہ شرقیہ کے ان حروف میں فرق ظاہر کرنے کے لئے جن کی آوازوں میں باہم مشابہت پائی جاتی ہے، اعراب کا استعمال کیا جائے مثلاً ث، س، ص اور ذ، ز، ض اور ظ میں اعراب لگا کر ان کے فرق کو ظاہر کرنا چاہئے۔ چنانچہ ث کے لئے Th، س کے لئے S اور ص کے لئے S لکھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس دیدہ ریزی پر محققین ہی کو اصرار ہو سکتا ہے، ورنہ عمومی انداز نگارش میں خواہ اس کا تعلق تالیفات وتصنیفات سے ہو۔ خواہ روزمرہ کی کاروباری زندگی میں مراسلات و دستاویزات سے اسماء کو تلفظ کی بنیاد پر تحریر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر خود ڈاکٹر صاحب کے نام کو ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ح کو Ḥ سے اور ی کو Y سے ظاہر کیا جائے گا اور اس نام کو MAḤMŪD ḤUSAYN لکھا جائے گا، لیکن جو لوگ خود اپنے نام کو کسی خاص

---

[1] بورڈ کے دیگر اراکین کے اسمائے گرامی :- ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ سید سلیمان ندوی، پروفیسر اے بی اے حلیم بورڈ نے راقم الحروف کو سکریٹری کے عہدہ پر مقرر کیا۔
۱۹۵۳ء میں مولینا سید سلیمان ندوی کا انتقال ہو گیا۔ اسکے بعد بورڈ نے مندرجہ ذیل حضرات کو رکن بنایا۔
۱۔ مسٹر ایم بی احمد ۲۔ مسٹر ایس ایم اکرام ۳۔ ڈاکٹر سید عبدالحلیم ۴۔ ڈاکٹر محمد ناظم

انداز سے لکھتے ہیں، ان میں ان کا ہی مخصوص طریق نگارش برقرار رکھا جائے گا۔ سید احمد خاں کا نام قاعدے کے لحاظ سے اس طرح لکھا جائے گا۔ SAYYID AHMAD KHĀN لیکن چونکہ وہ خود SYED AHMED KHAN لکھتے تھے اسی لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ اس کتاب میں اعراب سے پرہیز کیا جائے کیونکہ عام طور پر اس سے قارئین کے لئے ایک قسم کی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہی طے کیا گیا کہ سب ناموں کو تلفظ کی بنیاد پر تحریر کیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ کتاب جدید ترین تاریخی تحقیقات کی بنیاد پر تیار نہیں کی گئی، اعراب کی عدم موجودگی کے باوجود مختلف ممالک کے محققین نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اس کے اقتباسات اپنے مقالوں وغیرہ میں دیے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ سے عموماً اور اس کے بعض ادوار سے بالخصوص ڈاکٹر صاحب کو زیادہ دلچسپی تھی۔ ان میں ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ان ہی موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے تاریخ تحریک آزادی (ہسٹری آف فریڈم موومنٹ) کے چند ابواب لکھے، ٹیپو سلطان کے سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کی ڈائری کا انگریزی ترجمہ کر کے ڈاکٹر صاحب نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع کرایا، ڈریمز آف ٹیپو سلطان مختصر مگر دلچسپ کتاب ہے۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کے جرنل میں بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے چند گرانقدر مقالے شائع ہوئے ہیں جو تحقیقی نقطۂ نظر سے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ وہ اس جلسہ میں شریک تھے جو راقم الحروف کی تجویز پر جناب فضل الرحمٰن مرحوم نے، جو اس زمانے میں وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ اپنی قیام گاہ پر طلب کیا تھا۔ اس جلسہ میں ایک ایڈہاک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ ایک ادارہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے نام سے قائم کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے خازن کا عہدہ قبول فرمایا اور سوسائٹی کا دستور تیار ہونے کے بعد۔ ۱۹۵۳ء میں جب مستقل عہدہ داروں کا انتخاب ہوا تو ڈاکٹر صاحب پہلے خازن منتخب ہوئے۔ وہ ۱۹۵۹ء تک عہدے پر فائز رہے اور سوسائٹی کی ترقی اور اُسکے

تحقیقی پروگرام میں عملی دلچسپی لیتے رہے لیکن ان کی دوسری ذمہ داریوں کا بوجھ اب بڑھ گیا تھا جسکے نتیجے میں موصوف نے خازن کے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ فرائض منصبی کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں نے اور وائس چانسلری کے زمانہ میں انتظامی امور نے ان کو اجازت نہ دی کہ وہ کسی عظیم تحقیقی منصوبہ پر یکسوئی سے کام کر سکتے۔ میں ان سے اکثر کہتا کہ کچھ جرنل کے لئے لکھیں، موصوف یہ کہہ کر معذرت کرتے کہ وقت بالکل نہیں ملتا۔

ٹیپو سلطان کے فوجی اور حربی امور سے متعلق میر زین العابدین شوستری کی کتاب فتح المجاہدین کا فارسی متن انھوں نے شائع کیا اور انگریزی ترجمہ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ عدیم الفرصتی کے باعث اس کی تکمیل نہ فرما سکے، اس کے چند ابواب جرنل میں شائع بھی ہوئے تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو آخر میں شامی کے ظفر نامہ پر کام کرنے کی خواہش تھی اور اس پر موصوف نے کچھ کام کر بھی لیا تھا جس کا ذکر چند مرتبہ راقم الحروف سے کیا۔ اس پر افسوس کرتے تھے کہ اس کام کو ختم کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

یقیناً، اگر موصوف کی وفات اس قدر جلد واقع نہ ہوتی اور یونیورسٹی کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد موصوف کو فرصت ملتی تو وہ صرف اس منصوبے کی ہی تکمیل پر اکتفا نہ کرتے بلکہ دیگر موضوعات پر بھی تحقیقی کام جاری رکھتے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ادبی میراث کے اعتبار سے ہمارا دامن ان گنت جواہر ریزوں سے مالا مال ہے۔ ہم ایسی زبان بولتے ہیں جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اردو میں غیر زبان کو جذب کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت ہے اور یہ ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کا ایک نہایت ہی موزوں ذریعہ ہے۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس زبان کو اور ترقی دیں اور اپنے ادب میں حیات نو کی روح پھونکیں اور اس کو اور مالا مال کریں۔ — محمود حسین

ڈاکٹر ریاض الاسلام

تاریخی بصیرت کا مالک

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات سے پاکستان کی قومی اور علمی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا محال ہے۔ وہ ایک فاضل مؤرخ بھی تھے اور ایک نامور ماہرِ تعلیم بھی۔ درس و تدریس اور تعلیمی نظم و نسق، دونوں میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ کم و بیش دس وادی عملی سیاست میں گامزن رہے، اور وہاں بھی ان کی دیانت اور فراست کی دھوم رہی۔ ایسے جامع صفات اور جامع کمالات لوگ کب کب پیدا ہوتے ہیں!

ڈاکٹر محمود حسین نے اعلیٰ تعلیمی زندگی کا آغاز ہیڈل برگ، جرمنی سے کیا تھا۔ یہاں انھوں نے تاریخ اور بین الاقوامی قوانین کے ممتاز ماہرین و محققین کے زیرِ نگرانی اعلیٰ تعلیم کے منازل طے کیے۔ یہیں سے ۱۹۳۲ء میں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آگئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ عہدِ جدید کے ریڈر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی چھوڑنے سے قبل ۱۹۴۸ء میں جب حکومتِ پاکستان نے انھیں قلمدان وزارت تفویض کیا تو وہ بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر کے منصب کے لئے منتخب ہو چکے تھے۔

پاکستان میں نائب وزیر، وزیرِ مملکت اور وزیرِ کابینہ کے اعلیٰ مناصب پر بڑی امتیازی حیثیت سے فائز رہنے کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر محمود حسین کراچی یونیورسٹی میں تاریخ عمومی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ دو مختصر وقفوں کو چھوڑ کر جبکہ ایک مرتبہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۳ء کے دوران وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور دوسری مرتبہ جبکہ وہ ہیڈل برگ اور کولمبیا یونیورسٹیوں میں بحیثیت مہمان پروفیسر تشریف لے گئے تھے، اگست ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے تک وہ اس منصب پر فائز رہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ رئیس کلیۂ فنون بھی رہے۔

کراچی یونیورسٹی میں وہ بین الاقوامی تعلقات، بین الاقوامی قوانین، تاریخ یوروپ، تاریخ دستورِ ہند و پاکستان اور تاریخ تحریکِ آزادی کا درس دیتے رہے۔ شعبۂ تاریخ عمومی میں ان مضامین

کی تدریس کے دوران دیگر شعبہ جات، مثلاً شعبہ تاریخ اسلام، شعبہ سیاسیات اور شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے طلبہ بھی ان کے لیکچر میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر حسین پہلے پاکستانی تھے جو کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے۔ موصوف ہی شعبہ تاریخ عمومی اور اس کے ایک ذیلی شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے بانی اور پہلے سربراہ تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین تاریخ کے ایک بہترین اُستاد تھے۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑا واضح، صاف اور سلجھا ہوا انداز تدریس ان کی ایک ایسی نمایاں خصوصیت تھی جس کی بنا پر ذہین سے ذہین اور معمولی سے معمولی استطاعت کا طالب علم ان کے درس سے مساویانہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ ان کے پبلک لیکچر بڑے خاصے کی چیز ہوتے تھے دراصل پبلک لیکچر ایک ایسا فن ہے جس میں بڑی مشکل سے مہارت حاصل ہوتی ہے۔ مغرب میں یہ فن بڑا ترقی یافتہ ہے۔ بدقسمتی سے دنیا کے اس حصے میں اس فن کے ماہر بہت کم نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین کو اس میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ان کے پبلک لیکچروں میں سے ایک کو جو بین الاقوامی قوانین پر تھا سننے کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا ہے۔ اس لیکچر میں انھوں نے موضوع کی پیچیدگیوں اور متنازعہ مسائل کو ایسی سادگی و خوبصورتی سے بیان کر دیا تھا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

ان کی شخصیت کے دلآویز پہلوؤں میں ان کا طنز و مزاح تھا جس میں مزاح زیادہ ہوتا تھا اور طنز کم۔ ان کے برجستہ فقرے اور ان کے لطیفے ان کی گفتگو کو کچھ اور بھی دلچسپ بنا دیتے تھے۔

ان کے قلم میں بھی بڑی روانی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گوناگوں مشاغل نے انھیں علمی کاموں کے لئے یقیناً اتنی مہلت نہ دی جتنی انھیں ضرورت تھی تاہم تاریخی تحقیق و تصنیف کے کاموں میں ان کا حصہ ٹھوس اور معتد بہ تھا۔ ان کی پہلی تصنیف "توسیع سلطنت کی جستجو" (QUEST FOR EMPIRE) عصر حاضر کے جاپان، جرمنی اور اٹلی کی توسیع پسندانہ پالیسی کا ایک تعارفی مطالعہ تھا (طبع، ڈھاکہ، ۱۹۳۷ء) یہ کتاب اس امر کی شاہد ہے کہ ان عوامل پر ان کی نظر بڑی گہری تھی جو دو عظیم جنگوں کے دوران سیاسیات کو ایک خاص شکل دے رہے تھے۔ اس ذیل میں اُن کی پیش بینی فی الحقیقت صحیح ثابت ہوئی۔

پاکستان کے ابتدائی دور میں اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے عمائدین حکومت میں ڈاکٹر

محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے ممتاز مورخ شامل تھے۔ زندگی بھر کے ان دونوں دوستوں نے ملک کی ثقافتی و تعلیمی پالیسیاں بنانے اور انھیں بروبہ عمل لانے میں حکومت کا کافی ہاتھ بٹایا۔ ان ہی کے مشورہ سے جون ۱۹۵۲ء میں "تاریخ تحریک آزادی"۔۔۔۔۔ کی تدوین کے لیے ایک مجلس ادارت قائم ہوئی۔ ڈاکٹر محمود حسین اس کے چیرمین تھے اور کل وقتی سکریٹری کے تقرر سے قبل راقم نے کچھ عرصہ کے لیے اس کے قائم مقام سکریٹری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ ڈاکٹر حسین اس مجلس ادارت کے طویل غور و خوض میں بحیثیت صدر شریک رہے جس کی بنا پر چار جلدوں پر مشتمل تاریخ تحریک آزادی کا منصوبہ صورت پذیر ہوا۔ خود ڈاکٹر محمود حسین نے بھی کئی پُر مغز ابواب اس ضخیم کتاب کے لئے لکھے۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے جب پاکستان ہسٹری بورڈ قائم کیا تو ڈاکٹر محمود حسین ہی کی صدارت میں بورڈ نے ایک مفید کتاب "مختصر تاریخ ہند و پاکستان" ۱۹۵۵ء میں شائع کی۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی تشکیل و قیام میں بھی ڈاکٹر صاحب نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی کے تحت کراچی میں پہلی آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کا انعقاد ۳۰ مارچ تا یکم اپریل ۱۹۵۱ء عمل میں آیا۔ اُردو میں تحریر کردہ ان کا وہ خطبہ ایک ادبی شاہکار تھا جو موصوف نے اسی کانفرنس کے تحت منعقدہ نمائش صنعت و حرفت کے افتتاح کے موقعہ پر دیا تھا۔ ان کے متعدد خطبات صدارت سے جن میں ہسٹری کانفرنس منعقدہ خیرپور ۱۹۵۵ء اور پولٹیکل سائنس کانفرنس منعقدہ کراچی ۱۹۶۶ء کے خطبات بھی شامل ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم تاریخ و سیاسیات کے عمیق البنیاد عوامل پر ان کو کتنی اچھی بصیرت حاصل تھی۔

برصغیر کے عہد جدید میں مسلم تاریخ کی دو عظیم شخصیتیں ڈاکٹر محمود حسین کے لئے بڑی دلکشی رکھتی تھیں۔ ایک ٹیپو سلطان کی اور دوسری سید احمد شہید کی۔ ان دونوں شخصیتوں پر موصوف نے "تاریخ تحریک آزادی" میں کئی ابواب بڑے عالمانہ انداز میں تحریر فرمائے تھے۔ علاوہ ازیں ان پر متعدد تحقیقی مقالے بھی علمی رسائل کے لئے لکھے تھے۔ "سید احمد شہید کی وفات کے رازِ سربستہ" پر ان کا ایک مقالہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل میں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے بہت سے بحث طلب مسائل حل کر دیئے تھے۔ فی الحقیقت اس متنازعہ موضوع پر ان

کا مضمون حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ برصغیر کے مسلم ہیرو ٹیپو سلطان کے ایک پُرجوش مداح کی حیثیت سے ڈاکٹر حسین نے ٹیپو سلطان پر دو اہم تصانیف کو بھی ترتیب دیا تھا۔ ان میں سے ایک "ٹیپو سلطان کے خواب" تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں خود سلطان نے تحریر کیا تھا۔ دوسری "فتح المجاہدین" تھی جو ٹیپو سلطان کے فوجی قواعد و ضوابط اور اس کی جنگی حکمت عملی پر مبنی ہے (مطبوعہ کراچی ۱۹۵۰ء)۔ موخر الذکر کتاب ٹیپو کی زیر ہدایت میر زین العابدین شوستری نے مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر محمود حسین نے ٹیپو سلطان کی فوج اور اس کی بحری طاقت پر بھی متعدد دلچسپ مضامین سپرد قلم کئے۔

زندگی کے آخر دور میں ڈاکٹر محمود حسین کو نظام الدین شامی کے "ظفر نامہ" سے خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب تیمور کی مہمات سے متعلق ہے موصوف نے پوری کتاب کا قدیم ترین مخطوطات سے موازنہ و مقابلہ کر کے انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ترجمہ چند سال قبل کیا تھا مگر مختلف النوع مصروفیات نے انھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ اطمینان و سکون سے بیٹھ کر اس کے حواشی لکھ دیتے۔ اس کے لئے صبر و سکون اور وقت درکار تھا۔ اسی لئے انھیں یونیورسٹی کے فرائض سے جلد سبکدوشی کا انتظار تھا جو اگست ۱۹۷۵ء میں ہونے والی تھی۔ ان مختلف کاموں میں جو انھیں بعد از ملازمت کرنا تھے۔ ——————————

—— شامی کے "ظفر نامہ" کو اولیت حاصل تھی۔ وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کوئی بھی شخص ان کی گفتگو سے یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی انھیں کتنی خواہش ہے۔ اس سلسلے میں وہ تاشقند اور وسط ایشیا کے دوسرے شہروں میں چند ماہ اس لئے گزارنا چاہتے تھے کہ وہ ان مقامات کو بچشم خود دیکھ کر ان کا تعین کر لیں جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے اور جو اس علاقے کے کسی تاریخی جغرافیہ میں نہیں ملتے۔ شامی کا ظفر نامہ تیمور کی ایسی تاریخ ہے جو اس کے ہمعصر دور سے لے کر ۸۰۶ھ م ۱۴۰۴ء تک تھیں اس عظیم فاتح کی وفات سے ایک سال قبل تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بحسن و خوبی بڑی روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے انھیں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کے اردو

ترجموں میں ایسی روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے ان کے مشہور ترجمے درج ذیل ہیں۔

۱۔ "معاہدۂ عمرانی" —— یہ روسو کے معاہدہ عمرانی کا ترجمہ ہے اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں ایک دہلی سے ۱۹۳۵ء میں اور دوسرا کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں۔

۲۔ "بادشاہ" —— یہ میکاؤلی کے "پرنس" کا ترجمہ ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں دہلی سے شائع ہوا، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں اُردو اکیڈیمی کراچی سے اور تیسرا کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

۳۔ "عرب دنیا" —— نجلا عزالدین کی "عرب ورلڈ" کا ترجمہ ہے، یہ لاہور سے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

اُردو تراجم کے ذیل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین تاریخ اور علم سیاسیات کی اصطلاحات کی اُردو ٹرانسلیشن کمیٹی کے چیرمین بھی تھے۔ یہ منصب ۱۹۵۸ء میں اس کمیٹی کے قیام کے وقت سے ۱۹۷۱ء تک (ان وقفوں کو چھوڑ کر جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے) انھیں کے پاس رہا۔ اس کمیٹی کی نشست ہر ہفتہ پیر کے دن ہوا کرتی تھی۔ ان نشستوں میں ہونے والی کارروائیوں کے دوران اُردو محاورات اور وضع اصطلاحات میں ان کی حیرت انگیز معلومات کا اندازہ ہوتا تھا ان کی باغ و بہار شخصیت کمیٹی کے اجلاسوں کو ایسا پُر لطف بنا دیتی تھی کہ اراکین کمیٹی (جس میں راقم بھی شامل تھا) پورے ہفتہ آنے والے پیر کا انتظار کرتے تھے۔

جرمن زبان سے واقفیت کی بنا پر انہیں پاکستان کے دوسرے محققین پر فوقیت حاصل تھی۔ جرمنی میں طالب علمی کے زمانے کے ۳۰ سال بعد بھی ان کو جرمن پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ۱۹۶۴ء میں جب وہ مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ہیڈل برگ تشریف لے گئے تو جرمن زبان میں بہ آسانی لیکچر دے سکتے تھے۔ بین الاقوامی قوانین پر اُن کی عالمانہ نظر کا ایک سبب جرمن زبان سے واقفیت بھی تھی۔

ایک معلم اور ایک محقق کی مجموعی صفات نے ڈاکٹر محمود حسین کو ایک سرگرم عمل شخصیت کا حامل بنا دیا تھا۔ ان کے شاگرد ان سے محبت و احترام سے پیش آتے تھے اور وہ بھی اپنے طلبہ کو یونیورسٹی سے چلے جانے کے بعد بھی ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ طالب علموں کے ذہن پر ان کا تأثر ناقابل فراموش ہوتا تھا۔ جس نے بھی کبھی اُن سے کچھ پڑھا ہے انھیں ہمیشہ عقیدت اور محبت سے یاد رکھے گا۔

ڈاکٹر محمد عبدالعزیز

آزاد و گرفتار

میں کراچی کے سول ہسپتال میں پرائیویٹ وارڈ کے ایک جدید کمرہ نما حجرے میں پڑا تھا اور یہ میرے گلوکوما کے آپریشن کا چوتھا دن تھا۔ خبر ملی کہ ڈاکٹر محمود حسین پر یونیورسٹی کے دفتر میں دل کا دورہ پڑا، اور وہ اس وقت جناح ہسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔ افسوس ہوا اور اپنی مجبوری پر رنج۔ پہلے تین چار روز تک جو اطلاعات ملتی رہیں وہ اگرچہ زیادہ امید افزا نہ تھیں، لیکن مایوسی کا بھی کوئی محل نہ تھا۔ توقع تھی کہ وہ اچھے ہو جائیں گے اور ان کے لطیفوں اور قہقہوں کی بازگشت پھر سنائی دیگی، مگر ایسا نہ ہوا۔ ۱۰/اپریل کو صبح ہوتے ہی یہ اطلاع ملی کہ طبیبوں کی ساری کوششوں پر بے چارگی چھا گئی، کشمکشِ موت و زیست کی گھڑیاں ختم ہو گئیں، موت نے اپنا آخری وار کر دیا اور ڈاکٹر صاحب رہ گذارِ عالمِ بقا ہو گئے، جو میری اور آپ کی بھی آخری منزل ہے۔ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا، مجھے خود معلوم نہیں، مگر ان کا وہ غم زدہ چہرہ میری نگاہوں میں ضرور پھر رہا تھا جسے میں نے ماسٹر عبدالحیؒ کی تدفین کے وقت دیکھا تھا۔ وہ خاموش اور ساکت ایک رفیقِ کار کو سپردِ خاک کرنے آئے تھے۔ ۲/دسمبر ۴۴ء کی وہ رات ٹھنڈی اور خنک تھی اور کوئی گیارہ بارہ کا عمل تھا، وہ چپ چاپ کھڑے یا بیٹھے رہے، مگر کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے۔ اور پھر یکایک ۱۰/اپریل ۷۵ء کو خاموشی کے ساتھ اس کارگاہِ حیات سے اپنی علمی اور عملی مصروفیات کے ساتھ ساتھ رخصت ہو گئے۔ یہ فاصلہ بہت مختصر تھا یا انہوں نے اسے بہت جلد طے کر لیا۔ اب ماتم کیجئے یا آنسو بہائیے، مگر اس کا کیا کیجئے کہ ان کے اٹھ جانے سے انفرادی اور اجتماعی عزم کا وہ دور بھی ختم ہو گیا جو "نالۂ صبحگاہی" اور "فغانِ نیم شبی" سے عبارت تھا۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ ملیر کراچی کے بانی تھے اور اس سلسلے میں ان کی حیثیت گلِ صد رنگ کی سی تھی۔ وہ دورِ جدید کے یک رنگے ماہر نہ تھے کہ انہیں سوائے اپنے رنگ کے اور کوئی دوسرا

ونگ دکھائی نہ دے۔ غالباً وہ علم کو قاشوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے یا اگر انہیں دورِ جدید کی اختصاصی
تقسیم در تقسیم میں کوئی قباحت نظر نہ آتی تھی تو صرف اس حد تک کہ وہ متنازع اور متبائن نہ ہو بلکہ اسکی ہر کڑی
دوسری کڑی سے اس طرح ملتی چلی جائے کہ کہیں کوئی جھول نہ آنے پائے۔ چونکہ ابتدائی تعلیم سے لیکر
فنی اور اعلیٰ تعلیم کی ضروریات ان کے پیشِ نظر تھیں، اس لیئے نہ انہوں نے مقدم کو موخر کیا اور نہ موخر کو
مقدم بنایا۔ نہ کسی ادارے کو بے جا وقار کا شکار ہونے دیا اور نہ کسی تحقیر کے اسباب کو ابھرنے کا
موقع دیا۔ میں نے ان کے ساتھ ایک ڈرائنگ ماسٹر کو بھی اسی طرح ہنستے بولتے دیکھا جسطرح
کالج کے برہمن زادوں کو۔ انہیں مدرسۂ ابتدائی سے بھی شغف تھا، جو مدرسۂ ثانوی، کالج یا اساتذہ
کے تربیتی اداروں سے۔ مالی کو اپنے ہر پودے سے پیار ہوتا ہے اور وہ ان میں سے ہر ایک کو پھلتا پھولتا
دیکھنا چاہتا ہے، اس لیئے کہ وہ ان کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کرتا ہے۔

قیام پاکستان سے لیکر اس وقت تک ہماری قومی زندگی میں ایک عجیب طرفگی رہی۔ بڑے بڑے
دانائے راز آئے اور گذر گئے اور سلاطین دہلی کی طرح پرانی دہلی کو ڈھا کر نئی دہلی بناتے رہے۔ ایک
اور التمش اور بلبن کی دہلی، خلجیوں کی دہلی، تغلقوں کی دہلی اور پھر لودھیوں کا یہ سوچنا کہ ان کھنڈروں پر
ایک اور دہلی کون تعمیر کرے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ نیا شہر آباد کر لیا جائے۔ چنانچہ سکندر لودھی نے
آگرہ کو اپنا مستقر بنا کر دہلی کی روز روز کی تخریب و تعمیر سے جان چھڑا لی۔ ہم بھی اپنی سیاسی، اقتصادی،
سماجی، تعلیمی اور فکری زندگی میں اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی وضع کے دہلی اور آگرہ تعمیر کرتے رہے۔
تا اینکہ ہر چیز پراگندہ اور بکھری بکھری نظر آنے لگی۔ قوموں کی سیاسی اور اقتصادی حکمت عملی کا ان کی
تعلیمی اور فکری پرداخت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ملکی مصالح سے ہماری تعلیمی ہیئت بھی متاثر ہوئی
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہر چیز کے لیئے الگ الگ گھروندا بناتے رہے۔ حتیٰ کہ ہر چیز اپنے اپنے گھروندے
میں محبوس ہو کر رہ گئی اور کوئی مربوط کل ابھر کر اوپر نہ آسکا۔ اس دور میں بڑے بڑے تحقیقاتی اور
انتظامی ادارے بھی قائم ہوئے۔ بڑی بڑی تنظیمیں بھی وجود میں آئیں۔ منصوبہ بندی کی ضخیم پوتھیاں
بھی شائع ہوئیں۔ جن کے اندر تعلیم کی آئینہ بندی کے متعلق بڑی فکر افروز باتیں بھی درج کی گئیں۔
الف لام نون کے ذکر اذکار سے لے کر تعلیمی سرمایہ کاری اور افرادی قوت کی تربیت کے اہتمام تک
اور یہ قافلہ کبھی آوازِ جرس پر اور کبھی اس سے بھی بے نیاز ہو کر چلتا رہا۔ کبھی اسلام کے نام پر، کبھی

جمہوریت کے نام پر، کبھی مملکت خداداد کے تحفظ و بقا کے نام پر، کبھی مساوات کے اور کبھی چار قومیتوں کے اور چار ثقافتوں کے نام پر۔ ہم نے ہر تبدیلی پر شادیانے بجائے اور پھر دوسری تبدیلی کے لیئے ہنگامے کیئے۔ ان ہنگاموں میں پہلے بزرگ شامل ہوتے تھے، پھر ان کی دستگیری کیلئے نوجوان بھی شامل ہونے لگے اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ نوجوانوں نے نسلی بُعد (generation gap) کا نعرہ لگا کر بزرگوں کو گھر بٹھا دیا اور امن و جنگ کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیلی اور علم کے شیشہ محل میں مست ہاتھی کی طرح دندنانے لگے۔ بوڑھوں کا گریبان پکڑا، بزرگوں کی پگڑی اچھالی، پڑھنے والوں کا قہقہہ لگایا اور خود پستول اور چاقو لے کر میدان میں نکل آئے اور علم و فن، اخلاق و آداب اور فکر و نظر کا منہ چڑھانے لگے اور بزرگ تماشا دیکھتے رہے، اس لیئے کہ بات نسلی بُعد کی تھی۔

اس افراتفری اور آپا دھاپی میں عین ممکن تھا کہ ترویج علم و فن کا یہ روایتی تسلسل بھی ٹوٹ جاتا اور یہ ادارہ اور اس کے کارپرداز اس سیلاب میں بہہ جاتے یا اس سے اس قسم کا ساز پیدا کر لیتے کہ اس کا باقی رہنا ناممکن ہو جاتا، لیکن ڈاکٹر صاحب نہ اس سیلاب سے متاثر ہوئے اور نہ حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی۔ جو دھن تھی، وہ قائم رہی اور جو لگن تھی، اس کی تب و تاب ماند نہ پڑی۔ تعلیم کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا وہ اس میں ماحول کے اکھاڑ پچھاڑ سے بے نیاز رنگ بھرتے رہے اور اگر وقتی طور پر ایک کام کو اس پیمانے پر نہ کر سکتے، جس پیمانے پر وہ کرنا چاہتے تھے تو وہ اس سے دل گرفتہ نہ ہوتے بلکہ یہ دشواریاں ان کی اپنی دھن میں اور چاؤ پیدا کر دیتیں اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا کہ عمارت بھی بن جاتی اور ساز و سامان کا اہتمام بھی ہو جاتا۔ اس وقت اندازہ ہوتا کہ یہ کام اتنا مشکل نہ تھا، صرف تھوڑے سے دیوانہ پن کی ضرورت تھی اور وہ دیوانہ پن ان کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھا۔

ڈاکٹر صاحب ایک آزاد منش، بے باک، صاف گو مگر بے لوث اور حلیم الطبع انسان تھے۔ انہیں اپنی ذات پر اس قدر ضبط حاصل تھا کہ وہ اپنی جس صلاحیت سے جس وقت جو کام لینا چاہتے تھے لے سکتے تھے اور اس طرح وہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو حسب موقع اس ڈھب سے بروئے کار لاتے تھے کہ ان کی بات کبھی رائیگاں نہ جاتی اور ان کا ہدف ان کے دائرۂ اختیار سے باہر نکلنے

نہ پاتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، نہ انہیں کسی منصب کے حصول سے دل چسپی تھی نہ اس سے وابستہ رہنے کی آرزو۔ اگر وہ کسی منصب پر اپنے فرائض کی انجام دہی اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق نہ کر سکتے تو انہیں اس منصب سے کنارہ کش ہونے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ جس زمانے میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، مشرقی پاکستان ایک سیاسی انتشار کی زد میں آچکا تھا اور طلبہ ایک عجیب ذہنی کشمکش کا شکار تھے۔ ان کے مقاطعات سے سارا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ حکومت ان مقاطعات کو سختی سے دبا دینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کی نگاہ میں طلبہ کے اس ہیجان کا علاج ایک خوشگوار تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں مضمر تھا اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ خالص تعلیمی تقاضوں کے مطابق یونیورسٹی کو نہیں چلا سکتے تو وہ اس سے علیحدہ ہو گئے اور پھر ایک عالم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ نے انہیں باچشم تم رخصت کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں بھی ان کی فطری طرح داری ان کے اصولوں کی امین رہی۔ وہ آزاد رہ سکتے تھے لیکن جب تعلیم و تعلّم کے نام پر ان سے اپیل کیجاتی تو وہ اس قید عمر کے لیئے تیار ہو جاتے اور اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوصف دو چار بیڑیاں اور ڈال لیتے۔

اس ملک میں انگریز کے دور اقتدار میں جو تعلیمی پالیسی وضع ہوئی اس کا مقصد ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو رنگ و نسل میں ہندوستانی ہو، مگر مزاج و آہنگ میں انگریز" اس لیئے سرکاری سرپرستی میں تعلیم کی ابتدا اعلیٰ تعلیم سے ہوئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں چونکہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس فرنگی اقتدار کے اہم مراکز تھے اس لیئے ۱۸۵۷ء میں ان تینوں شہروں میں ایک ایک یونیورسٹی قائم کر دی گئی تاکہ وہ سرکاری حکمت عملی کے مطابق نئی نسل کے مزاج و آہنگ میں مجوزہ تبدیلی پیدا کرنے کے عمل کو تیز کر سکیں۔ ایک طرف ستاون کے انقلاب کی افراتفری اور انگریزی سامراج کے خلاف تلوار کی جھنکار اور دوسری طرف یونیورسٹیوں کا قیام، بظاہر یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ ایک ایسا سیاسی اقدام تھا جس کی افادیت کو اس وقت کا انگریز بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں نے بڑی جانسوزی کے ساتھ اس مشن کو پورا کیا، جس کے لیئے ان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ مجوزہ منصوبے کے مطابق ان اداروں سے ایسے ہندوستانیوں کی کھیپ نکلنے لگی، جو مزاج و آہنگ میں

انگریز تھے اور دیکھتے دیکھتے قوم کے طور طریقے اور اخلاق و آداب اسی سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اسی نظام کی پیداوار تھے اور اسی قسم کی ایک یونیورسٹی میں جو اسی نظام کے تحت ڈھاکہ میں قائم کی گئی تھی، پڑھاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ تر واسطہ ایسے ہی افراد سے پڑا ہوگا، جو مزاج و آہنگ میں انگریز ہوں گے یا بننے کے خواہش مند ہوں گے۔ لیکن جامعہ ملیہ میں انہوں نے اداروں کی تاسیس و تعمیر میں جس ترتیب اور نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھا، اس سے ان کے تعلیمی فکر و نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

تعلیم کے اصل مقاصد پر ان کی نگاہ محض نظری تاویلوں تک محدود نہ تھی بلکہ وہ اس کی عملی توضیح پر بھی قادر تھے۔ ان کے پیش نظر تعلیم ایک "مربوط کل" تھی، جس کی مدد سے ایک بامقصد زندگی کی راہ متعین کی جا سکتی تھی۔ ان کے اس خاکے میں ابتدائی تعلیم کو ایک اساسی حیثیت حاصل تھی، جس کی بنیاد پر دوسرے مدارج تعلیم کی دیوار کھڑی کی جا سکتی تھی۔ یعنی وہ اعلیٰ تعلیم سے چل کر ابتدائی تعلیم تک پہنچنے کے بجائے ابتدائی تعلیم سے چل کر اعلیٰ تعلیم تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ اقدام انگریزوں کے فلسفۂ تعلیم کی صرف نفی ہی نہیں کرتا بلکہ ایک واضح اور مثبت اقدام کی نشان دہی کرتا ہے۔ کراچی میں کالج تو کوڑیوں کے حساب سے قائم ہوئے لیکن کیا ان میں کوئی ایسا بھی تھا، جس نے انگریز کے قائم کردہ شعوری ابہام کو شعوری طور پر دور کیا ہو؟ اس شعوری جہاد میں صرف ڈاکٹر محمود کی شخصیت ایسی تھی جس نے تعلیم کے ڈھانچے (مستلہ مسعاں) کو تعلیمی بنیادی پر استوار کیا۔ جامعہ ملیہ کے تعلیمی منصوبے میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے اہتمام سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے فروغ کو فوقیت دی۔ ان اساسی مراحل کو طے کرنے کے بعد ہی اعلیٰ تعلیم کے انتظام و انصرام کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے نہ ان کی نگاہ میں اس کی کوئی افادیت تھی اور نہ ضرورت۔ میرے اس بیان کی توثیق جامعہ ملیہ کے اداروں کی ترتیبِ تاسیس سے ہو جاتی ہے۔ ان کے تعلیمی نظریات کی جو توجیہہ میں نے اس وقت پیش کی ہے، وہ ان کے فکر و عمل کا ایک تجزیہ ہے، ہمیں میرے وجدان کا کوئی دخل نہیں۔ جامعہ ملیہ کے مختلف اداروں کی ترتیبِ تاسیس سے جو بات میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ بس اتنی ہے کہ وہ ایک ٹھس قسم کے پروفیسر یا انتظام کار ہی نہ تھے، جو صرف تاریخ پڑھا سکتے تھے یا فائلوں پر دستخط کر سکتے تھے بلکہ ان کے افکار و خیالات میں

ایک ایسا تنوع تھا جو انہیں تعلیم کے مافیہ اور مقاصد کے سمجھنے پر ہمیشہ اکساتا رہا۔ جہاں وہ ابن خلدون میکاویلی، روسو کے فلسفے اور دورِ حاضر کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر غور کر کے ان کا محاکمہ کر سکتے تھے، وہ اسی سطح پر ماضی اور حال کے مفکرین تعلیم کے نظریات سے بھی واقف تھے۔ ان کے ارادوں میں غزالی کا حوصلہ، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی قلندری، ڈیوی اور کلپٹرک کے فکر و عمل کی جھلک اور وائٹ ہیڈ کے نظریات کا عکس موجود تھا اور یہ بات اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں یونیورسٹی کے بڑے بڑے پروفیسر اور اکثر سربراہوں سے منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹی کا ایک رنگا پروفیسر اپنے میدان تخصص (Specialization) کا تو ماہر ہوتا ہے، مگر وہ اپنی تنگ نائے سے نکل کر باہر نہیں جھانک سکتا اس لیے تعلیم و تعلم کے عمومی مقاصد اور ان کے ربط باہمی کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس سے میری مراد کسی کی تنقیص نہیں۔ تخصص کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے، لیکن اگر تخصص کی خاطر تعلیم کے مربوط کل کو قربان کر دیا جائے یا تعلیم کے قدرتی مدارج کو الٹ پلٹ دیا جائے اور تخصص پر ساری قوت صرف کر دی جائے تو ایسا تخصص ہوا میں معلق ہو گا۔ تعلیم کا عمل اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے مختلف مدارج کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیا جائے اور انہیں ایک مربوط کل کی صورت میں ترقی دی جائے۔ اس وقت تخصص کا میدانِ کار بھی وسیع ہو جائے گا اور اس میں ایک خاص قسم کا تنوع پیدا ہو جائے گا۔

اس ملک میں انگریزوں کے دورِ اقتدار سے لے کر اس وقت تک تعلیم کی سنتِ قدیم یہ رہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو فوقیت دی جائے۔ قومی تعلیمی کمیشن مجریہ ۱۹۵۹ء بھی اسی طرزِ فکر کا شکار رہا۔ اس کا باب اول اعلیٰ تعلیم کے متعلق ہے اور اس ترتیب نزولی کے مطابق ابتدائی تعلیم کی باری پانچویں باب میں آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس طرزِ فکر کے حامل نظر نہیں آتے۔ اگرچہ ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ یونیورسٹیوں میں گزرا، مگر انہوں نے ابتدائی اور ثانوی مدارج تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کے تابع قرار دینے کی کوشش نہیں کی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس وقت جامعہ ملیہ کے ابتدائی اور ثانوی مدارس جس سطح پر کام کر رہے ہیں، کالج ابھی اس سطح پر نہیں پہنچ سکا۔ ابھی کچھ لیے وقت درکار تھا۔ قومی تعلیمی کمیشن کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خود ہماری سرکاری تعلیمی

حکمت عملی تضاد کا شکار رہی ہے۔ منصوبہ بندی کے اکثر مرحلوں پر تعلیم کے مربوط کل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور اگر ترقیاتی شعبوں کی تقدیم (Priority) متعین ہو بھی گئی تو وہ کسی اور مرحلے پر شدنی یا ناشدنی آفت کا شکار ہو گئی، اس لیے کہ فیصلے تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر کم، سیاسی اور انتظامی تقاضوں کے تحت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس طرز فکر اور طرز کار سے اس بات کا اندازہ لگا لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے ڈھب کے اداروں کی تاسیس و تعمیر کے لیے کتنے ہفت خوان طے کرنے پڑے ہوں گے۔ ایک طرف حکومت کی حکمت عملی اور دوسری طرف معاشرے کا غلامانہ ذہن اور انگریزی مزاج کی صورت گری کی تڑپ ایسے دشوار گذار مراحل تھے کہ ان کا طے کرنا آسان نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو وسعتِ نظری کے ساتھ تحمل و برداشت کی ایسی قوت عطا کی تھی کہ وہ ان حدود میں رہ کر بھی اپنی وضع کے ادارے قائم کرنے میں کامیاب رہے۔

ان اداروں کی فلاح کے لیے انہیں چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے پاس بھی عرضِ مدعا لے کر جانے میں تامل نہ تھا اور شاید وہ اس کی نخوت پر اندر ہی اندر مسکرا لیتے ہوں، لیکن اپنی بے باکی اور عزتِ نفس کی پاس داری کے باوجود وہ اس سے تواضع اور انکسار کے ساتھ پیش آتے اور اس کے بعض مضحکہ خیز سوالات کا بڑی متانت سے جواب دیتے۔ ایک مرتبہ ایک تعلیمی افسر نے جامعہ کے ایک اسکول کا معائنہ کیا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی موجود تھا۔ اس نے بعض معمولی معمولی باتوں پر جن کا اسکول کے اچھے یا برے ہونے سے کوئی تعلق نہ تھا، اپنی برہمی کا اظہار کیا حتیٰ کہ اسکول کی سرکاری امداد بند کرا دینے کی بھی دھمکی دی اور غالباً آگے چل کر بند بھی کرا دی۔ جب اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا گیا تو وہ مسکراتے رہے اور ساری روداد سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ایک مدت تک محکمے کے غیر ضروری تحریری اعتراضات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اندر کام کرنے کی ایک ایسی دھن تھی کہ اس کے آگے کوئی مشکل مشکل نہیں رہ جاتی تھی۔ غالباً یہ ۶۸ء کی بات ہے۔ میں جامعہ کے سالانہ تعلیمی سیمینار میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی آیا۔ ظاہر ہے کہ سیمینار کی مصروفیات میں انہیں اور باتوں کا بہت کم

موقع ملتا تھا اور اس زمانے میں کراچی سے میری بھی واقفیت اتنی تھی کہ ڈاکٹر فرمان کی بیساکھی کے بغیر کہیں آنا جانا دشوار تھا۔ سیمینار میں شرکت کے بعد میں اکثر جلد واپس چلا جاتا تھا، لیکن ایک روز چائے کے وقفے میں، میں مشرقی پاکستان کے ڈاکٹر منظور سے باتیں کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ کچھ این و آں کی باتیں ہوئیں اور کچھ تعلیم و تعلم کی اور بات چلتے چلتے تربیت اساتذہ پر مرکوز ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر جامعہ ثانوی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا ایک ادارہ کھولے تو حکومت مغربی پاکستان کیا امداد دے سکتی ہے؟ اور جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ امداد کا مسئلہ تو بعد میں پیدا ہوگا، حکومت کسی غیر سرکاری تنظیم کو فنی (Professional) درس گاہ کھولنے کی اجازت نہیں دے گی تو انہیں حیرت ہوئی۔ انہوں نے اس بات کو وہیں ختم کر کے موضوع بدل دیا اور پھر بی ٹی سی کی تربیت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ تیسرے دن میں لاہور واپس چلا گیا اور دو چار احباب سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے؟ معلوم ہوا کہ اس وقت تک حکومت کی پالیسی یہی ہے کہ نجی تنظیموں کو اس قسم کے ادارے کھولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بات آئی گئی ختم ہو گئی اور میں سرکاری کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ پھر کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا، لیکن دو تین سال بعد جب میں ایک حادثے کا شکار ہو کر کراچی میں پناہ گزین ہوا تو دیکھا کہ ابھی ڈاکٹر صاحب کا عزم جوان ہے اور ایک دن سننے میں آیا کہ حکومت سندھ اور کراچی یونیورسٹی سے اجازت لے کر انہوں نے ثانوی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا ایک ادارہ کھول دیا۔ حیرت ہوئی، مگر انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں بے خیمہ و بنگاہ ایک ادارہ قائم کر دیا۔ دھن ہو تو ایسی لگن ہو تو ایسی۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ کے مختلف اداروں کی توسیع و تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی ہی میں مصروف تھے کہ حکومت نے فوجی قانون ۱۱۸ (۱۱۵) (Martial Law Regulation) کے مطابق تعلیم کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ہر حکومت کو اپنی تعلیمی پالیسی مرتب اور نافذ کرنے کا حق ہوتا ہے اور اس کے اس حق کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر علمی سطح پر اس کے حسن و قبح کا جائزہ لیا جائے تو اسے بے جا تنقید یا تنقیص پر محمول کرنا صحیح نہ ہوگا۔ سیاسی اور اقتصادی تقاضوں کے پیش نظر انسانی ذہن ہر دور میں زندگی کے ہر شعبے میں تجربے کرتا آیا ہے اور ان تجربوں کا

جاری رہنا ہی اس کی ترقی اور فلاح کی ضمانت دے سکتا ہے۔ چنانچہ تعلیم کے شعبے میں بھی نئے نئے تجربے ہوئے جن کی بدولت انسانی ذہن کی کشاد کے لیے نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور قوموں کی نظریاتی اساس کے مطابق انکی سمت متعین کرتی رہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا، اس لیئے کسی ایک طریق کار کو آخری اور حتمی سمجھنا صحیح نہیں۔ انسانی ذہن کی وسعتیں لامحدود ہیں اور انہیں محدود کرنے میں قباحتیں زیادہ ہیں فائدے کم۔

دور حاضر میں قومی ملکیت میں لینے کا وسیع تجربہ اشتراکی ملکوں میں ہوا ہے، جہاں عوام یا محنت کش کے نام پر ہر چیز قومی تحویل میں لے لی جاتی ہے حتیٰ کہ اس ملک کا ایک ایک فرد قومی تحویل میں چلا جاتا ہے اور اس کے آب و خاک و باد پر اشتراکی آمریت کی حکمرانی ہوتی ہے۔ تعلیم کو قومی ملکیت میں لے کر اسے عام کرنے کا رواج بھی سب سے پہلے انہی ملکوں میں پڑا، جس کا مقصد بچوں کے صاف ذہنوں پر اشتراکی فلسفۂ حیات یعنی جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کی چھاپ لگانا رہا ہے۔ اس کے بعد انہیں زندگی کے کسی شعبے میں بھیج دیا جائے، ان کی یہ چھاپ ان کے ذہنوں سے بولتی رہے گی اور اشتراکی آمریت مامون و مصئون۔ مغربی فلسفۂ تعلیم میں اسے نظریاتی جبریت (Indoctrination) کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں نظریاتی تعلیم کوئی ایسی بری چیز نہیں کہ اس سے نفرت کی جائے بشرطیکہ اس سے شرف انسانی مجروح نہ ہوتا ہو۔ لیکن تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد تعلیمی نظام میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس کا ایک مقصد ملک کی نظریاتی اساس کو بھی مستحکم کرنا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ پچھلے پچیس برس میں تعلیم کی مانگ میں جو اضافہ ہوا، اسے پچھلی حکومتیں پورا نہ کر سکیں۔ اس کی وجہ سے بعض تعلیمی ادارے تجارتی بنیاد پر قائم ہو گئے اور اساتذہ اور طلبہ دونوں کا استحصال ہوا، لیکن اس کا حل صرف یہ نہ تھا کہ اچھے اور برے سارے اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ اس کا ایک حل یہ بھی تھا کہ جو قوم ساز شخصیتیں اور قوم ساز ادارے نوجوانوں کی صحیح تہذیب و تربیت میں مصروف تھے، ان کی ہمت افزائی کی جاتی اور جو ادارے تجارتی بنیاد پر چل رہے تھے، انہیں سخت قوانین کے تحت قطعی پابند کر دیا جاتا یا بصورت دیگر

انہیں قومی تحویل میں لے لیا جاتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ نام نہاد اسکول، جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور جو دورِ غلامی کی یادگار ہیں، اور انیسویں صدی کے ان برطانوی اسکولوں کی پیروی میں مصروف ہیں، جو استعماری تقاضوں کے تحت وجود میں آئے تھے اور جن کی ہئیت اور طرزِ تعلیم کو خود انگریزوں نے دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنا کر بدل دیا ہے، اس سے مستثنیٰ قرار دئیے گئے اور ان کے انتظام و انصرام کو انہی پادریوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا، جو اندر ہی اندر ہماری نظریاتی اساس کی نفی کرتے آئے ہیں اور ایسے اداروں کو جو ایک مسلمان ذہن کی تشکیل و تعمیر کا کام انجام دے رہے تھے، مستثنیات کی فہرست میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جامعۂ ملیہ جیسا ادارہ، جسے ڈاکٹر محمود حسین نے قوم کی فلاح کے لیئے اپنے خونِ جگر سے سینچا، قومی تحویل میں لے لیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ سرکاری احکام دل سوزی اور جاں گدازی کا بدل بن سکتے ہیں۔

جب میں جامعہ ملیہ کے ان اداروں کے قومی تحویل میں لیئے جانے کے ماقبل و مابعد کے حسنِ کارکردگی کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ایک میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سب کو ایک مرکز پر جمع کر کے اشتراکِ عمل، سوز و سازِ زندگی اور اقبال کے الفاظ میں تب و تابِ جاودانہ کی روح پھونک رہی تھی اور دوسرے میں اس اجتماعی وجدان کا فقدان نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک وضع دار انسان تھے، اور اس معنی میں وضع داری سے میری مراد ظاہری رکھ رکھاؤ سے نہیں بلکہ اس سے میری مراد ان کے خلوص کا سادہ پن ہے جو اس اسلامی ثقافت کے اعلیٰ اقدار سے عبارت ہے، جنہیں برصغیر کے مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ سرمایہ کہا جا سکتا ہے اور جن کی پرداخت کے لیئے پاکستان قائم کیا گیا۔ میری ان کی ملاقات اتفاقاً ایک غیر رسمی ماحول میں ہوگئی۔ وہ کسی تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں لاہور آئے تھے۔ موقع ملا تو اپنے صاحب زادے طارق کی خیریت دریافت کرنے کے لیئے سنٹرل ٹریننگ کالج تشریف لائے۔ طارق اس وقت کالج کے تجرباتی اسکول سنٹرل ماڈل اسکول میں زیر تعلیم تھا چونکہ اس وقت میں بھی کالج کے اسٹاف روم میں موجود تھا، اس لیئے میرا بھی ان سے تعارف ہوگیا اور کچھ اس طرح کہ شاید میں طارق کی دیکھ بھال زیادہ موثر انداز میں کر سکتا ہوں۔ اس وقت سے لے کر تا دمِ آخر ان کی وضع داری اور ملاطفت

میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ انہوں نے ہمیشہ اور ہر حال میں میری پذیرائی کی۔ ۱۰ اپریل کو جب مجھے اس سانحہ عظیم کی اطلاع ملی تو میں ہنوز چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جامعہ پہنچ جاؤں مگر اپنی بے بسی کا ماتم کرکے خاموش ہونا پڑا اور اس طرح میں ان کے بار اخلاص سے اس قدر بھی سبک دوش نہ ہو سکا کہ ان کے سفر آخرت میں سوگواروں میں شریک ہو سکتا۔ بس اس عالم میں پڑا سوچتا رہا کہ۔

دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ڈاکٹر محمود بڑے آدمی تھے، اس لیئے ان کے کارنامے بھی بڑے تھے، لیکن ان سب سے بڑھ کر انہوں نے خلوص و محبت، تحمل و بردباری، ہمدردی، وضع داری اور تشویق کار کا جو سرمایہ اس دنیا میں چھوڑا ہے، وہ بہت عظیم ہے۔" انہوں نے عمر کو غنیمت جانا، "خیر کا وظیفہ کیا اور ' زاں پیشتر کہ بانگ برآید " اپنا اچھا نام چھوڑ کر" زیست کی آخری ساعت پر ہاتھ رکھ دیا اور اس اعتماد و ایقان کے ساتھ کہ آخری دم تک کام کرتے رہے، فلاح ذات کے لیئے نہیں، فلاح قوم کے لیئے۔

پر سوز و نظر باز و نکوبیں و کم آزار ؛ آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

اگر ہم سے ہر شخص اپنے دل کے روزن میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ میں نے اپنی زندگی کے شب و روز میں سے کتنا وقت ذاتی فلاح پر صرف کیا ہے اور کتنا وقت قومی فلاح پر تو اسے خود اندازہ ہو جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی کوہ وقار شخصیت کے سامنے وہ ایک معمولی سا سنگ ریزہ ہے اور ان کی سی بلندی پر پہنچنے کے لیئے شاید اسے قرنوں کی محنت درکار ہوگی۔ اپنی ذات کا یہ واقعاتی تجزیہ ممکن ہے ہمارے فکر و عمل کے لیئے ایک قوت محرکہ ثابت ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے حضور یہی سب سے بڑا نذرانۂ عقیدت ہے، جو ایک ایسے شخص کی یاد تازہ کرتا رہے گا، جو اپنی زندگی میں فکر و عمل کا ایک عظیم پیکر تھا۔

پروفیسر شریف المجاہد

ایک فرض شناس دانشور

۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو ڈاکٹر محمود حسین کے ناوقت سانحۂ انتقال سے رنج وغم کی جو عمومی فضا پیدا ہوئی وہ بڑی اندوہ ناک، بسیط، بے کنار اور طبعزاد تھی جن لوگوں نے مرحوم کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ان میں تمام مکاتب فکر کے سیاسی اور عوامی رہنما شامل تھے۔ وزیر اعظم بھٹو سے لے کر ماتحت منتظمین حکام، ماہرین تعلیم، دانشور، اساتذہ، اور طلبا تک، اور سیاسی وسماجی کارکنوں سے لے کر جامعات کے اداروں اور دوسری اہم تنظیموں تک سب ہی غمگساروں میں شریک تھے۔ ۱۰ اپریل کی المناک سہ پہر کو ان کی رہائش گاہ سے آخری آرام گاہ جامعہ ملیہ ملیر تک جلوس جنازہ میں شرکت کرنے والوں میں بھی زندگی کے تمام شعبوں کی نمائندگی کرنے والے افراد موجود تھے۔ قومی اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ نے ان کے انتقال کی خبر کو بڑی اہمیت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور تمام ممتاز قومی جرائد و اخبارات نے ان کے بارے میں خصوصی مضامین اور اداریئے شائع کئے۔

اگر یہ کیفیت کسی چیز کی غماز ہے تو وہ یہ کہ ڈاکٹر محمود حسین کا کتنا احترام لوگوں کے دلوں میں تھا، وہ کتنے ہر دلعزیز و مقبول تھے اور یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پاکستانی معاشرے کے تمام طبقوں پر کتنا گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ یہ ردعمل صحیح معنوں میں ان کی ذات، شخصیت اور کارناموں کا اعتراف اور ان کی ستائش وعقیدت کا خراج تھا۔

ڈاکٹر محمود حسین، بے لوث لوگوں کے بہت تیزی سے مٹتے ہوئے طبقے میں بھی یقیناً فرد فرید اور نادر شخصیت تھے۔ مرکزی کابینہ سے وابستگی کے چار سالہ سیاسی دور کے سوا کہ جس کے دوران میں تعلیمات سمیت مختلف وزارتوں کے قلمدان ان کو تفویض ہوئے ان کی پوری زندگی تدریس، تحقیق اور تعلیمی سرگرمیوں ہی کے لئے وقف رہی۔

سچ یہ ہے کہ ان میدانوں میں ان کی کارگزاری بہت ہمہ گیر اور متنوع رہی ہے مثلاً ذرا

اس پر غور کیجئے:

انہوں نے دو پاکستانی جامعات (ڈھاکہ اور کراچی) میں جدید تاریخ اور تعلقات بین الاقوام پر اور دو غیر ملکی جامعات (ہائیڈل برگ اور کولمبیا) میں جنوبی ایشیا پر درس دیا۔ وہ کراچی اور ڈھاکہ کی جامعات کے ان کی اپنی اپنی تاریخ کے انتہائی بحرانی ادوار میں سربراہ رہے اور دونوں جامعات کی ترقی میں شیخ الجامعہ اور اُستاد دونوں حیثیتوں سے ان کا کردار بہت اہم اور نمایاں رہا ہے پاکستان میں تاریخ اور تاریخی تحقیق کے لئے انہوں نے خاصا وقیع کام کیا ہے۔ وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے محرکین میں سے تھے۔ اس سوسائٹی کی مختلف کانفرنسوں میں عمومی یا جزوی (سیکشنل) صدر کی حیثیت سے نیز تاریخ کے اُستاد، مصنف اور ناظم تحقیق کی حیثیت سے انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ تاریخ تحریکِ آزادی کے مرتبین کے بورڈ کے صدر مقرر کئے گئے اور یہ اعزاز اس میدان میں ان کی وقیع خدمات اور گہری دلچسپی کے اعتراف وستائش کا مظہر ہے۔
تاریخ کے علاوہ فروغ پذیر تعلقات بین الاقوام اور صحافت کو پاکستان میں علوم کی حیثیت سے رائج کرنے میں بھی ان کی قیمتی خدمات قابل ذکر ہیں۔ وہ پاکستان میں تعلقاتِ بین الاقوام کے پہلے پروفیسر تھے ۱۹۶۰ء میں ڈھاکہ روانگی تک جامعہ کراچی میں شعبہ تعلقاتِ بین الاقوام کی تاسیس وترقی ان ہی کی رہین منت رہی۔ کراچی اور ڈھاکہ کی جامعات میں صحافت کے شعبوں کی تاسیس کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

جامعہ کراچی میں شعبہ صحافت کے قیام سے اب تک مجھے اس سے وابستگی اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے قربت کی سعادت حاصل رہی ہے۔ اس طویل وابستگی اور رفاقت کی بنیاد پر میں بہت اعتماد اور یقین سے کہہ سکتا ہوں ان کی ذات اور ان کی لاانتہا مساعی کے بغیر اوّل تو اگست ۱۹۵۵ کے سے ابتدائی زمانے میں یہ شعبہ قائم ہی نہیں ہو سکتا تھا اور ہوتا بھی تو ان کے بغیر یہ اس ترقی یافتہ شکل میں منظرِ عام پر نہ آتا کہ جیسا آج یہ موجود ہے۔ اُن ابتدائی مشکل دنوں میں کہ جب صحافت کی تدریس پر لوگوں کی تیوریاں چڑھی نظر آتی تھیں، جب لوگ صحافت کو علمی مضمون کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے، جب پیشہ ور صحافی اور ایڈیٹر اس تجربے کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے، ان مشکل دنوں میں یہ ڈاکٹر محمود حسین ہی تھے جنہوں نے ہماری روح کو گرمایا، ہمیں بے تکان کام کئے چلے جانے پر آمادہ رکھا اور

ہمیں ہماری کوششوں میں مگن کر دیا۔

میرے خیال میں یہ بات ایک مرتبہ امریکہ کے صدر آنجہانی جان۔ ایف۔ کینیڈی نے کہی تھی کہ جہاں بصیرت کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے لوگوں کی بربادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بات قوموں کی طرح اداروں کے بارے میں بھی کچھ کم درست نہیں ہے۔ یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہم میں اُن جیسا صاحب بصیرت موجود تھا۔ اگر ہم نے پچھلے ۲۰ سالوں میں کوئی ترقی کی ہے تو اس کا سہرا سراسر اُن ہی کے سر ہے کیونکہ جو کچھ بھی ہوا وہ شعبے کی ترقی میں ان کی عملی دلچسپی ہی کے سبب ہوا۔ اس ضمن میں وہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ جب انہوں نے کلیۂ فنون کے سربراہ کی حیثیت سے شعبہ صحافت کو ہمیشہ کے لئے بند ہونے سے بچایا۔ یہ ۱۹۶۰ کے موسم گرما کا ذکر ہے کہ اس وقت کے شیخ الجامعہ اپنی پالیسیوں پر اخبارات کی تنقید سے برافروختہ ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ شعبہ صحافت اپنی "ذمہ داری" یعنی اخبارات میں ان کے اور ان کے عہد اقتدار کے دفاع میں "ناکام" ہو جانے کے سبب مزاجی بقا اور وجود کے "حق" سے محروم کر دیئے جانے کے لائق ہو گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت کی تدریس کی افادیت پر ان کا یقین کتنا پختہ اور راسخ تھا۔ پریس کمیشن کی یہ سفارش بھی کہ پاکستان کی تمام جامعات میں صحافت کا نصاب پڑھایا جائے ڈاکٹر محمود حسین کی پُرزور وکالت ہی کا نتیجہ تھی۔

ایک اُستاد اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود حسین یہ محسوس کرتے تھے۔ کہ ایک بڑے کتب خانے کا ہونا تحقیق اور اعلیٰ تعلیمی مرکز کے ارتقا اور نشوونما کے لئے شرط اوّل ہے۔ ۲۰ برس سے زیادہ عرصے تک وہ متواتر بڑے شدومد کے ساتھ کتب خانوں اور ناظمین کتب خانہ جات کے مسائل کی وکالت کرتے رہے۔ جامعہ کراچی میں لائبریری سائنس کے شعبے اور کل پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کا قیام ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کئی برس تک پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کی زندگی میں شائع ہونے والی اُن کی آخری کتاب بھی دراصل مختلف اوقات میں کتب خانوں، اور ان کے ناظمین کی اہمیت پر دیئے جانے والے ان کے خطبات ہی کا مجموعہ ہے جس کا نام ہے "لائبریری اینڈ لائبریرینز"

تعلیمات کے میدان میں ان کا غالباً سب سے اہم کارنامہ ۱۹۵۲ء میں مجلس تعلیم ملی کا قیام

اور اس کے زیر انتظام ملیر میں جامعہ تعلیم ملی کی تاسیس تھی۔ اس ادارے کی بنیاد جامعہ ملیہ دہلی کی طرز پر ڈالی گئی جیسے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی نے اس وقت قائم کیا تھا جب تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے نامور بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ۲۰ برس سے زائد عرصے تک جامعہ ملیہ دہلی کے سربراہ رہے۔ یہ امر واقعہ ہے جو بظاہر ناقابل اعتبار معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں ملیر کی داغ بیل محض ۵۶ روپے کی قلیل رقم سے پڑی۔ اور سر سید کی طرح ڈاکٹر محمود حسین کے اطراف میں بھی ایسے دھن کے پکے اور بے لوث لوگ جمع ہو گئے جنہوں نے اسے ایک عظیم الشان ادارے کی صورت دی مثلاً ماسٹر عبدالحئی مرحوم (جو ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء تک تادم مرگ مجلس کے سیکرٹری رہے) چوہدری محمد علی اور جامعہ کے متواتر مقرر ہونے والے تین پرنسپل پروفیسر حمیدالدین پروفیسر محمد شفیع اور ڈاکٹر اسمٰعیل سعد نیز جناب عمرالٰہی منجملہ دوسرے حضرات کے قابل ذکر ہیں۔

جدید زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں نے تعلیمی میدان میں دو قابل ذکر ادارے قائم کئے ہیں، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ (دہلی)۔ علی گڑھ کا مطمح نظر یہ تھا کہ مسلمانوں میں جدید علوم و فنون کو اس طور پر رائج کیا جائے کہ ان کا مذہب نہ بگڑنے۔ جامعہ ملیہ دہلی علی گڑھ ہی کی باغی مگر ترقی پسند شاخ تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید علوم کی تعلیم ان ہی کی مادری زبان میں دی جائے ایک دوسرا فرق دونوں اداروں میں یہ بھی تھا کہ علی گڑھ نے تو مسلمانوں کو اپنی مدد آپ کا اصول سکھلایا اور جامعہ ملیہ دہلی نے خلافتیوں کا ایثار ذات کا اصول اپنا کر طالب علموں کو محنت کی عظمت کی تعلیم دینا، ان میں سماجی بہبود کے جذبے کی روح پھونک کر ان پر کردار سازی میں تعلیم کی اہمیت واضح کرنا اور تعلیم کے طور طریقوں میں نئے تجربات کرتے رہنا اپنا مقصد ٹھہرایا۔ ———————

——— اور یہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی اُپج تھی کہ انھوں نے ہر دو طریق ———————

تعلیم میں امتزاج پیدا کر کے اسے بڑی خوبی سے جامعہ تعلیم ملی ملیر کے اساسی نظام میں سمو دیا۔ جامعہ ملیر کے منصوبے کا منتہائے مقصود یہ بھی تھا کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے قومی مرتبے اور تشخص میں جو فرق پیدا ہوا اس کے مطابق تعلیمی نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ اور اس تقاضے کی تکمیل اس طرح مقصود تھی کہ اس ادارے کو تعلیم کے میدان میں ان اصطلاحات کو بروئے کار لانے کے لئے وقف رکھا جائے جن سے ایک خود مختار و آزاد مسلم قوم کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہوں۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر محمود حسین محض جامعہ ملیہ دہلی کے ساختہ ہی نہ تھے بلکہ برسوں

تک ان کی شخصیت پر جنوبی ایشیا کے عہد جدید کے ممتاز مسلم ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کے فکر و اثر کی چھاپ بہت نمایاں رہی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح ان کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ:

"تعلیم کا مقصد ذہنِ انسانی کی مکمل نشو و نما ہے .... مشاہدہ گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے اور فی الحقیقت ہر چیز کی قدر و قیمت کو مشاہدے کی میزان پر متعین کرنا ہے بھی بہت دشوار ہے چنانچہ تعلیم کا مقصد اوّلیٰ طلبا میں صحیح مشاہدے کی اہلیت و صلاحیت کو بڑھانا، گمراہی سے مؤثر دفاع کی تربیت دینا اور مناسب مشاہدے کے ذریعے انھیں درست نتائج تک پہنچانا ہے۔ اگر انھیں (طالب علموں کو) راست نظری اور منطقی انداز فکر کی تربیت دے دی جائے تو یوں سمجھ لیجئے کہ تعلیم کا تین چوتھائی مقصد پورا ہو گیا۔"

ڈاکٹر محمود حسین (اور ان کے ساتھیوں نے) جامعہ ملیہ میں جو نصاب تعلیم تجویز کر کے رائج کیا وہ ان ہی اُصولوں پر مبنی تھا۔ اس نصاب تعلیم اور ان دوسرے اسباب نے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے مل کر جامعۂ تعلیم ملی کو ملک کے ان معدُودے چند اداروں میں سے بنا دیا جن کی تاسیس واضح اور تعمیری نصب العین کے ساتھ کی گئی اور جو اپنے اساسی فکر و اصول سے وابستگی میں مستحکم رہے۔ مختصر یہ کہ یہ ادارہ ایک نئی اساس، نئے آہنگ ——— اور نئے انداز پر قائم کیا گیا۔

بلا امتیاز اسکولوں اور کالجوں کو قومی تحویل میں لئے جانے کے بعد سے البتہ جامعہ کے مختلف اداروں کے امتیازی کردار پر بُرا اثر پڑا ہے اور وہ ملک کے دوسرے عام اداروں کی سطح تک آ چکے ہیں یا تدریجاً آ رہے ہیں۔ اور یقیناً ہم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو اس جامعہ کے لئے کارگزار رہے ہیں یا جنہوں نے اس کا عہدِ شباب دیکھا ہے یہ صورتِ حال بے اطمینانی اور مایوسی کا موجب ہے۔

جس طرح جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر محمود حسین کے کام کے اثرات تا دیر برقرار رہیں گے اسی طرح جامعہ کراچی میں بھی ان کے کارنامے مدتِ مدید تک یادگار رہیں گے۔ اگرچہ جامعہ کراچی سے ان کی باضابطہ وابستگی ۱۹۵۲ء میں ہوئی لیکن وہ اس جامعہ سے اس کے روزِ آغاز ہی سے متعلق رہے ہیں انھوں نے اس کی ترقی کے تمام مرحلوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ چنانچہ یہاں صحت مند روایات کے قیام، تعلیمی معیار کی بہتری۔ نوجوان اور ذہین افراد کو جامعہ میں لانے اور ان کی تربیت کرنے نیز جامعہ کے

دانشورانہ مان کو بڑھاتے ہیں ان کی کاوشیں بڑی گراں قدر اور اہم رہی ہیں۔

یہ بات سب ہی کے علم میں ہے کہ ۱۹۷۱ء میں جب انھیں جامعہ کراچی کی سربراہی پیش کی گئی تو وہ اسے قبول کرنے میں انتہائی متامل تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بہت خراب زمانہ آلگا ہے، اور بہت سے عوامل نے مل کر اس منصب کی مٹی اس حد تک پلید کردی ہے کہ اب جامعات میں وائس چانسلروں کا کام محض نظم و نسق کی صورتِ حال کو سنبھالنا ہی رہ گیا ہے۔ اور پھر جامعہ کراچی کے جو ایک شہر تک محدود ہے اور یہاں کی خود رائے اور افتادہ آبادی کی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے کچھ اپنے خصوصی مسائل بھی ہیں۔ ایک بار انہوں نے کہا بھی تھا کہ یہ وائس چانسلری پھول کی سیج نہیں ہے۔

مگر اس سب کے باوجود انھوں نے اپنے ساتھیوں اور ہمکاروں کی بات سُنی اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ ایک صاحب کردار اور اولوالعزم انسان کی حیثیت سے وہ شاید فرض کی پکار کو ٹال بھی نہیں سکتے تھے خواہ صورت حال کتنی ہی خراب اور حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں بہرحال صورت کچھ یوں تھی کہ منصب کے لئے فرد مطلوب تھا فرد منصب کے حصول کا خواہاں نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے ایک سے زائد بار اعلیٰ حکام سے باضابطہ درخواست کی کہ انھیں منصبی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جائے مگر اپنی بگڑتی ہوئی صحت کو شدید نقصان پہنچنے کے باوجود وہ اپنے منصب پر برسرِ کار رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احساسِ فرض اور ایثارِ ذات کے تقاضوں کتنے زیر بار رہتے تھے۔

وہ اپنے پیشروؤں خصوصاً اپنے رفیق دیرینہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے اچھے کام کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے ہمیشہ بے تکان کوشاں رہے اور جامعہ کراچی کو ملک کی اوّلین اعلیٰ درسگاہ اور نمونے کی جامعہ بنانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ سچ یہ ہے کہ دوسری جامعات میں رونما ہونے والے واقعات کے پس منظر میں انہوں نے اپنے منصب کی پریشان کن ذمہ داریوں کو جس طرح پورا کیا وہ قابل ستائش ہے

یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان کے زمانۂ قیادت میں جامعہ کراچی کا ماحول نسبتاً پُرسکون تھا، یہاں تعلیمی میقاتوں اور تعلیمی فضا میں نظم و ضابطہ برقرار رہا۔ یہ باتیں خصوصاً اس لئے قابل ذکر ہیں کہ اسی زمانے میں دوسری جامعات میں طلبا کی ہڑتالوں، تشدد اور جامعات کی لامتناہی بندشوں

اور تعلیمی میقاتوں کے درہم برہم رہنے کے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ جامعہ کراچی میں پرسکون ماحول کا برقرار رہنا محض اس لئے ممکن ہوا کہ ڈاکٹر محمود حسین کو ہمیشہ اساتذہ طلبا اور جامعہ کے ملازمین کا لازوال اعتماد حاصل رہا اور یہ کہ اپنے اثر رسوخ، منصفانہ اندازِ کار، اصابت کردار، اخلاص نیت اور بے لوثی سے انہوں نے ہر بگڑتی ہوئی صورت حال کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال لیا۔

اور یہی کام کی دُھن اور لگن کا غیر معمولی احساس ہی تھا جس نے انھیں خود کو انسانی بساط کار سے زیادہ پھیلا لینے پر مجبور کیا۔ شاید محض اس لئے کہ کسی طرح مسلسل مالی بحران طلبا کی بے چینی و بے نظمی، اساتذہ و طلبا کی صفوں میں سیاست و افتراق اور کلیۂ فارمیسی میں داخلوں کے قضیے جیسے وسیع اور شدید مسائل پر عبور پانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ افسوس کہ اس کوشش میں ان کی صحت کو بے اندازہ ضرر پہنچ گیا۔ ۵ راپریل کی فیصلہ کن شام کو کلیہ فارمیسی میں داخلے کے امیدواروں کی ضمانت میں بیہودگی کا جو مظاہرہ ہوا اور ان کے ساتھ جو بدتمیزی کا سلوک کیا گیا وہ اس افسوس ناک صورت حال پر منتج ہوا کہ چند ہی منٹ بعد وہ اپنی کرسی میں ڈھیر ہو گئے۔

ان کور فہم، اور کندۂ ناتراش مظاہرین کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر وہ (ڈاکٹر محمود حسین) ان کے مطالبات قبول نہیں کر سکتے تو کرسی چھوڑ دیں۔ ناسپاس گزاری کی انتہا اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی تھی اور شاید مرحوم کے احساس عزتِ نفس کی قوت برداشت بھی یہاں پہنچ کر جواب دے گئی یہ اس شخص کا کیسا افسوسناک انجام ہے جس نے ایک دو نہیں بیس برس سے زیادہ عرصے تک اس ادارے کی بڑے تدبر، بڑے اخلاص کے ساتھ اور بہت ہی بے لوث خدمت کی تھی۔ اور یہ سانحہ ہمارے احساس ناسپاس گزاری کا بھی کیسا اذیت ناک اظہار ہے۔

نہ صرف پاکستان یا برصغیر پاک و ہند بلکہ شاید اس وسیع دنیا میں معدودے چند ہی ایسے چانسلر ہوں گے جو اپنے ادارے کے اس منصب تک ڈاکٹر محمود حسین جتنی طویل مدت کی خدمت کے بعد پہنچے ہوں گے اور ان میں بھی کچھ ہی ایسے ہوں گے جو ان کی طرح ذی وقار اور محبوب رہے ہوں۔ اور آخری سچی بات یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر محمود حسین کے بغیر جامعہ کراچی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ دونوں میں کچھ ایسا ربط ہے کہ نہ تو انھیں ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کی مادی علیحدگی کے باوجود آئندہ کیا جا سکے گا۔

ڈاکٹر اسمٰعیل سعد

نظری و عملی تعلیم ڈاکٹر محمود حسین کے نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر محمود حسین نے اپنی ساری زندگی تعلیم کے لئے صرف کردی۔ خود منصبی حیثیت سے بھی وہ استاد تھے۔ اسی پیشہ سے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور زندگی کے آخر تک وہ اسی سے منسلک رہے۔ یہ ضرور ہے کہ پاکستان کی تشکیل کے اولین سالوں میں انھوں نے سیاسی ذمہ داریاں بھی قبول کیں لیکن ان میں بھی وہ تعلیم سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ کچھ حصّہ تو ملکی وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی گزارا۔ اس زمانہ میں انھیں اس کا موقعہ ملا ہوگا کہ وہ ملک کے تعلیمی نظام کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھ اور سمجھ سکیں اور ملکی تعلیم کو درپیش عملی مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے سکیں۔ سیاست کا اتار چڑھاؤ انکی خاموش تعمیری صلاحیتوں کے لئے زیادہ ہیجانی اور تیز تھا اور اسی لئے جونہی سیاست سے کنارہ کشی کا موقعہ انھیں ملا وہ واپس تعلیم کے میدان میں آگئے۔ ڈاکٹر صاحب کی تعلیم سے دلچسپی بنیادی طور پر عملی نوعیت کی تھی۔ عملی اس لحاظ سے تو تھی ہی کہ وہ درس وتدریس کے کام سے وابستہ رہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ان میں یہ ملکہ تھا کہ تعلیم کی منصوبی حکمت عملی اور انتظامی معاملات میں دخیل ہوسکیں۔ تعلیمی منصوبوں کی ذہنی و عملی رہنمائی کے لئے ان کی صلاحتیں بے حد موزونیت رکھتی تھیں۔ ان میں محض ذہن کی وہ رسائی یا بیباکی ہی نہ تھی جو کسی خیال کو ایک مربوط و منظم منصوبہ کی شکل دے سکتی ہے بلکہ تفصیلات اور جزیات کی وہ ناقابل تسکین اشتہا بھی تھی جو خیال اور عمل کو ایک دوسرے سے ملادیتی ہے۔ وہ خود تو کام کرتے ہی تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ ان میں یہ ذکاوت تھی کہ وہ دوسروں پر اثر انداز ہوسکیں۔ ان میں لوگوں کو سمجھنے، ان سے کام لینے اور ان کی صلاحیتوں کی صحیح قدر کرنے کا خداداد درک تھا۔ کسی کام کو انجام دینے کے لئے ان میں محض عزم کی پختگی ہی

یہ تھی بلکہ وہ اپنے عزم کو ایک لمبی مدت پر پھیلانا بھی جانتے تھے۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اس میں پہلے دن کے انہماک کے ساتھ آخر دن تک لگے رہتے تھے۔

تعلیم کے میدان میں درس و تدریس سے قطع نظر ان کی عملی کاوشوں کی اثر انگیزی نے تین رُخ اختیار کئے، ان میں ایک رُخ ملک کی اعلیٰ تعلیم خصوصاً جامعاتی تعلیم سے انکی دلچسپی کا تھا۔

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر درس و تدریس تو ان کے فرائض منصبی میں شامل تھے ہی لیکن ان کو اس کا بھی موقعہ ملا کہ وہ ملک کے دو بہترین جامعاتی اداروں کی راہنمائی خود کر سکیں وہ پہلے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور بعد کو جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے آخر زندگی تک اس ادارے کی خدمت کی۔ ان دونوں جگہوں پر شیخ الجامعہ کی حیثیت سے محض یہی نہیں کہ انھوں نے متعلقہ انتظامی و انصرامی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی یا عمارتوں، ساز و سامان اور شعبوں میں مزید توسیع کا اہتمام کیا بلکہ ان کے ذہن میں جامعاتی تعلیم کا جو بنیادی خاکہ تھا اور اعلیٰ تعلیم کے جو اساسی نظریات تھے ان کے مطابق اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔

ان کا یہ خیال تھا کہ جامعاتی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے کام کی اصل نوعیت تعلیمی و تحقیقی ہی ہو سکتی ہے۔ تعلیم ان معنوں میں کہ طلباء کو ملکی ذمہ داری کے اہم ترین شعبوں کے لئے تیار کیا جائے ان کی ذہنی پرورش اور فنی اہلیتوں کو معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دی جائے۔ اور تحقیقی ان معنوں میں کہ ملک کے علمی سرمایہ میں مسلسل اضافہ کیا جائے۔ علم کی افزائش کا عمل برابر جاری رہے۔ لیکن چاہے تعلیم ہو یا تحقیق کوشش یہی ہونا چاہیئے کہ جامعاتی ادارہ باقی معاشرہ سے کٹ کر نہ رہ جائے۔ تعلیم کا جھکاؤ بھی اس طرف ہونا چاہیئے کہ طلباء کے ذہن و جسم دردِ قومی کی آماجگاہ بن سکیں، ان میں ملکی خدمت کا احساس بیدار ہو اور سیرت کی یکسوئی پیدا ہو اور علم کی افزائش بھی اس طرح ہو کہ علم برائے علم نہ رہے بلکہ زندگی کے عملی مسائل کے حل کی صورت اختیار کرے اور خدمت قومی کا مؤثر وسیلہ بنے۔

جامعاتی تعلیم کے ان بنیادی تصورات کے تحت ان کے ذہن میں سب سے بڑا انتظامی و انصرامی کام یہی تھا کہ یونیورسٹی میں ایسے ماحول کی حوصلہ افزائی کی جائے جو تعلیمی و تحقیقی سرگرمیوں کے لئے سازگار ہو۔ سازگار ماحول کی شرط اول یہ ہے کہ اہل علم اور اچھے لوگوں کو جمع کیا جائے۔ شیخ الجامعہ کا سب سے اہم فرض یہی ہے کہ وہ اچھے لوگوں کا انتخاب کرے اور پھر ان کی صلاحیتوں کی عملی قدر اور ان سے بھرپور کام لینے کے لئے وسائل کا اہتمام کرے۔ اپنی ایک انگریزی تحریر میں انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔

"یونیورسٹی، کلیات اور شعبوں کے مجموعہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی قدر و افادیت کو محض داخلوں کی تعداد اور شعبوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔ بنیادی طور پر یونیورسٹی اہل علم کی ایسی بستی کو کہتے ہیں جو ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہوں اور کام کرتے ہوں ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے آزادانہ ماحول میں انسانی قدروں کو مستقل جانچا اور پرکھا جا رہا ہو، جہاں یہ شرط پوری نہ ہو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جامعہ اپنے صحیح معنوں میں ختم ہو جاتی ہے۔"

خیالات کے لئے آزادانہ ماحول کی شرط کو وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے، بغیر آزادانہ ماحول کے تعلیم و تحقیق کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہماری بیش قیمت روایت رہی ہے کہ علماء نے ہمیشہ اپنے کو بیرونی دباؤ اور حکومتی اثر سے آزاد رکھا۔ اہل ثروت یا حکومت کا کام اہل علم کی سرپرستی اور جامعہ کے لئے وسائل کی فراہمی تو ہے لیکن جامعہ کے کام پر اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر اثر اندازی ان کے لئے روا نہیں۔ جامعہ کو ہر قسم کے دباؤ خصوصاً حکومتی اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ حکومت کا کام یہی ہے کہ وہ جامعاتی اداروں کو مالیاتی تحفظ دینے کی کوشش کرے اور ان کے مسائل اور مشکلات میں عملی دلچسپی لے لیکن حکومت کو یونیورسٹی کے کام اور انصرام میں براہ راست دخل نہ دینا چاہئے۔ اگر حکومت اس قسم کی دخل اندازی کرے گی تو یہ اس بنیادی وظیفہ کی نفی ہوگی جو معاشرہ کی طرف سے جامعاتی اداروں کو تفویض ہوا ہے۔ ایسی صورت میں تعلیم، تعلیم نہ رہے گی، حکومت کی مفاد پرست نگاہ کی کرشمہ سازی ہو جائے گی۔ خیالات کی ہلچل میں جمود

آجائے گا اور تخلیقی قوتیں خشک ہونے لگیں گی۔ ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے آزادیٔ افکار کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا۔

"جب کسی سماج کے خیالات میں جمود آجائے تو پھر وہ مرنے لگتی ہے۔ اس کی نگاہ مستقبل سے گریزاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی سماج حریت فکر سے ڈرنے لگے تو وہاں زندگی تدریجاً زائل ہونے لگتی ہے۔ آزادیٔ افکار کا خوف داخلی انحطاط کا یقینی نشان ہے"

لیکن آزادی کا بے لگام تصور بھی ان کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ ایسی آزادی کے قائل تھے جس میں انسان اپنے کو آزادانہ طور پر بعض اعلیٰ ضابطوں اور اقدار کا تابع کر لیتا ہے۔ دراصل تعلیم کا بنیادی مقصد ہی سماج کی اعلیٰ قدروں کی پرورش اور تنقید ہے۔ اعلیٰ قدریں انسان کے اندر زندگی کے ایک لائحہ عمل نظم اور ضابطہ کی ترغیب پیدا کرتی ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسی پابندی ہوتی ہے جو انسان شعوری طور پر خود اپنی شخصیت کی بالیدگی کے منطقی تقاضے کے طور پر قبول کرتا ہے۔ جامعاتی اداروں کا منتہا یہی ہے کہ وہ ایسا آزادانہ ماحول پیدا کریں جس میں انسانی قدروں کی تشکیل اور ان کا ارتقاء مسلسل جاری رہے۔ اس بات کو سمجھاتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ لکھا۔

"اس سوال کی بابت کہ جامعہ کا ملکی زندگی میں واقعی کیا کردار ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے معاشرے کو آزادی اور تہذیب کی بنیادی قدروں کی مسلسل یاد دہانی کراتے رہنا تاکہ ان بلند مقاصد کی تشکیل ہو سکے جن کے تابع معاشرہ کا سارا کام ہوگا۔ آپ مجھ سے اس بات میں تو اتفاق کریں گے کہ بغیر ان مقاصد کے واضح اظہار کے جن کا حصول سماج کے لئے ضروری ہے، ترقی کا سارا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے۔ صرف جامعہ ہی مستقل اور بے ثبات لازوال اور عارضی یا دوسرے الفاظ میں کبھی نہ ختم ہونے والی سچائیوں اور نعروں کے درمیان امتیاز کی نشان دہی کر سکتی ہے۔ خالی خولی ترقی مجھے خوف زدہ کرتی ہے۔ جب تک ترقی ایک آزاد معاشرہ کے حصول میں مدد نہ دے وہ سعیِ لاحاصل ہے۔ اگر ہمارے اہل علم اس حقیقت کو کامیابی کے ساتھ ملک کے لوگوں تک پہنچا سکیں، تو سمجھ لیجئے کہ پاکستان کے جامعاتی اداروں نے اپنا فرض انجام دے دیا۔"

جامعہ میں علمی آزادانہ ماحول کا ایک پہلو تعلیم اور سیاست بھی ہے تعلیم کو وہ سیاسی دباؤ سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ تعلیم کے تعمیری تقاضے سیاست کے اُتار چڑھاؤ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ طلباء نہ تو سیاست کے اثر سے آزاد ہیں اور نہ ہی سیاست سے ان کی دلچسپی پر کوئی تعلیمی بندش لگانا ممکن ہے۔ سیاست سے طلباء کی دلچسپی خود ہماری سیاسی تاریخ کی روایت بن چکی ہے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یونیورسٹی کو جزیرہ بنا کر نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی اسے جزیرہ بننا چاہیئے، ذہنی مشاہداتی اور علمی سطح پر طلباء میں جیسے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے سلسلے میں راہنمائی اور تربیت تعلیم کا کام ہے اسی طرح انکی سیاست سے دلچسپی کی ذہنی راہنمائی بھی ہونا چاہیئے۔ مگر صرف اس حد تک کہ انھیں سیاسی فکر میں دلچسپی پیدا ہو سکے اور وہ ملک کے سیاسی حالات پر سوچ بچار کر سکیں۔ وہ اس کے حق میں تھے کہ مختلف سیاسی فکر اور جماعتوں کے نمائندوں کو یونیورسٹی میں آکر اس بات کا موقع فراہم کرنا چاہیئے کہ وہ اپنا مطمح نظر طالب علموں کے سامنے پیش کر سکیں لیکن یہ صرف اس حد تک کہ طلباء کی سیاسی فکر کی راہنمائی ہو سکے۔ سیاسی جماعتوں کو اس سے گریز کرنا چاہیئے کہ وہ دورانِ طالب علمی طلباء کو عملی سیاست میں گھسیٹیں اس لئے کہ تعلیم کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت کا مطلب یہی ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفہ بنیادی کی طرف سے غافل ہو رہی ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے طلباء اور سیاسی جماعتوں سے کہیں زیادہ خود یونیورسٹی کے اساتذہ اور منتظمین اپنے کو عملی سیاست سے الگ رکھیں اور یونیورسٹی کے ماحول کو سیاسی نہ بننے دیں۔ اگر حکومت کی طرف سے اس قسم کی کوشش ہو تو اس کی پوری طرح مزاحمت کریں۔ خود ڈاکٹر صاحب کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران اس قسم کے سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرنا پڑا یہاں تک کہ انھیں اپنے منصب سے مستعفی ہونا پڑا۔

زندگی کے آخری سالوں میں وہ جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ رہے اور اس ادارے کے ایک بڑے مشکل دور میں اس کی راہنمائی کی۔ یہاں بھی ان کی کوشش یہی رہی کہ طلباء اور اساتذہ مل کر ذہنی و عملی ہم آہنگی کے ساتھ یونیورسٹی کے کام کو آگے بڑھائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو طالب علموں سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ ان کو قوم کے مستقبل کا امین سمجھتے تھے۔ طلباء کی موجودہ بے چینی اور

اضطراب اپنی جگہ ایک تکلیف دہ بات ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بے چینی کا ٹھنڈے دل اور سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ بزرگوں اور چھوٹوں کے درمیان جب محبت اور احترام کا فاصلہ نزاع اور تصادم کا فاصلہ بن جائے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا۔

"چھوٹے اور بڑے تو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہی ہیں، اور اگر ایسا نہ ہو تو مجھے یہی شبہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی غیر متوازن ضرور ہے۔ ہم ان تجربات سے گزرے ہیں نوجوان نسل کے حصہ میں نہیں آئے اور ان کا سفر ایک ایسے مستقبل کی طرف ہے جس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں کے درمیان تصادم لازمی ہے"

تعلیم کا کام یہی ہے کہ وہ دونوں نسلوں میں ہم آہنگی کی راہیں ڈھونڈے۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم نوجوان نسل کے اندر تاریخی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کریں بغیر تاریخ کے شعور کے انسان مہذب نہیں ہوسکتا۔ وہ بغاوت اس لئے کرتا ہے کہ چیزوں کو سمجھتا ہی نہیں ہے وہ کچھ بنا نہیں سکتا اس لئے کہ اس کے پاس تعمیر کے لئے بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ نوجوان نسلوں کو اس معاشرتی ورثہ کا شریک بنانا چاہیئے جو ماضی نے ہم کو دیا ہے۔ اس میں ہوسکتا ہے کہ وہ تبدیلیاں کرنا چاہیں لیکن انھیں خود ہی یہ احساس ہوگا کہ تعمیر نو کے لئے بھی اپنے ماضی اور روایتوں کا گہرا فہم ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین نے تعلیمی خدمت کے جس دوسرے میدان سے اپنے کو وابستہ کیا، وہ تھا کتب خانوں کی ترویج کا اہتمام۔ کتب خانوں کو انھوں نے ہمیشہ ملکی تعلیمی نظام کے فروغ کے لئے اساسی اہمیت کا حامل سمجھا۔ وہ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے بانی صدر تھے لیکن اس انجمن کی راہنمائی انھوں نے اس طرح کی کہ اسے ایک تحریک بنا دیا، مذہب سے قلبی لگاؤ اور تاریخ ملی کی گہری بصیرت کی بنا پر ان کو اس گہرائی اور وسعت کا پورا اندازہ تھا جس سے کتب خانوں اور کتابوں نے اسلامی تہذیب کو شاداب و سیراب کیا اور پھر کس طرح علم کی طرف بے اعتنائی اور جمود نے قوم کو پستی کی طرف ڈھکیل

دیا اور علم کے موتی ہم سے چھین لیے۔ ایک جگہ انھوں نے کتابوں کی کمیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"اپنے زوال کے عہد میں، جب ہم خواب غفلت میں تھے اور ہم نے اپنی آزادی سمیت اپنی ساری بیش قیمت چیزیں گنوا دیں اس وقت ہماری کتابیں یا تو دوسروں نے خرید لیں اور یا دوسری قوموں کے ہاتھ لگ گئیں اور ان کے کتب خانوں اور عجائب خانوں کے نوادرات میں ان کا شمار ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی تاریخ پر کچھ لکھنا ہو یا اپنے تمدن پر کام کرنا ہو یا اپنے ادب کا مطالعہ کرنا ہو تو ہمیں لندن آکسفورڈ اور کیمبرج یہاں تک کہ پیرس بھی جانا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ کتب خانوں کی روایت ہمارے ملک میں از سر نو تازہ ہو سکے، لیکن اس روایت کو زندہ کرنے کے لیے ان کی توجہ نے جن باتوں کو اپنی طرف کھینچا وہ ایسے عملی مسائل تھے جن کے حل کے بغیر کتب خانوں کی تحریک آگے بڑھ ہی نہ سکتی تھی۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ خود منتظمین کتب خانہ اور کتب خانوں سے وابستہ لوگوں کی معاشرتی توقیر اور حیثیت میں اضافہ ہو۔ جب تک ایسا نہ ہوگا لوگوں میں کتابوں کی صحیح قدر نہ پیدا ہو سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کی سر توڑ کوشش کی کہ کتبخانہ سے منسلک لوگوں کو وہی مراعات اور حیثیت حاصل ہو سکیں جو علم و تحقیق سے وابستہ دوسرے شعبوں کے لوگوں کو حاصل ہیں اور یہ کام انھوں نے خاصی کامیابی سے کیا۔ یہ خود ان کی شخصیت کا اثر تھا کہ لوگوں نے اس بات کی اہمیت کو محسوس کیا کہ کتب خانوں سے منسلک لوگوں کو ان کی جائز اہمیت اور مقام کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کوشش یہ بھی رہی کہ علمی مضمون کی حیثیت سے لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم کا اہتمام ہو تاکہ ملک میں صحیح معنوں میں اچھے کتب خانوں کی تنظیم ہو سکے۔ لائبریری سائنس کی تدریس کیلئے باقاعدہ شعبوں کا اہتمام ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی انہی کی کوشش سے ہوا اور کراچی یونیورسٹی میں بھی اس شعبہ کا قیام اور اس کی توسیع ان کی کاوشوں کی رہین منت رہی ہے۔

وسیلۂ علم کی حیثیت سے کتب خانوں کی ترویج کے ساتھ ساتھ ان کو علمی کتابوں کے

اردو میں ترجمہ سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ خود انھوں نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا اور وضع اصطلاحات کے سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کی ترجمہ کمیٹی برائے تاریخ کے وہ صدر تھے اور بڑی باقاعدگی اور شوق سے اس کی نشستوں میں حصّہ لیتے تھے۔ جامعہ ملیہ میں ہر سال کسی نہ کسی تعلیمی موضوع پر جو مذاکرے ہوتے تھے ان میں ایک کا موضوع ہی ترجمہ کے سلسلے میں مسائل اور امکانات کا جائزہ تھا۔ تراجم سے اس قدر گہری دلچسپی کا تعلیمی پہلو یہ تھا کہ ہماری قومی زبان جلد از جلد اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں خود کفیل ہو سکے۔

آیئے اب ہم ایک نظر ان کے تیسرے اور شاید سب سے اہم تعلیمی کام کی طرف ڈالیں اداروں کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی شخصیت کی پھیلی ہوئی پرچھائیں ہوتے ہیں۔ یہ بات محسوس یوں ہوتا ہے گویا جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر محمود حسین ہی کے بارے میں کہی گئی ہو۔ اس ادارے سے انھیں گہرا شغف اور جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ اس ادارے کے بانی تھے اور شروع سے آخر تک اس سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر صاحب خود ہندوستان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم تھے اور ان کی شخصیت اس دردِ ملّی کی امین تھی جس کے سوتے ہندوستانی مسلمانوں میں تحریک خلافت سے پھوٹے اور جس کی آبیاری شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیتوں نے کی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں کی طرح جن میں خود ان کے چہیتے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین انتہائی نمایاں تھے، ڈاکٹر محمود حسین کا بھی یہ پختہ خیال تھا کہ تعمیر ملی کا اگر کوئی صحیح اور قابل بھروسہ ذریعہ ہے تو وہ تعلیم کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ تعلیم ہی قوم کی شخصیت میں یکسوئی پیدا کرتی ہے اور قومی زندگی کو پائیدار بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔ قائداعظم کی راہنمائی میں مسلمانوں نے اپنے لئے ایک ملک حاصل کر لیا تھا لیکن پاکستان کی تشکیل صرف نشانِ راہ تھی منزل نہ تھی۔ صحیح اسلامی جمہوری معاشرہ کی حیثیت سے اس نئے ملک کی تعمیر بنیادی طور پر تعلیم کا کام تھا اور اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے خدمتِ تعلیم کے لئے اپنے کو وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ملیر کے مضافاتی علاقے میں اکتوبر ۱۹۵۲ء میں رکھی گئی۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جامعہ ملیہ دہلی کے بعض سابق اساتذہ اور طالب علم اس کام میں شریک ہوئے۔ یہ اس ادارے

کی خوش قسمتی تھی اور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا اثر کہ جامعہ ملیہ کے سابق استاد عبدالحیٔ صاحب
مرحوم نے اس ادارے کی انتظامی ذمہ داریوں کو ہاتھ میں لیا۔ مرحوم عبدالحیٔ صاحب کا عملی
تجربہ وسیع تھا اور وسائل کی تنگی میں بھی کام کرنا خوب جانتے تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایسے حالات
میں ان کی انتظامی صلاحیتیں اور بھی نکھر آتی تھیں۔ ان کی رفاقت سے ڈاکٹر صاحب کی امنگوں کو
استقامت مل گئی۔ عبدالحیٔ صاحب نے جن کو عام طور پر سب ماسٹر صاحب کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب
پر انتظامی ذمہ داریوں کی روزمرہ تفصیلات کا بہت زیادہ بوجھ نہ پڑنے دیا اور وہ زیادہ تر اس
ادارے کے لئے تعلیمی حکمت عملی اور منصوبہ بندی میں مصروف رہے اور ڈاکٹر صاحب کی راہنمائی
میں اس ادارے میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی۔ جس ادارے نے کسی حد تک بے سروسامانی
کی حالت یعنی صرف ساٹھ روپے کی استطاعت کے ساتھ ایک چھوٹے سے ابتدائی مدرسہ
کی شکل میں ابتدا کی تھی۔ اس نے دس سال کی مدّت میں چھ تعلیمی اداروں کی شکل اختیار کر لی
ابتدائی مدرسہ کے علاوہ الگ الگ دو ثانوی مدارس برائے طلباء و طالبات قائم ہوئے
ایک ڈگری کالج کی بنیاد رکھی گئی جس میں سائنس، آرٹس اور کامرس تینوں شعبوں میں تعلیم
کا انتظام ہے۔ اساتذہ کا تربیتی ادارہ قائم ہوا جس میں نچلی اور اعلیٰ دونوں سطحوں پر تربیت
کا انتظام کیا گیا۔ ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی عمل میں آیا جس میں نچلی سطح پر
ٹیکنیکل تربیت کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ایک خوبصورت مسجد کی تعمیر کی گئی۔ سماجی بہبود کی کچھ سرگرمیاں
شروع کی گئیں اور نشر و اشاعت کے لئے مکتبہ جامعہ کے کام کی ابتدا ہوئی۔ مکتبہ
جامعہ نے تعلیم بالغان کے لئے کتابوں کے ایک سلسلہ اور بعض دوسری بالخصوص تعلیمی
موضوعات پر کتابوں اور تراجم کے علاوہ بچوں کے لئے بھی ایک ماہنامہ کا اجرا کیا اور جامعہ
ملیہ دہلی کے پرانے کارکن اور بچوں کے نامور ادیب عبدالواحد صاحب سندھی نے
اس کی ادارت کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں خالص تعلیمی
مسائل و موضوعات پر ایک سہ ماہی پرچہ بھی شروع کیا گیا جو باوجود نقصان کے بارہ
سال تک برابر نکلتا رہا۔ یہ مدّت کسی بھی رسالہ کے لئے خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں
سنجیدہ موضوعات سے علمی دلچسپی بہت کم ہے لائق ستائش ہے۔ ایک اور تعلیمی سرگرمی

کسی اہم تعلیمی موضوع پر سالانہ ایک مذاکرہ کا انعقاد تھا۔ یہ مذاکرہ قومی سطح پر ہوتا تھا اور ڈاکٹر صاحب پوری کوشش کرتے تھے کہ تعلیمی کام سے وابستہ لوگ خصوصاً موضوع سے متعلق نمائندہ لوگ ضرور شامل ہوں۔ ہر سال ان مذاکروں کی تفصیلی روئیداد کی طباعت بھی ہوتی رہی اور ان کے شمارے آج بھی ملک کے تعلیمی سرمایہ کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ غرض اپنی وسعت ساز و سامان اور سرگرمیوں کے لحاظ سے شاید جامعہ ملیہ نے کراچی یونیورسٹی کے بعد اس شہر کے دوسرے بڑے تعلیمی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے کہ جامعہ ملیہ اب محض ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تعلیمی بستی بن چکا ہے۔

جامعہ ملیہ ملیر کے آغاز کے وقت ڈاکٹر صاحب اور ان کے دوسرے رفیقوں کے ذہن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مثال اور وہاں کے تعلیمی تجربات تھے اور یہاں کے کاموں میں بھی کوشش کی گئی کہ وہاں کی جھلک قائم رہے لیکن خود ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بھی تعلیم کا ایک تصور تھا ملکی تعلیم کے نئے افکار و مقاصد کا ایک ایسا خاکہ جس کی عملی شکل وہ جامعہ ملیہ ملیر کے تعلیمی کام میں دیکھنے کے آرزومند تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین کا خیال تھا کہ ملکی تعلیم کا اصل اور بنیادی مسئلہ آج بھی وہی ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے شروع ہوئی یعنی یہ کہ مغربی اثرات کو اپنی تہذیبی زندگی میں کس انداز سے، کس نہج پر اور کس حد تک قبول کیا جائے، انگریزوں کے تسلط کے اولین زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا ردِ عمل یہی تھا کہ ان اثرات کی طرف سے بالکل پیٹھ موڑ لی جائے اور انگریزوں سے کوئی تعلق قائم نہ کیا جائے، اس ردعمل میں کچھ تو اس بے بسی اور غصّہ کی آمیزش تھی جو حکومت ہاتھوں سے نکل جانے پر ہونا ہی چاہیے تھا اور کچھ اس جمود کی جو ہماری تہذیبی زندگی میں سرایت کر چکا تھا۔ سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء کار نے اس رد عمل کے خلاف جدوجہد کی اور ہمارے تہذیبی جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن جو تحریک انھوں نے شروع کی اس میں آگے چل کر توازن قائم نہ رہ سکا اور مغربی اثرات کے قبول کرنے میں بے راہ روی نمایاں ہونے لگی۔ مسلمانوں کا بارسوخ اور تعلیم یافتہ طبقہ محض سطحی انداز میں مغربی اثرات کو قبول

کرنے کی طرف مائل ہونے لگا۔ بجائے اس کے کہ مغرب کی صحت مند قدروں کو اپنانے کی کوشش کی جاتی صرف اوپری ٹیپ ٹاپ سے مرعوب ہو کر رہ گئے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ احساسِ کمتری میں اضافہ ہونے لگا، قومی خود اعتمادی متزلزل ہوتی گئی اور ہماری قومی شخصیت مسخ ہونے لگی۔ آج بھی ہمارا سب سے اہم تعلیمی مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنا تہذیبی و ملی تشخص کس طرح قائم رکھیں اور بحیثیت قوم مغربی اثرات کی طرف ہمارے تعلیمی ردعمل کی کیا نوعیت ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اس خیال میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی تحریک سے متاثر تھے کہ ایسے تعلیمی ماحول کا اہتمام کرنا چاہیے جو بچوں کو موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے لیکن بنیادی طور پر اچھا مسلمان بننے میں ان کی مدد کرے۔ بچوں کی تعلیم ان خطوط پر ہونی چاہیے کہ ان میں مختلف علوم خصوصاً جدید سائنسی علوم سے دلچسپی پیدا ہو۔ وہ علم اور زندگی کے آپسی ربط کو سمجھ سکیں اور علم کو زندگی کے عملی مسائل کے حل کا وسیلہ بنانے کے اہل ہوں۔ بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کر سکیں اور سماجی تغیر کے عمل پر شعوری طور پر اثر انداز ہو سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اچھے مسلمان ہوں اچھے مسلمان کا تصور دینی ارکان اور بنیادی معتقدات سے وسیع تر ہونا چاہیئے۔ اس میں بچہ کی پوری شخصیت اور اس کی زندگی کی سرگرمیاں شامل ہونا چاہئیں۔ تعلیم کی زیادہ تر توجہ اسلامی قدروں کی طرف ہونا چاہیئے تاکہ بچوں کی طبیعت اور مزاج دینی بن سکے اور ان کے ہر عمل میں اپنے مذہب کی قدروں کی جھلک نمایاں ہو۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم اپنی معاشرت اور تہذیب میں جذب اور پیوست ہو۔ ہماری تمدنی زندگی کی اعلیٰ اور بہترین قدریں وہی ہیں جن کا سرچشمہ ہمارا مذہب ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ان قدروں کی شخصیت میں ترویج بچے کی شخصیت کو بہتر زندگی کے اس تصور کے قریب لائے گی جو مذہب نے ہمیں دیا ہے۔ یوں بھی بچہ کے ذہن کو اپنے ماحول اور ارد گرد زندگی سے جو مناسبت اور انسیت ہوتی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ خود اس کے اپنے معاشرتی ماحول کو اس کی تعلیم کا وسیلہ بنایا جائے۔ اس طرح بچہ مؤثر طور پر اپنے تمدنی ماحول کو اپنے اندر

جذب کر سکے گا اور اپنی تہذیبی زندگی میں بھرپور حصّہ لے سکے گا۔ ایک طرف اس کا ذہن کھلے گا اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں پورے طور پر نکھریں گی تو دوسری طرف بچّہ کے دل میں اپنی تمدنی زندگی سے لگاؤ پیدا ہوگا۔ اپنے ملک کی محبت پیدا ہوگی۔ بچّہ کے اندر اجتماعی شعور جاگے گا۔ اور جماعتی زندگی کی نسبت سے اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کا احساس پیدا ہوگا۔

بچّہ کے اندر دینی مزاج پیدا کرنے کے لئے دوسری اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کے تصوّر کو محض ذہنی یا کتابی تعلیم کے تصور تک محدود نہ کر دیا جائے بلکہ ایک زیادہ وسیع اور جامع تصور کو اپنایا جائے۔ تعلیم کو درسی کتابوں سے کہیں زیادہ ان بامقصد سرگرمیوں پر محیط ہونا چاہئے جو بچے کی پوری شخصیت کی آبیاری کرتی ہیں۔ ذہنی سرگرمی دراصل حصہ ہوتی ہے اس عملی سرگرمی کا جس کا محرک زندگی کے مسائل بنتے ہیں اور وہ بحیثیت مجموعی پورے عمل سے الگ نہیں ہوتی۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ تعلیم کو تربیت سمجھا جائے اور سیرت کی تربیت کو اصل تعلیم خیال کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب تعلیم میں تربیتی پہلو کو زیادہ اہم گردانتے تھے اور ان کے خیال میں تعلیم کا بنیادی فریضہ یہی تھا کہ وہ ایک ہم آہنگ اور مربوط شخصیت کی پرداخت کرے۔ جامعہ ملیہ میں ہر تعلیمی ادارے کے ساتھ دارالاقامہ کی سہولیات کا اہتمام اسی خیال سے کیا گیا تھا تاکہ تعلیم بچوں کی پوری شخصیت پر حاوی رہے اور ان کی تربیت کے لئے موزوں ماحول کا اہتمام ہو سکے۔

جامعہ ملیہ کے تعلیمی ماحول کے سلسلے میں ڈاکٹر محمود حسین کے ذہن میں دوسری اہم بات یہ تھی کہ تعلیمی ادارے کو ایک خاندان کی طرح بچّے کی نشو و نما کرنا چاہیئے۔ جس طرح خاندان کے افراد کے درمیان بنیادی رشتہ محبت آپس کے اعتماد اور اشتراکِ عمل کا ہوتا ہے۔ مدرسہ کے تعلیمی ماحول میں بھی بنیادی طور پر اسی رشتہ کی کارفرمائی ہونا چاہیئے۔ مدرسہ کی تعریف ایک چھوٹا معاشرہ کی گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مدرسہ کی تعریف خاندان کی حیثیت سے کرنا چاہئے جہاں تعلقات کی نوعیت زیادہ نجی اور ذاتی ہوتی ہے اور جہاں بچے کے لئے زندگی کی ہر سطح اور انسانی رشتوں کے تمام مدارج موجود ہوتے ہیں

جامعہ ملیہ میں بھی انھوں نے یہی کوشش کی کہ تعلیم کی ہر سطح کے لئے تعلیمی سہولتوں کا انتظام ہو اور ہر تعلیمی مرکز اپنی جگہ ایک چھوٹا سا گھر ہو اور تمام مراکز کا ملا جلا ماحول ایک خاندان کا سا ہو جہاں سب مل جل کر رہتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ محبت، اعتماد اور احترام کا رشتہ ہو اور سب اپنی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کے مختلف مراحل میں منہمک ہوں۔

تیسری بنیادی بات جس کو ڈاکٹر صاحب تعلیم کے لئے اہم خیال کرتے تھے اور جس کو وہ جامعہ ملیہ میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے تھے وہ تھی انفرادی اقدامی صلاحیت کی حوصلہ افزائی۔ تعلیم کے کام کے لئے کام کرنے والوں میں باہمی اشتراک عمل تو ضروری ہے ہی لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ کام کرنے والے کی اپنی اقدامی صلاحیت اور نئے نئے تجربات کرنے کے میلان کی حوصلہ افزائی ہو۔ تعلیم کے کام میں مرکزیت یا اختیارات کا ارتکاز ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے کے اندر تخلیقی قوتیں احساس ذمہ داری اور کاموں کو انجام دینے کا حوصلہ پیدا ہو تو اس کے لئے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ خود اساتذہ اور تعلیمی کارکنوں کے لئے ایک آزادانہ ماحول ہو۔ انہیں محض کام کرنے کی ہی آزادی نہ ہو بلکہ کام میں غلطیاں کرنے اور پھر ان سے کچھ سیکھنے کی آزادی بھی ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ کام خصوصاً تعلیمی کام محض روزگار کا وسیلہ ہی نہیں ہوتا بلکہ خود انسان کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا ایک اہم ذریعہ ہوتا ہے۔ کام سے ہی انسان کو سچی خوشی، ذہنی سکون اور اس کی شخصیت کو توازن حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ تعلیمی اداروں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہئے کہ کام کرنے والے کا صرف روزگار ہی نہیں بلکہ پوری زندگی وابستہ ہو۔ وہ کام کو صرف انجام ہی نہ دے بلکہ اس کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لے اور کام کے آگے بڑھنے کے لئے نئی نئی راہیں بھی تلاش کرے۔ تعلیمی ماحول بچے کی تخلیقی قوتوں کی پرداخت کا ذریعہ تو ہو ہی لیکن خود استاد کی تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کا سامان بھی مہیا کرے۔

اس موقعہ پر شاید ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ کیا واقعی جامعہ ملیہ کے تعلیمی ادارے ڈاکٹر صاحب کے تعلیمی خیالات کی عملی تعبیر بن سکے۔ اس سوال کا جواب اس منزل پر شاید

وقت سے کچھ پہلے ہے۔ ویسے بھی ہر کام جب پھیلتا ہے تو مختلف ہاتھوں میں بٹ جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ بنیادی تصورات ہر ایک کے ذہن میں اسی طرح واضح ہوں جیسے کام شروع کرنے والوں کے ذہن میں تھے۔ نت نئے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں، کچھ تو اندرونی حالات کے پیدا کردہ اور کچھ بیرونی اثرات کے نتیجہ ہیں۔ لیکن مسائل کا پیدا ہونا کسی کام کے آگے بڑھنے اور اس کی توسیع کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اپنی تمام ترکاوشوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ کے تعلیمی ماحول سے پوری طرح کبھی مطمئن نہ تھے۔ بلکہ بعض مسائل و حالات کے سلسلہ میں ان کو تشویش بھی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تعلیم کا کام کرنے والوں کو مایوسی زیب نہیں دیتی۔ تعلیم کا کام بڑے صبر اور پتہ ماری کا کام ہے اور اس میں آخر وقت تک لگے رہنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس کام کی اصل اہمیت یہی ہے کہ انھوں نے جامعہ ملیہ کی شکل میں ایک تعلیمی صلاحیت قوم کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ یہ صلاحیت آئندہ کیا رُخ اختیار کرے گی اس کا پیمانہ کوئی ایک شخصی زندگی نہیں بن سکتی۔ ہمارے ملک کی تعلیم کی تاریخ میں ڈاکٹر صاحب کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے یہ بہت ہے کہ انھوں نے ایک اہم تعلیمی تجربہ کی ابتدا کی۔ ایک ایسے تجربے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بے وقف کیا جس میں ملک کے تعلیمی نظام کے لئے ایک اہم تحریک بننے کی پوری صلاحیت ہو۔

> اُردو زبان میں کاروبار انجام دینے میں ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ اُردو کا تربیت یافتہ عملہ کمیاب ہے۔ اور مشکل سے ملتا ہے۔ یہ دِقت صرف رواج نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جیسے جیسے طلب میں اضافہ ہوگا ویسے ویسے رسد بھی بڑھتی جائے گی۔ ہر شخص اپنا مافی الضمیر اپنی زبان میں غیر زبان کی نسبت بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ اور یہ توقع کہ اُردو کے چلن کے بعد عملہ کی کارکردگی بحیثیت مجموعی۔ بہتر ہو جائے گی بے جا نہیں ہے۔
>
> محمود حسین

ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی

علمی دلچسپی اور تنظیمی صلاحیتوں کی ایک مثال

ڈاکٹر محمود حسین ایک باوقار اور قابلِ احترام شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کئی طرح کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ تاریخ کے صرف استاد نہ تھے، بلکہ تاریخ اور فنِ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تعلیم اور علمِ کتب خانہ کے باب میں بھی انہوں نے بہت غور و خوض کیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے مقالات اور کتابیں ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اپنے مخصوص مضمون تاریخ سے قطع نظر انھیں دوسرے علوم و فنون سے بھی گہری دلچسپی تھی اور اسی لئے وہ ہر قسم کے علمی و ثقافتی اجتماعات میں بڑی خوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ خواہ وہ سائنس کی کانفرنس ہو یا اردو کی، کلاسکس سے متعلق ہو یا علومِ جدیدہ سے وہ اس میں جو کچھ کہتے یا پڑھتے تھے وہ خاصے کی چیز ہوتی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ انسان کی تاریخی اور تہذیبی زندگی پر ان کی نظر وسعت بھی رکھتی ہے اور گہرائی بھی۔ لیکن ان کی خالص علمی و ادبی کاوشوں اور شخصیت کی دلاویزیوں کا ذکر اس جگہ نہ کروں گا اس لئے کہ یہ سب کی نظر میں ہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک خاص پہلو کا، جسے میں نے انکے ساتھ شعبے میں اور شعبے سے باہر رہ کر محسوس کیا ہے۔ ذکر ضرور کروں گا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین جیسے فکر و دانش کے مالک اور صبح سے شام تک مصروف رہنے والے لوگوں میں تنظیم و قیادت کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ فطری مسائل میں ان کی نظر گہری اور وسیع ہوتی ہے لیکن عملی میدان میں انھیں عموماً کامیابی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اس قسم کی کمزوری سے مبرا تھی۔ وہ ایک ممتاز مورخ و دانشور بھی تھے اور ایک بلند پایہ منتظم و منتظم بھی۔ عہدِ وزارت سے لے کر جامعہ ملیہ کے قیام تک ان کی تنظیمی صلاحیتوں اور عملی سرگرمیوں کی بہت سی

مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن میں اس جگہ صرف ایک تازہ مثال سے اپنی بات واضح کروں گا کہ یہ
ان کے آخری ایام اور ضعیف العمری سے تعلق رکھتی ہے اور ہمارے لئے سبق آموز ہے
ڈاکٹر صاحب کی وفات سے صرف تین چار ہفتے پہلے کی بات ہے۔ حکومت سندھ نے
بعض سندھی تاریخ و ثقافت کے محققین و ماہرین کی ایما پر ایک بین الاقوامی سیمینار "سندھ
صدیوں کے آئینے میں" کی تجویز پر غور و خوض شروع کیا۔ متوقع اور غیر متوقع مشکلات
کے پیش نظر اس قسم کی کانفرنس کے طریق کار، اسکے مختلف النوع پہلو اور اس کے مالیاتی اور تنظیمی
مسائل اور اس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر نہ آتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں صوبائی
وزیر تعلیم کی سرکردگی میں ایک ابتدائی مشاورتی اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں دیگر اصحاب
رائے کے علاوہ ڈاکٹر محمود حسین سرفہرست تھے اور اس ضمن میں یہ امر واقع ہے کہ جہاں ایک
طرف وزیر تعلیم اور دیگر ارباب بست و کشاد کا عزم کارفرما تھا۔ وہاں دوسری طرف مجالس مشاورت
کے بعض شرکا، بالخصوص ڈاکٹر محمود حسین غیر معمولی دلچسپی ان کی وسیع انتظامی صلاحیت اور ان کا
بین الاقوامی علمی اور ادبی حلقوں سے وہ تعلق تھا جس کے باعث کانفرنس کے انعقاد کی
تجویز منظور ہوئی۔ اور ایک تنظیمی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، ڈاکٹر صاحب اس کمیٹی کے اہم رکن
تھے۔ اس کے تحت چار ذیلی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ ان میں سب سے اہم مقالاتی کمیٹی
(Subject Committee) تھی جس کی سربراہی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب موزوں
ترین تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کو اپنا شریک کار
بنایا اور کراچی یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ سندھ یونیورسٹی کو بھی اس کانفرنس کے میزبانوں
میں شامل کر لیا گیا۔

بین الاقوامی کانفرنسوں کے سلسلے کے اقدامات عموماً دو تین سال پیشتر شروع کئے جاتے ہیں وجہ یہ ہے
کہ علمی و ادبی تحقیقی و تدریسی اداروں اور جامعات وغیرہ سے خط و کتابت اور ماہرین کی نامزدگی
و شرکت اور تحقیقی مقالات کی تیاری کیلئے خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ اگرچہ مقامی طور پر انتظامی
مراحل بھی خاصے دشوار گذار ہوتے ہیں۔ مگر یہ مختصر عرصے میں بھی ممکن العمل ہو جاتے ہیں۔
حالانکہ اول الذکر مراحل میں عجلت سے کام لینے میں اس کی بین الاقوامی صلاحیت متاثر ہوتی ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سلسلے میں خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اور بیشتر غیر ملکی ماہرین سے ذاتی واقفیت کی بنا پہ کانفرنس چند ماہ کے اندر منعقد کرانے کی تجویز سے اتفاق کیا۔ میں چونکہ Subject Committee کا ایک رکن تھا اس لئے مجھے اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی حسن کارکردگی اور پیچیدہ اور الجھے مسائل کو بآسانی حل کرنے کی صلاحیت کا بخوبی علم ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ انھوں نے ہر مسئلہ کو کچھ اس طرح حل کر دیا کہ کسی منزل میں کوئی الجھن پیدا نہ ہوئی اور مسئلہ کو مسئلہ بننے ہی دیا۔ کمیٹی کے اراکین نے جن غیر ملکی ماہرین کے نام پیش کئے ان میں بیشتر وہ تھے جن سے ڈاکٹر صاحب ذاتی طور پہ واقف تھے اور جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ، ایران، ترکی، ہالینڈ، وغیرہ میں اپنے لکچروں کے دوران اور کانفرنسوں میں شرکت کے موقعوں پہ علمی رابطہ قائم کر چکے تھے۔

چونکہ یہ کانفرنس ایک سیمینار (مذاکرہ) کی صورت میں منعقد کی جا رہی تھی اور اس کا موضوع خاص سندھ کی تاریخ و ثقافت تھی۔ اس لئے اس میں شرکت کے دعوت نامے ایک محدود پیمانے پر صرف ان منتخب ملکی و غیر ملکی ماہرین کو جاری کئے جاتے تھے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ انصاف کر سکتے ہوں، شرکاء کے ناموں کی تجویز کے ساتھ ساتھ انکے لئے موضوعات کا تعین بھی کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے شرکاء کے انتخاب میں نہ صرف راہنمائی کی بلکہ ان کے لئے موضوعات کا تعین بھی بیشتر انھوں نے خود ہی کیا اور قلیل عرصے میں ان سے مقالات تیار کرانے کی ذمہ داری بھی لے لی۔ اس مذاکرے کی کامیابی کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانفرنس میں تقریباً ستر غیر ملکی اور ۱۲۰ ملکی ماہرین نے شرکت کی اور اعلیٰ معیار کے مقالے پیش کئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب جامعہ کی بیش از بیش مصروفیات اور دیگر علمی اور ادبی مشاغل کے باوجود کانفرنس سے متعلق جملہ امور کچھ اس طرح انجام دیتے رہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کسی زائد از کار ذمہ داری کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ نہ انہیں اس کام کے کرنے کے لئے کوئی عملہ بھی نہیں دیا گیا تھا جیسا کہ اس طرح کی کانفرنسوں میں عام طور پہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے کانفرنس کا وقت قریب

آتا گیا اور مقالات اور مضامین کے مسودے اور خلاصے موصول ہوتے رہے۔ انکے
سیکریٹری صاحب اور ان کے معاون ممتاز صاحب ڈاکٹر صاحب کی ہدایت اور نگرانی میں
کمپیوٹر کے مانند ترتیب وار فہرست مرتب کر کے جملہ اراکین کو ارسال کرتے رہے تاریخ
آثار قدیمہ، ادبیات و لسانیات، فلسفہ، مذہب، جدید تاریخ اور سیاسیات کے
کے سیکشنوں کے چیرمین اور سکریٹری مقرر کئے جا چکے تھے۔ ان سب کو جداگانہ فہرستیں
مہیا کرنا اور نقلیں فراہم کرنے کا کام کچھ اس حسن و خوبی سے انجام پایا کہ اس میں کسی قسم کی
الجھن (جیسا کہ بڑی کانفرنسوں میں عموماً ہوتا ہے) نہ ہونے پائی اور کانفرنس کے شروع
ہوتے ہی تمام سیکشنوں کے اجلاس ایک خودکار نظام کے طور پر منعقد ہوتے رہے، میں
تاریخ کے سیکشن کا سکریٹری تھا اس میں مقالات کی تعداد سب سے زیادہ تھی نتیجۃً
اس کے اجلاس کانفرنس کے چاروں دن دو سکشنوں کے ساتھ ہوتے رہے۔ مجھے اس کا
بخوبی اندازہ ہے کہ اس قسم کی بڑی کانفرنسوں میں سکشنوں کی تنظیم اور مقالات کی ترتیب
میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کے تحت یہ کس حسن و خوبی
سے انجام پاگئیں۔ کانفرنسوں کا آغاز بہت گہما گہمی کے ساتھ ہوتا۔ ایک طرف افتتاحی اجلاس
کی تیاریاں اور دوسری مہمان شرکاء کی آمد کا سلسلہ اور ان کی رہائش وغیرہ کے انتظامات پر کارکن اپنے
متعلقہ کاموں میں مشغول مگر جن دو اشخاص پر جملہ امور کی نگرانی کا بوجھ تھا وہ ایک وزیر تعلیم
اور دوسرے ڈاکٹر محمود حسین وزیر تعلیم جوان ہیں اور ڈاکٹر صاحب بوڑھے تھے۔ اس کے باوجود
ان کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہیں دیکھے گئے بلکہ اعتماد اور طمانیت
کی جھلک ترشح تھی ان کا معمول علی الصباح سب سے پہلے جلسہ گاہ پہنچکر انتظامات کی نگرانی کرنا تھا
اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان ذمہ داریوں کے علاوہ خود جدید تاریخ
کے سکشن کے صدر بھی تھے۔ میں نے انہی دنوں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ کیا انھوں
نے ان دنوں جامعہ کے امور کی نگرانی کسی کے سپرد کردی ہے مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب
انھوں نے بتایا کہ وہ ان مصروفیتوں کے باوجود موقع نکال کر ایک آدھ چکر جامعہ کا بھی لگالیتے
ہیں اور ٹیلیفون کے ذریعہ تو رابطہ بہرحال قائم ہی رہتا ہے۔ مصروفیت کچھ ایسی تھی کہ

ان کا ایک قدم وزارت میں تو دوسرا کانفرنس میں اور دیگر سرکاری میٹنگ اور جلسوں کی صدارت الگ۔ ہر دو کانفرنس میں ہمہ تن اس قدر ضم تھے کہ تمام غیر ضروری جزئیات جیسے لنچ، ڈنر، عصرانہ وغیرہ میں شرکت کو بھی اسی قدر اہم سمجھتے تھے جس قدر اجلاس میں شرکت کو۔

کانفرنس کے آخری دن ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا یعنی وزیر تعلیم اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو وفاقی وزیر تعلیم کی طلبی پر فوراً اسلام آباد جانا پڑا، اگرچہ کانفرنس کے آخری مراحل مکمل کرنا ان کا اخلاقی فریضہ تھا تاہم اسلام آباد کی میٹنگ میں حاضری ضروری تھی۔ چنانچہ کانفرنس کے پروگرام میں مختصر سی رد و بدل کر کے دونوں رات کو اسلام آباد چلے گئے۔ اس میں لطیفہ کی یہ بات ہے کہ اسی رات وزیر تعلیم کے یہاں کانفرنس کے مندوبین کیلئے الوداعی ڈنر تھا جس میں میزبان کی عدم موجودگی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

کانفرسوں کے اجلاسوں کے بعد دوسرے دن غیر ملکی مندوبین کو موہنجوداڑو لے جایا گیا اس کے اگلے دن تمام مندوبین کے لئے حیدرآباد، بھٹ شاہ اور ہالہ کی سیر کے پروگرام تھے اس موقع پر میری حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب علی الصباح مندوبین کے ساتھ حیدرآباد کے سفر میں موجود تھے حالانکہ رات گئے دیر سے اسلام آباد سے کراچی واپس پہنچے تھے، اتفاق سے ڈاکٹر صاحب ایک ہی گاڑی میں تمام دن میرے ساتھ رہے۔ مگر تقریباً چار سو میل کا سفر کرنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کے آثار نہیں تھے۔ حالانکہ جیسا کہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ جامعہ کی مسائل اور الجھنوں کے باعث دو ایک ماہ سے ڈاکٹر صاحب کی صحت گرتی جارہی تھی اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت میں اور ڈاکٹر صاحب کے آخری دن میں کوئی زیادہ فاصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا ...... گرمی کے ایام میں سندھ کے اندرونی علاقوں میں مسلسل سفر یقیناً تکان کا باعث ہوتا ہے۔ اور میں خود بہت زیادہ متاثر تھا مگر ڈاکٹر صاحب کی لطیف گفتگو اور مسلسل دلجوئی کے سبب مجھے بھی سہارا مل گیا۔ ہماری گاڑی (VAN) میں ایک ماہر آثار قدیمہ، ایک ماہر لسانیات اور بعض دیگر خواتین شرکاء سفر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہر ایک سے وقفہ وقفہ کے بعد مخاطب ہوتے رہے اور اس طرح گفتگو کے موضوع بدلتے رہے اور سب لوگوں کو باتوں میں اس طرح مشغول رکھا کہ سب کا سفر

آسانی سے کٹ گیا۔ سفر کے آخری مراحل میں انھوں نے ایک آبادی کے قریب گاڑی رکوا کے ماوا لیا اور سب کو سوغات دی۔ اور یہ ان کی شفقت اور صحبت کی آخری نشانی بن گئی۔

کانفرنس کا اختتامی اجلاس ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں منتظمین اپنی فروگذاشت اور کوتاہیوں کا اعادہ کر کے شرکا اور مہمانوں سے معذرت طلبی کرتے ہیں۔ اور مندوبین کانفرنس کے انتظامات کی تعریف اور مقاصد کی کامیابی بیان کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں اپنی سابقہ روایات کے مطابق کسرِ نفسی کا اظہار کیا مگر جس پُر جوش اور بے ساختہ انداز میں ہر مندوب نے بلا استثنا خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کی شان میں مدح سرائی کی اس سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت اور مقام کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعض مندوب اس موضوع پر خاص طور پر ڈاکٹر صاحب اور وزیرِ تعلیم سے بغلگیر ہوئے بلکہ ایک مندوب نے تو وفورِ جذبات سے وہ تحائف جو ہر مندوب کو اس موقع پر پیش کئے گئے تھے (جس میں سندھ کی شہرت یافتہ اجرک بھی تھی) ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

سندھ "صدیوں کے آئینے میں" ایک مزید نقش ثبت کر گیا۔ کانفرنس ختم ہو گئی۔ مندوبین اپنے اپنے ملک واپس چلے گئے۔ ہر ایک مندوب نے شاید اپنی پہلی فرصت میں ہی ڈاکٹر صاحب کو اور ساتھ وزیرِ تعلیم کو شکریہ کا خط ارسال کیا ہو گا۔ یہ بات میں وثوق سے اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ جن مندوبین سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں ان کے جو خطوط میرے پاس آئے ان میں ڈاکٹر صاحب کے شغف و پذیرائی کا خاص طور پر ذکر تھا۔

مگر انھیں کیا معلوم کہ ایک فرض شناس شخص فرض کی ادائیگی میں اپنے کو فنا کر چکا ہے اور ان کے خطوط، اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔

منیر فاروقی

ڈاکٹر محمود حسین بہ حیثیت منتظم

ڈاکٹر محمود حسین ایک عظیم انسان تھے - اس پر سب متفق ہیں - ڈاکٹر صاحب ایک منتظم بھی تھے اس پر شاید سب متفق نہ ہوں ویسے تو انتظامی امور ہوتے ہی ایسے ہیں کہ پیغمبروں سے لے کر دنیا کی دوسری عظیم شخصیتوں تک کے بارے میں بھی اختلاف رائے رہا ہے پھر ڈاکٹر صاحب ہی اس سے کیوں مستثنیٰ رہیں - لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان معدودے چند منتظمین میں سے تھے جن کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور حق و انصاف پر مبنی فیصلوں سے بہت کم لوگوں کو شکایت کا موقع ملا ہے -

ڈاکٹر صاحب نائب وزیر اور بعد ازاں کابینہ کے وزیر رہے ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انہوں نے جامعہ ملیہ جیسا عظیم تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا وہ ملک کے مختلف علمی اور ثقافتی اداروں و انجمنوں کے عملی نگراں بھی رہے اور کراچی یونیورسٹی جیسی عظیم درسگاہ کے وائس چانسلر بھی بنے وہ جس عہدے سے بھی وابستہ رہے صرف عہدے کی خاطر وابستہ نہیں رہے ان کی وابستگیاں بہت گہری مثبت اور تعمیری تھیں ان کی اپنی فاعلانہ شخصیت کی گہری چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے اور یہ ایسی چھاپ ہے جس میں خوشبو ہے البتہ قوت شامہ کی کمی ہو تو شاید محسوس نہ ہو - یونیورسٹی میں اندرونی سطح کی حد تک اختلافات ہوں تو ہوں یونیورسٹی سے باہر ڈاکٹر صاحب کا [illegible] ہمیشہ قابل رشک ہی رہا یہ کراچی یونیورسٹی کی خوش بختی تھی کہ اس کو ڈاکٹر محمود حسین جیسا وائس چانسلر بھی نصیب ہوا جس نے اس ادارے کے تحفظ و تقدس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی - انہوں نے اس جامعہ کا وقار اور اعتبار نہ صرف قائم رکھا بلکہ بلند کر دکھایا -

انتظامی امور کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ ایک جمہوری فلسفہ تھا وہ آمرانہ یا بور ژوائی مزاج کے خلاف جمہوری مزاج رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے یونیورسٹی کے بعض مسائل کے

بارے میں مشاورتی کمیٹیاں مقرر کی تھیں جو یونیورسٹی کی انتہائی ممتاز اور تجربہ کار شخصیتوں پر مشتمل ہوتی تھیں ان کمیٹیوں کے ذریعے انتظامی امور کے بارے میں جو فیصلے ہوتے تھے ان میں Red Tape (سرخ فیتہ) کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا تھا۔ یہ کمیٹیاں چونکہ ہر مکتبۂ فکر کے با اثر افراد پر مشتمل ہوتی تھیں اس لیے ڈاکٹر صاحب ان کے فیصلوں کو ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے فیصلوں کو اپنا فیصلہ قرار دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جامعہ کے دوسرے ذمہ دار عہدہ داران کی رائے کو بھی خواہ وہ ڈین ہوں یا شعبہ جاتی سربراہ وہ عام طور پر اپنا فیصلہ ان پر کبھی مسلط نہیں کرتے تھے اور توقع کرتے تھے کہ ان حضرات کو بھی اس یونیورسٹی کا مفاد اتنا ہی عزیز ہے جتنا کہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا اور یہ کہ ان سب کے فیصلے بدنیتی پر مبنی نہیں ہوں گے البتہ ایک واضح لائحہ عمل رکھنے والے روشن خیال منتظم کی حیثیت سے وہ برملا اپنی صائب رائے بہت صاف الفاظ میں ظاہر بھی کر دیتے تھے منتظمین عام طور پر کانوں کے کچے ہوتے ہیں اور غیبت پسند کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب غیبت اور چغلی یا تو مذاق میں اڑا دیتے تھے یا پھر رو در رو صفائی کرا دیتے تھے ایک بار ایک افسر نے دوسرے افسر کی برائی کرنی شروع کی ڈاکٹر صاحب نے ان افسر کو اپنے سامنے بٹھالیا اور جس کی برائی کر رہے تھے اس کو بھی بلا بھیجا اب چغلخور کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھے بہانہ کر کے نکل جانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے بہ اصرار انہیں بٹھائے رکھا تا آنکہ دوسرے افسر بھی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے اس بات کو دہرایا اس کے بعد پہلے افسر صاحب نے کبھی پھر کسی کی چغلی نہیں کھائی ڈاکٹر صاحب اپنے ہر انتظامی کارکن کو برابر کا درجہ دیتے تھے اور برابر کی اہمیت بخشتے تھے البتہ ایک کے کام میں دوسرے کی بیجا مداخلت پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح ان کے خیال میں کام کرنے والا اپنا کام اطمینان بخش طور پر نہیں کر سکتا۔ وہ دفتری گروہ بندی یا Pressure Tactics یا بے اصولی بات کو ہمیشہ حقارت سے دیکھتے تھے لیکن مستحق کو اس کا حق بغیر کسی سفارش بغیر کسی تاخیر کے دلانا اپنا فرض سمجھتے وہ دفتری فیصلے کسی مصلحت کے بغیر اور پوری دیانتداری سے کرتے تھے لیکن کسی کے خلاف کوئی کارروائی ہو رہی ہو تو جلد بازی سے ہمیشہ بچتے تھے اور متعلقہ دفتر کو پھر سے غور و فکر کا موقع دیتے تھے تاکہ کوئی بے قصور نہ مارا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک منتظم دراصل پہلے انسان ہوتا ہے اور بعد میں منتظم لیکن انسان جو کھرا ہو

جو کسی مصلحت کا شکار ہو کر رہ گیا ہو جو کھرے انسان کی طرح کھرے اور صاف ستھرے فیصلے کرنا جانتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب دفتری اوقات کی نہ صرف پابندی کرتے تھے بلکہ ایک ایک لمحہ کا صحیح استعمال ضروری سمجھتے تھے صبح پونے نو بجے کے قریب ان کی گاڑی یونیورسٹی کے رہائشی علاقے سے بچوں کے اسکول میں شاہد کو چھوڑتے ہوئے گذرتی تھی اور راستے میں یونیورسٹی کا جو بھی سٹاف رکن ملتا ڈاکٹر صاحب اسے بٹھاتے آتے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ چوکیدار ہو یا چپراسی سب کو سلام کرتے لفٹ میں داخل ہوتے تھے اور لفٹ میں ان کے ساتھ ہر شخص اوپر جا سکتا تھا۔ اپنے دفتر میں بیٹھتے ہی وہ پورے طور پر مصروف ہو جاتے تھے اور فائلوں پر اپنے احکامات دیتے جاتے تھے وہ فائل کا ایک ایک لفظ پڑھ کر فیصلہ دیتے تھے اس دوران میں اگر کسی افسر سے بات کرنا ہوتی تو اس کو بھی بلوا بھیجتے اور اس سے بھی ضروری بات کر لیتے اس میں یہ خیال نہیں رکھتے تھے کہ ان کے پاس کچھ ملاقاتی بیٹھے ہیں اپنی بات پوری توجہ سے کرتے تھے مثلاً اپنے کمرہ کے ایک حصے میں جہاں میٹنگ ہوتی ہیں انہوں نے مجھے بلوا کر کہا کہ اس میز میں ایک فٹ لمبائی ہوتی ہے اور دو کرسیوں کا اضافہ کرنا ہے یہ بات بتلانے کے لئے وہ اٹھ کر آئے اور ان کے ساتھ مہمانوں کو بھی آنا پڑا لیکن فوراً ہی بات سمجھا کر اپنے مہمانوں کو لیکر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور فائلیں بھی دیکھتے رہے اور مہمانوں کی ضروری بات کا بھی جواب دیتے رہے وہ اپنے دفتر میں بات کو مختصراً اور To The Point کرنے کے عادی تھے۔ دفتر سے وہ عام طور پر ڈیڑھ بجے اٹھ جاتے تھے اور اس دوران میں سارا کام نمٹا لیتے تھے بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ انہوں نے روز کا کام روز ہی نہ نمٹایا ہو ان کے دفتر میں بیٹھنے سے دفتر کا وقار اور بھرم قائم رہتا تھا دفتر سے باہر وہ یقیناً خوش گپیاں، لطیفے اور یارباشی کو بھی نباہتے تھے لیکن دفتر میں ان کا انداز بہت ہی نپا تلا اور ایک صحیح منتظم کا رہتا تھا وہ پابندیِ اوقات اور پابندیِ کام کے شدت سے قائل تھے۔

ڈاکٹر صاحب صرف ایسے منتظم ہی نہ تھے جو ایک رواں نہر کے پانی کی منصفانہ تقسیم کرواتے ہوں تاکہ ہر کھیت کو مناسب پانی مہیا ہوتا رہے اور صحیح کھیتی باڑی ہوتی رہے بلکہ ایک نئی نہر بھی قائم کرنا جانتے تھے ایک ایسی نہر جس میں کبھی پانی کی تقسیم پر تکرار کا موقع نہ ملے اس کی سب سے

بڑی مثال جامعہ ملیہ ملیر کا قیام ہے اس کے قیام میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی جن تعمیری اور تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ان کو دیکھ کر بے ساختہ اقبال کے الفاظ دہرانے پڑتے ہیں ؎

سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

جامعہ ملیہ جیسے عظیم تعلیمی ادارے کا قیام اور اس کا خوب صورت انتظام پاکستان کی تعلیمی دنیا میں ہمیشہ ایک یادگار مثال کے طور پر گنا جاتا رہے گا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو تخلیقی منتظم کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے یعنی ایک ایسا منتظم جو روایتی منتظم سے الگ اور اس سے بڑا ہو جو صرف اس پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے کہ ایک ادارے کا اسے کنٹرول کرنا ہے بلکہ یہ کہ اسے ایک ادارہ تخلیق بھی کرنا ہے تخلیقی منتظم روایتی منتظم سے اس لیے بھی بڑا ہوتا ہے کہ اسے صرف کسی چیز کو باقی رکھنا ہی نہیں بلکہ اس میں مسلسل اضافے کرتے رہنا بھی ہے اور یہی زندگی کا اصل نظریہ ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں ساحل پر بیٹھے ہوئے اشارے دینے والے منتظم سے الگ ایسے میر کارواں نظر آئیں گے جو پانی میں تو خود بھی تیرتا ہوا اور باقی تیراکوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہوا اور خشکی میں ہو تو اہل کارواں کو ہنستے ہنساتے خوش مزاجی بخش کر قدم سے قدم ملاتے ہوئے ایک خوش آئند منزل کی طرف لے جاتا رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے اقبال کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

جمال الدین افغانی نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں وطن ہی سے نہیں کئی اسلامی ممالک سے نکالے گئے اور آخر میں بحالت نظر بندی ترکی میں ان کا انتقال ہوا ۔ مگر اس دھن کے پکے انسان کو کوئی مصیبت اور کوئی تکلیف اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکی ۔ ایسے ہی لوگ نہ صرف تاریخ میں یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ تاریخ ساز کہلاتے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمود حسین

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ہمدرد بھی منصف بھی

اپنی ناول "دل کے آئینے میں" میں نے جن حضرات کا کراچی یونیورسٹی کے حالات کے سلسلے میں ذکر کیا ہے ان میں نمایاں ترین ڈاکٹر صاحب محمود حسین خاں ہیں۔ میرا یونیورسٹی سے ایک جھگڑا چلا تھا جس میں میں اپنی ہٹ پر جما رہا۔ یہ جھگڑا اس وقت ہوا تھا جب ڈاکٹر موصوف امریکہ میں تھے اور جب وہ واپس آئے اور میں نے یہ دیکھا کہ وہ مخالفین کی طرف ہو گئے تو میں نے شیکسپیر کے "جولیس سیزر" کا یہ جملہ یاد کیا۔

THOU Too ART BRUTUS So FALL CEASAR

اور سارے معاملے سے دست بردار ہو گیا۔ سیزر کی طرح میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ جو میرے لیے بروٹس کی طرح تھے میرے مخالف ہوں گے۔ مگر جیسے بروٹس کو اپنا مخالف دیکھ کر سیزر یہ مان گیا کہ وہ ضرور غلطی پر تھا اسی طرح محمود حسین خاں کو اپنا مخالف پاکر میں نے بھی مان لیا کہ میں غلط راہ پر ہوں۔ بروٹس ان لوگوں میں تھا جس کی موت پر اس کے دشمن انتھونی نے کہا تھا " یہی ایک شخص تھا جو ذاتی درجہ سے بالاتر ہو کر پبلک کی بھلائی کے لیے لڑا۔" اسے سب ہی لوگ انصاف کی راہ پر اٹل مانتے تھے۔ میں نے بھی دیکھا کہ محمود حسین خاں پورے طور پر غیر جانب دار تھے اور ان کی مخالفت کو حق بجانب مان لینے میں مجھے کوئی دیر نہ لگی۔ ان کی ہستی کا مجموعی تاثر میرے ذہن پر یہ ہے کہ عام طور پر وہ کسی کی طرفداری یا مخالفت نہیں کرتے تھے۔ مرنجاں مرنج تھے مگر حق و انصاف کا سوال آجائے تو وہ حق کی پیروی میں سخت ہو جاتے تھے۔

کراچی یونیورسٹی میں میرا سارا قصہ ان ہی سے شروع ہوتا ہے اور ان ہی پر ختم ہوتا ہے سنہ ۱۹۵۰ء میں میں ملازمت کی تلاش میں کراچی آیا۔ میرے عزیز ڈاکٹر مظاہرالدین فاروقی ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ کے معالج تھے۔ وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے اخلاق سے

ملے ۔ مجھے ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین بھی یاد آئے جن کا اخلاق بھی نہایت وسیع تھا اور وہ بھی نہایت خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے ۔ میں نے اپنے ارادہ کا اظہار کیا ۔ انھوں نے کہا "ہمارے یہاں شعبہ انگریزی کھلنا چاہیئے ۔ آئندہ سال اشتہار ہوگا" میں آپ کی مدد کروں گا" میں لکھنؤ واپس گیا اور ۱۹۵۵ء کی مئی میں اخبار میں کراچی یونیورسٹی کا اشتہار دیکھ کر ۱۱ جون کو کراچی آگیا ۔ ایک یا دو دن کے بعد ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا ۔ اشتہار کا ذکر کیا ۔ اپنی عرضی دکھائی ۔ انہوں نے کہا "عرضی دفتر میں دیدیجئے ۔ سلیکشن کمیٹی میں میں دیکھ لوں گا ۔ میں ٹھیرا رہا ۔ اگست کے شروع میں میں سلیکشن کمیٹی کے سامنے پیش ہوا ۔ اور ممبروں نے بھی مجھ سے سوالات کیے محمود حسین خاں نے کچھ اس جذبہ کے ساتھ مجھ سے بات چیت کی کہ مجھ پر ہی نہیں بلکہ کمیٹی کے تمام ممبروں پر یہ روشن ہوگیا کہ مجھے لینا چاہتے ہیں ۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تقرر کو ملتوا میں ڈالنا چاہتے تھے مگر محمود حسین خاں نے زور کے ساتھ کہا اگر آپ شعبہ انگریزی کھولنا چاہتے ہیں تو یہ ایک مناسب آدمی ہیں انہیں لے لیجئے" محمود حسین خاں زیادہ تر غیر جانب دار رہا کرتے تھے مگر جب وہ کسی کی طرفداری کرتے تو کمیٹی رعب میں آجاتی اور ان کی بات مان لیتی ۔ چنانچہ ان کی بات مانی گئی اور میرا تقرر ہوگیا ۔ میں مانتا ہوں کہ وہ ہی مجھے رکھوانے کے باعث ہوئے ۔

وہ اس وقت ڈین فیکلٹی آف آرٹس تھے اور ایک سال میں ان کے ماتحت انچارج شعبہ انگریزی کی حیثیت سے کام کرتا رہا ان سے روز ہی ملاقات ہوتی اور ضروری ہدایات لیتا ۔ وہ برابر اسی خلوص کے ساتھ اور محبت سے پیش آتے رہے جو پہلے دن سے انہوں نے دکھائی تھی ۔ پھر وہ امریکہ چلے گئے اور ڈین حلیم صاحب کے بھانجے ڈاکٹر محمود احمد صاحب ہوگئے ۔ ان دوسرے ڈین سے میرا کوئی خاص ربط نہ تھا اور اب سید ابو نصر علی اشرف بنگال سے آکر صدر ہوگئے تھے اور میرا ڈین سے کوئی کام نہیں رہ گیا تھا ۔ اس وقت میں ایک کیس میں بھی پھنس گیا تھا جو سال بھر چلتا رہا اور جس کے نتیجے میں مجھے یونیورسٹی سے استعفیٰ دینا پڑا ۔ اس دوران میں میں برابر محمود حسین خاں کو یاد کرتا رہا مجھے یہ امید تھی کہ وہ میرے ساتھ انصاف ضرور کرتے اور ڈاکٹر محمود احمد صاحب کی طرح پرے جھاڑ کر الگ نہ ہو جاتے ۔ کیس ختم ہو چکا تھا جب محمود حسین خاں صاحب واپس آئے میں نے ان سے سارا حال بیان کیا ۔ انہیں بہت برا لگا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا ۔ مگر اب قصہ ہی ختم ہو چکا تھا اور وہ

کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک سال کے بعد جسٹس لاری مرحوم نے مجھے واپس بلانے کی تحریک کی تو میں محمود حسین خاں
کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد مان کر ان سے ملا۔ انہوں نے مدد کرنے کا ویسی ہی فراخ دلی سے وعدہ کیا جیسے
پہلے کیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں ہی نے میری مخالفت کی۔ میں ان سے ملا تو ان کے چہرہ کا رنگ اترا
ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ انہیں زبردستی کرنا پڑا اور ان کی میرے ساتھ ہمدردی میں
کوئی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے ہی کراچی یونیورسٹی کا سلسلہ شروع کیا تھا اور انہوں نے ہی ختم بھی کر دیا۔
اس عام معاملہ میں طرفداری اور مخالفت کے الفاظ استعمال کرنا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ
ذاتی درجہ پر بڑی مروت اور اخلاق کے انسان تھے مگر انتظامی معاملوں میں وہ قاعدے ہی پر چلتے تھے
ان کے اس متوازن عمل کو میں ایسا بڑا وصف سمجھا جو مجھے کسی اور ہستی میں نہ دکھائی دیا اور اس
لئے میں ان کو ان لوگوں میں گنتا ہوں جن کا کردار عظیم کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال وہ دوستی ہمدردی اور قاعدہ قانون میں صاف تمیز کر سکتے تھے اور یہ بات ہمارے
یہاں کسی شخص میں نہیں ہے۔ قاعدہ کی بات میں انہوں نے میری کاٹ ضرور کی مگر ہمدردی کی سطح پر
میرے اور ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اور وہ ایک ادارے میں ہی نہیں رہے مگر جب
کبھی ان سے ملاقات ہوئی وہ اپنی یکرنگی پر قائم نظر آئے۔ اخلاق سے ملنے کے علاوہ وہ میری
تصانیف میں برابر دلچسپی دکھاتے رہے۔ آخری ملاقات ۷۵ء میں ہوئی جب وہ مئی ۷۵ء میں
سائنس کانفرنس میں شریک ہونے یہاں آئے۔ وہ مجھ سے ملتے ہی میرے "انشائیے" کے انشائیوں کا ذکر
کرنے لگے اور معلوم ہوا کہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود وہ میرے
مضامین پڑھنے کا وقت نکال لیتے تھے۔ ادبی ذوق کا وہ ہمیشہ ثبوت دیتے رہے۔ ان کا خاص مضمون
تاریخ تھا اور انہوں نے تاریخی نقطۂ نظر سے پاکستان کی تحریک اور مسلمانوں کی کلچر پر جو مضامین
لکھے تھے انہیں میں نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انتظامی امور میں پھنسے ہونے
کے باوجود وہ علم و ادب میں اپنی دلچسپی کو قائم رکھ سکے۔ ان کا اس سلسلے میں ذوق داد کے قابل
ہے۔ ان کے دینی کردار میں بھی وہی توازن تھا جو اخلاقی کردار میں۔

ظاہری کردار میں ہر شخص مانتا ہے کہ وہ کسی قسم کے دکھاوے سے بہت دور تھے۔ انہیں
ہر شخص نے ہمیشہ معمولی شیروانی اور پائجامے میں دیکھا۔ وہ اپنی کار خود چلاتے رہے اور ہر درجہ کے

لوگوں کی دعوت قبول کرتے رہے۔ وہ وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور وائس چانسلر بھی پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی اور بعد میں کراچی یونیورسٹی کے مگر جب کسی بھی محفل میں آتے تو رعب اور شان کے بجائے دوستی اور مانوسیت کی فضا پھیل جاتی۔ معلوم ہوتا کہ ایسا شخص آگیا جو باوجود بڑا ہونے کے معمولی حیثیت سے رہنے کا عادی ہے اور معمولی لوگوں سے برابری کے ساتھ ملنے میں کوئی کسرشان نہیں محسوس کرتا۔ اس لیئے ان سے مل کر ہر شخص کی طبیعت خوش ہوتی۔ وہ ہر جگہ ہمدردی کی بارش کر جاتے اور ہر شخص ان سے مل کر بڑی فرحت محسوس کرتا۔ وہ دنیا کی تاریکی میں ایک شمع تھے جس کی نرم روشنی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی اور تاریکی میں راہ دکھاتی تھی۔ میں نے سنا کہ کراچی یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاکر ان کے ساتھ سخت بدتمیزی کی جس کے نتیجہ میں ان کے دل پر دورا پڑا اور وہ جان بحق تسلیم ہوگئے۔ ان کو زبردست دھکا ضرور لگا مگر اس پر بھی وہ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ کام کرتے ہوئے ہی ان کے دماغ پر اثر ہوا اور فالج گرا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ان کی موت کو بھی ایک طرح پر شہادت کہنا چاہیئے۔ وہ غلط لوگوں کی غلط مخالفت کے سامنے مستعدی سے کھڑے رہے یہاں تک کہ جسمانی قوی جواب دے گئے۔ آجکل عوام کا دور ہے اور طالب علم عوامی رویہ میں قدیم بادشاہوں کی طرح ظالم ہوگئے ہیں۔ اس ظلم کے خلاف استقلال سے کھڑے رہنے کی ایک مثال ڈاکٹر محمود حسین خاں دے گئے۔

SOME VILLAGE HAMPDEN WHO WITH DAUNTLESS BREAST ; THE LITTLE TYRANT OF HIS FIELD WITHSTOOD —

تعلیم سے متعلق لوگوں کی یہ خصوصی ذمہ داری اس بناء پر ہے کہ جب تک نظریاتی مملکت کا تصوّر قوم کی آئندہ نسل کی تربیت کرنے والوں کے ذہن و دل کی آماجگاہ نہیں بنتی ہماری تمام تر آرزوؤں کے باوجود نظریاتی مملکت کی عملی ترویج کے کوئی امکان پیدا نہیں ہوسکتے۔ ہم بغیر تعلیمی مساعی کے معاشرے کو وہ نظریاتی ڈھنگ نہیں دے سکتے جو ہماری تمناؤں کا محور ہے۔

محمود حسین

سید الطاف علی بریلوی

ایوان علم و ادب کی رونق

۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس محمد علی پارک کلکتہ میں ہوا۔ جناب اے۔ کے فضل الحق صاحب وزیراعلیٰ متحدہ بنگال صدر مجلس استقبالیہ اور جناب سید حسین شہید سہروردی سکریٹری تھے۔ برصغیر کے ممتاز ماہرین تعلیم اور مشاہیر ملت جمع ہوئے انہی میں ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بھی تھے۔ میری ان سے اس سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہو سکی تھی لیکن مسرت انگیز حیرت ہوئی کہ آمنا سامنا ہوتے ہی وہ مجھ سے انتہائی گرمجوشی اور اخلاق سے ملے اور پھر میں انھیں کبھی نہ بھولا۔

فروری ۱۹۶۲ء میں بمقام ڈھاکہ سہ روزہ بی۔ ڈی۔ کنونشن ہوا جس کے پہلے جلسہ کی رسم افتتاح فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے فرمائی اور چار دیگر اجلاسوں میں سے ایک اجلاس کی صدارت مجھ ناچیز کو بھی تفویض ہوئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ بی۔ ڈی۔ کنونشن میں تو وہ نہ آئے۔ البتہ ڈھاکہ سے کراچی واپسی کے وقت اتفاقاً میں اسی ہوائی جہاز کے لئے ہوائی اڈے پر آیا جس سے کہ ایوب خاں صاحب اور گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خاں صاحب مرحوم جانے والے تھے اس وقت شہر میں زبردست ہنگامہ تھا اور ہوائی اڈہ پہ بخیریت پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ اسی دار و گیر میں میں نے دیکھا کہ صدر پاکستان کو رخصت کرنے ڈاکٹر صاحب بھی ہانپتے کانپتے چلے آرہے ہیں۔ مڈبھیڑ ہوئی تو فرمانے لگے "آپ تو جا رہے ہیں ہم یہاں سے کیسے جائیں" میں نے عرض کیا گھبرایئے نہیں انشاءاللہ آپ بھی بہت جلد دارالامن کراچی آجائیں گے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرکزی وزیر تعلیم تھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں وزارتیں جلد جلد ٹوٹتی اور بنتی تھیں۔ اچانک اخبار میں پڑھا کہ ڈاکٹر صاحب کی وزارت ختم ہوگئی۔ پرسا دینے کلفٹن کے پل کے پاس کوٹھی پر گیا۔ عجب ہُو کا عالم تھا نہ پہرہ نہ چوکی اور نہ کسی قسم کی ہٹو بچو۔ غرب رُو یہ برآمدہ میں موصوف ایک صوفے پر خاموش لیٹے ہوئے تھے، میں حاضر ہوا تو اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے دریافت کیا کہ آئندہ کیا ارادہ ہے۔ فرمایا کہ "میں ٹیچر ہوں پڑھانا شروع کردوں گا"۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وہ انتہائی صبر و سکون کے ساتھ کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہوگئے۔ ساتھ کے ساتھ انھوں نے جامعہ تعلیم ملّی کی تعمیر و توسیع میں بھی اپنے جوش عمل کو تیز سے تیز تر کردیا۔ جامعہ مذکور میں دیکھتے ہی دیکھتے عمارتوں کا ایک جنگل کھڑا ہوگیا اور اس کی تقریبات میں جو آئے دن ہوتی رہتی تھیں جب بھی ڈاکٹر صاحب تقریر کرتے تو وہ نہایت مختصر اور صرف کام کی باتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ خود اپنی کارگزاری یا تعریف کبھی ان کی زبان سے سننے میں نہ آئی۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے بھی وہ نہ معلوم کیا کیا تھے۔ میں نے ان کے ایک تحقیقی مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ طنز لطیف کیا۔ اس کے بعد ملاقات ہوئی تو ذرا بھی شکوہ نہ کیا بلکہ صرف ایک معنیٰ خیز مسکراہٹ سے معاملہ رفع دفع کردیا۔ میں نے ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم کی بعض سیاسی پالیسیوں کے خلاف بھی قلبی احترام کے باوصف بہت کچھ لکھا لیکن وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے اور ہمیشہ خوش دلی اور خوش اخلاقی ہی سے شرفِ ملاقات بخشتے رہے۔

میں ڈاکٹر صاحب سے جب بھی کسی کام کی فرمائش کرتا تو بغیر کسی تحفظِ ذہنی اس کو اپنے امکان بھر کردیا کرتے تھے۔ جس کی ایک مثال عرض ہے کہ ابھی حال ہی میں جریدہ "ساغر" کراچی کی ۲۵ سالہ تقریب اشاعت ہوٹل گل بہار واقع آرٹس گیلری میں ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر صاحب

تھے ۔جلسہ کے بعد بات چیت کا موقع ملا تو میں نے عرض کیا کہ بی کام پارٹ ون کا نتیجہ بہت سخت نکلا ہے اور غضب یہ ہے کہ کافی لڑکے بعض مضامین میں صرف ایک ایک نمبر سے فیل کئے گئے ہیں فرمایا کہ انھیں گریس مارکس تو ملے ہوں گے اس کے بعد بھی اگر ایک نمبر کم رہ گیا تو کیا کیا جا سکتا ہے ۔ میں نے کہا کہ بحیثیت وائس چانسلر ایک "سپر گریس مارک" آپ دے دیجئے ۔اس پر ہنسنے لگے اور کہا کہ کاش مجھے یہ حق حاصل ہوتا ۔ بات رفت گزشت ہو گئی، لیکن ابھی تھوڑے دن ہوئے بی کام پارٹ ون کا نظر ثانی شدہ نتیجہ اخبار میں شائع ہوا اور کم و بیش دو سو لڑکے جو فیل ہو گئے تھے پاس ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام کیسے کرایا اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں لیکن میرے خیال میں یہ ان کی لاتعداد قابل قدر خدمات میں سے ایک ہے جو ان کے لئے ذریعۂ نجات آخرت بنے گی ۔

ڈاکٹر محمود حسین صاحب ۔ پروفیسر ابو بکر احمد حلیم صاحب اور ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کا تھوڑے ہی عرصہ میں یکے بعد دیگرے ہمیشہ کے لئے اس جہاں سے رخصت ہو جانا ایسا قومی اور ملی نقصان ہے کہ اس کی تلافی ناممکن ہے ۔ ان تینوں بزرگوں پر بہت تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے ، کاش مجھے یا کسی اور کو اس کی توفیق نصیب ہو ۔ سچ یہ ہے کہ ہماری تمام علمی اور ادبی مجلسیں ان کے بغیر سونی ہو گئیں اور ان کے نہ ہونے سے پاکستان غریب ہو گیا۔

> اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ مقامی زبانیں ختم کر دی جائیں ۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی ۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ملک کے مختلف حلقے ۔ زمان و مکان کی قید سے بلند ہو کر پاکستانی رشتے میں صرف اس لئے منسلک ہوئے ہیں کہ ان میں رشتۂ اسلام قائم ہے ۔ اسی طرح ہم اپنی اخوت کے اس رشتے کو اور مضبوط کریں اور ہماری یگانگت بڑھتی چلی جائے ۔ یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہماری ایک زبان ہو، ایک تمدن ہو ۔ ایک معاشرت ہو ۔ اس ہی میں پاکستان کی بقا مضمر ہے ۔ محمود حسین

جلیل قدوائی

رسمیات سے بالا انسان

جب ابتدائے ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر محمود حسین خاں مرکزی حکومت میں نائب وزیر دفاع ہو کر کراچی تشریف لائے تو میرے چچیرے بھائی ڈاکٹر مجید احمد نے جو اس وقت ڈھاکا یونیورسٹی میں نباتیات کے پروفیسر اور وہاں کی فیکلٹی آف سائنس کے ڈین تھے۔ مجھے خط لکھا کہ موصوف بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور میں اُن سے ضرور ملوں۔ یہ معلوم تھا کہ وہ ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں لہٰذا خیال ہوا اُن کی ذات میں اپنے بڑے بھائی کی سیرت کا پرتو

بھلا کچھ تو ہوگا جو سارا نہ ہوگا (حسرتؔ)

چنانچہ اُن سے تعلقات قائم ہونے کے بعد یہ خیال بہت حد تک صحیح نکلا۔ اس کے علاوہ اُن کے ذاتی جوہر بھی نمایاں ہوئے۔

اُن سے تعارف کیلئے مجھے مجید سلمہٗ کے وسیلے کی ضرورت نہیں ہوئی اس لئے کہ میں اُن دنوں نشر و اشاعت کے سلسلے میں وزارتِ دفاع ہی سے متعلق تھا۔ میں نے انہیں قومی خدمت کے جذبے سے سرشار اور فرائض کی ذمہ داریوں سے گرانبار ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا رسیا اور بڑا خوش وضع اور خوش اوقات آدمی پایا۔ اُن میں ایک عالم کا وقار تھا۔ شائستگی تھی، گرم جوشی تھی، انسانی ہمدردی تھی، پھرتی تھی اور بہت جلد غیر رسمی ربط ضبط پیدا کر لینے کے ایسے قابلِ قدر اوصاف تھے جو عموماً وزیر باتدبیر کی قسم کے انسانوں میں نہیں پائے جاتے سرکاری تعلقات قائم ہونے کے علاوہ اُن سے پرائیویٹ اور مخلی بالطبع ملاقاتیں ہونے لگیں اُن دنوں فضلی صاحب مشرقی پاکستان میں معتمد تعلیم تھے۔ وہ کراچی آتے تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرتے۔ ابھی میری طبیعت میں مشاعروں کی شرکت سے بیزاری نہیں پیدا ہوئی تھی

چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر یا جگر صاحب کی آمد پر میرے یہاں شعر و شاعری کی خاصی صحبتیں برپا ہو جایا کرتی تھیں۔

اسی دور کے دو ایک واقعات کسی طرح ذہن سے محو نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرے لڑکے منصور سلمہ کے غسلِ صحت کی تقریب تھی۔ خیال ہوا چند احباب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیں گے مجید لاہوری مرحوم نے اس موقع پر ایک مشاعرے کا کھڑاگ کھڑا کر دیا۔ طے ہوا کہ شعراء کو زحمتِ طعام و کلام دونوں دی جائیں اور سامعین کو کھانے کے کچھ بعد کا وقت صرف مشاعرے میں شرکت کے لئے دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو مشاعرے میں شرکت والا وقت دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی غیر رسمی اور بے تکلف طبیعت کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ مشاعرے سے بہت پہلے اُس وقت تشریف لے آئے جبکہ احباب کا مجمع ۔ ع

روزیٔ خود می خورد از خوانِ تو

کے عمل میں مصروف تھا۔ فرق اتنا تھا کہ روزی خوان کے بجائے میز پر چنی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی "السلام علیکم" کہا۔ پھر قدرے حیرت مگر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا۔

"اہا ہا ہا! یہاں تو کھڑا کھیل فرخ آبادی ہو رہا ہے۔ کیوں صاحب ہم نے کیا تصور کیا تھا؟" ان کے اس فقرے کی برجستگی کا سب نے بڑا لطف اٹھایا۔ ایک تو کھڑا کھانا یعنی بوفے تھا اس کی رعایت سے کھڑا کھیل دوسرے فرخ آبادی میں یہ لطف تھا کہ ڈاکٹر صاحب خود فرخ آباد (قصبہ قائم گنج) کے رہنے والے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ڈیڑھ دو بجے صبح تک شعر و سخن سے لطف اندوز ہوتے رہے اور اپنے قہقہوں اور داد و تحسین کے نعروں سے چھتیں اڑاتے رہے اس صحبت کی ایک تصویر میرے پاس یادگار ہے۔

اسی زمانے میں ایک نوجوان ایک بار میرے گھر پر آیا اور مجھے بتایا کہ وہ علی گڑھ میں میرا طالبعلم تھا۔ میں نے پہچان لیا۔

معلوم ہوا وہ محکمۂ دفاع میں سولین گزیٹیڈ افسر کی اسامیوں میں سے ایک کا امیدوار تھا کمیشن میں معاملہ بعد کو بھیجا جائیگا اس وقت عارضی انتخاب محکمہ جاتی طور پر ہو رہا تھا فہرست میں اس کا نمبر آخری یعنی دسواں تھا مگر دفتری جوڑ توڑ یا کسی سازش کی زد میں آگیا تو رہ جائے گا چاہتا تھا کہ میں اسے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جاکر زبانی بات چیت کرلوں میں نے سوچنے کے بعد جواب دینے کا وعدہ کرلیا۔ مگر وہ مصر ہوا کہ اسی وقت چلا جائے اس لئے کہ مسل ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ چکی تھی اور وہی تقرر کے مجاز تھے۔

وہ اسی وقت سواری لے آیا کوئی ڈھائی تین بجے دن کا وقت تھا۔ ہم کوٹھی پر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کے پی اے نے بتایا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہے ہیں انتظار کرنا ہوگا۔ ہم لوگ گول کمرے میں بیٹھے۔ میں نے پی اے سے کہا "تم کمرے میں جاکر اتنا دیکھ لو کہ سو تو نہیں رہے ہیں اگر سو رہے ہیں تو ہم انتظار کریں گے، ورنہ میرے آنے کی خبر کردو۔" ــــ صاحب میں کیا کہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے توجہ اور تلطف کی حد کردی اُن کے آرام کرنے کا کرہ گول کمرے سے ملا ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ پی اے اُن کے پاس جائے میری آواز سن کر وہ کرنے پاجامے میں بغیر کسی رسمی تکلف کے "السلام علیکم" کہتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ مجھ سے نہایت خندہ پیشانی سے پوچھا۔ "کہیے، خیر تو ہے کیسے تکلیف فرمائی" میں نے اس جوان سے ان کا تعارف کراکے سارا معاملہ ان کے گوش گزار کیا تو فرمایا "میرا واسطہ بھی تو معلمی سے ہے۔ شاگرد کی مدد کرنا تو استاد کا فرض ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا چلے آئے" اُس کے بعد اُس لڑکے سے کچھ سوالات لئے اور مطمئن ہونے کے بعد بولے "میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ فہرست میں اگر ان کا نمبر دسواں ہے تو گیارہواں نہ ہونے پائے گا۔"

ہم دونوں ان کا شکریہ ادا کرکے اسی وقت وہاں سے چلے آئے۔

کوئی ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ صاحبزادے خوش خوش چلے آرہے ہیں ان کا

کام ہو گیا تھا۔ انہوں نے انتہائی عقیدت کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر میں نے انہیں منع کر دیا۔ معلوم نہیں وہ اب کہاں ہیں۔

سلام کرنے میں پہل کرنا تو اُن کی گویا فطرتِ ثانیہ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی اور مسلمان کو اس خاص سنتِ نبویؐ کی اتنی شدت سے پیروی کرتے دیکھا ہو۔ آنکھیں چار ہوئیں نہیں کہ سلام کیلئے ہاتھ اٹھا۔ بلکہ دونوں عمل ایک ساتھ ہوتے تھے حتیٰ کہ اسمبلی کے اجلاسوں میں بھی اپنی جگہ پر سے سلام میں پیش قدمی کرتے۔ کوئی اور رکن اسمبلی یا وزیر کسی کو کارروائی کے دوران اس طرح سلام نہ کرتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا اگر یہی رکن رہ گیا تو مسلمان ہونے میں کمی آجائیگی میں اپنی ادائیگی فرض کے سلسلے میں سرکاری گیلری میں شاذ اور پریس گیلری میں زیادہ بیٹھتا تھا یا مؤخر الذکر گیلری میں چلتا پھرتا یا کاغذات تقسیم کرتا ہوتا وہ نیچے اسمبلی ہال میں وزراء کی صف میں بیٹھے ہوتے، تقاریر ہو رہی ہوتیں مباحثے جاری ہوتے۔ یا وہ خود تقریر کر رہے ہوتے مگر اتفاق سے بھی نظریں چار ہو جاتیں تو سلام کیلئے فوراً ہاتھ اٹھاتے اور ظاہر ہے کہ یہ سلام میں پیش قدمی ہی ہوتی۔

میرے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے سے کچھ دن پہلے یا شاید رخصت قبل از سبکدوشی کے زمانے کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو چکے تھے یونیورسٹی کے دفاتر شہر میں تھے اس عمارت میں جو کالج فار ویمن سے متصل ہے میں کسی کام سے ڈاکٹر عبادالرحمن مرحوم کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ سرکاری ملازمت کے خاتمہ پر میں یونیورسٹی میں اپنے پرانے محکمہ میں کیوں واپس نہیں آجاتا انہیں میری وجہ سے بڑا اطمینان ہو جائے گا اور میں پسند کروں تو کسی مناسب جگہ کے انتظام کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر محمود حسین تشریف لے آئے انہوں نے سنا تو فوراً حسبِ معمول بڑے جوش سے فرمایا — "بھئی جامعہ میں آپ کیلئے ہر وقت جگہ موجود ہے مگر پیسے ہمارے پاس نہیں ہیں" خیر، وہ ایک بات تھی جو اسی وقت ختم ہو گئی۔

مگر ڈاکٹر صاحب کی ہمدردی، اخلاص اور مسرت کا نقش میرے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ثبت ہو گیا۔ خدا مرحوم کو اس دنیا میں اپنی تمام رحمتوں سے بیش از بیش نوازے آمین! کسی کی مدد کیلئے

ازخود آگے آنیوالے اور بڑھ کر ضرورت مند کا ہاتھ تھامنے والے اس زمانے میں کہاں ملتے ہیں ؎

خدا کے واسطے بتلا کر اس سے دل لگا بیٹھوں
جہانِ بے سکوں میں کیا کوئی غمخوار ہے ساقی (محمود اکبرآبادی)

مرنے سے کچھ دن پہلے کی انکی ایک تحریر بھی میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے اگرچہ سرکاری ہے مگر اس پر ان کی مخصوص غیر رسمی شخصیت کی چھاپ ہے۔

شیخ الجامعہ مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۷۳ء

محترمی جناب قدوائی صاحب ۔ سلام مسنون

آپ کا خط مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۷۳ء وصول ہوا۔ یہ معلوم کرکے تو افسوس ہوا کہ راس مسعود لائبریری اب بہ حیثیت ادارہ کے باقی نہ رہ سکے گی۔ لیکن آپ نے کتابوں کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے یعنی یہ کہ انہیں کراچی یونیورسٹی میں رکھا جائے میرے خیال میں بہت مناسب ہے گذشتہ دو ایک سال میں ہمیں کئی نجی ذخیرے موصول ہوئے ہیں اور ہمارے طلباء اور اساتذہ نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم نے اُن ذخیروں کا علیحدہ وجود بھی اس طرح قائم رکھا ہے کہ متعلقہ کے نام سے گوشے موسوم کر دیئے گئے ہیں جن میں ان کی کتابیں کتب خانے کی زینت بنی ہوئی ہیں اور ہمارا ارادہ ہے کہ انشاءاللہ ہم یہی راس مسعود لائبریری کی کتب کے ساتھ بھی کریں گے یعنی ایک گوشہ "سر راس مسعود" اپنی لائبریری میں قائم کریں گے۔

میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کو یاد رکھا۔ میرا خیال ہے کہ سر راس مسعود جنہوں نے اس برصغیر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اتنی زبردست خدمات انجام دیں ہیں۔ ان کی روح کو اس بات سے خوشی پہنچے گی کہ اک کتب خانے کی کتابیں جو ان کے نام سے موسوم تھا۔ ایک اعلیٰ تعلیم کی درس گاہ میں جگہ پا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سید شاہ علی

ڈاکٹر محمود حسین شہید

ڈاکٹر محمود حسین خان مرحوم کو میں شہید سمجھتا ہوں، کیونکہ ایک تو مرض الموت نے ان پر ان کی فرائض منصبی کی انجام دہی کے دوران میں وار کیا۔ دوسرے ان فرائض کی نوعیت معمولی نہیں تھی۔ وہ ایک قلمی اور علمی جہاد میں مصروف تھے۔ تیسرے انہیں شہید کرنے والوں میں ان کے احسانمندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں طلبہ بھی شامل تھے اساتذہ بھی غیر تدریس ملازمین بھی اور ارباب حل وعقد بھی، ہر ایک نے ان پر تیر و تفنگ برسائے اور وہ خندہ پیشانی سے یہ سب کچھ سہتے رہے قصور کسی کا ہو ذمہ دار کوئی ہو مرحوم سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ لوگ کبھی اپنے ذاتی مفاد کے لئے کبھی نہایت معمولی بلکہ فرضی مسائل کی خاطر اور کبھی اپنی انا کی تسکین اور قیادت کا رنگ جمانے کو پنڈورا کا روا کس کھول کر بحران پر بحران پیدا کرتے اور وہ ان کانٹوں کو پھولوں کی طرح سجانے میں لگ جاتے آخر کار وہ ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی سعی لاحاصل کی صلیب پر چڑھا دیئے گئے۔ وہ کیسے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ان کے قبضے میں کوئی الٰہ دین کا چراغ، کوئی جادو کی چھڑی، کوئی جن کوئی کرشمہ تو نہ تھا وہ کیسے بے بساطی میں بساط بچھاتے۔ نہ صرف یہ کہ ہم سب نے ان پر بے پناہ بوجھ لاد دیا بلکہ وہ آخری تنکا فراہم کر دیا۔ جس نے ان کی کمر توڑ دی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم سب اپنے مفاد کی خاطر ان کے حق میں یزید بن گئے شاید اس لئے کہ اتفاق سے ان کا نام بھی حسین تھا ہم سب اس سیزر اعظم کے مقابل پروٹس اور کاشیس بن گئے آج ہم عادی مردہ پرست لوگ ٹسوے بہاتے ہیں نہایت غمزدہ بلکہ مظلوم بنتے ہیں حالانکہ ہم جابر تھے ظالم تھے قاتل تھے۔ جامعہ کے میڈیکل آفیسر کے

بقول موت آئی نہیں موت ان پر مسلط کی گئی۔

ڈاکٹر صاحب پر فالج کے حملے کے بعد میرے اپنے دل و دماغ کو شدت احساسِ ندامت نے ایسا ماؤف کیا کہ مجھ سے ان کا یہ حال نہ دیکھا گیا میں اس انتظار میں رہا کہ مرحوم کو ہوش آتا اور میں سب کی طرف سے دلی معذرت پیش کرتا۔ لیکن وہ ایسے کھوئے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔

دس اپریل کی سہ پہر کو جامعہ میں دفن سے پہلے، میں نے آخری بار ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا کہ تکان کی شدت کے باعث انہوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہے اور قبلہ رو ہو گئے ہیں، وہ قبلہ جو ان کا آخری پناہ گاہ تھا۔ جہاں دنیا کے سب و شتم کے برعکس انہیں ستّر ماؤں کی مامتا سے زیادہ ٹھنڈی چھاؤں میسر آ سکتی تھی اساتذہ طلبہ، انتظامیہ سب سے یکساں محبت کرنے والا، ان کی عزت اور آبرو پر جان دینے والا، وہ جو دوسروں کی لغزشوں پر خود محجوب ہو جایا کرتا تھا جب چارہ سازوں کی چارہ گری نہ کر سکا اور کوئی راہ فرار بھی نہ پا سکا تو خاک میں جا چھپا۔

وہ شرافت، نجابت، وجاہت، ثقافت، ملائمت، حسنِ طبیعت، تہذیب و شائستگی متانت، عفو درگزر، انکسار، عالی ظرفی، شرم و حیا، خودداری، سادگی، سچائی، خلوص، ہمدردی محبت وغیرہ ساری صفات و اقدار کا مجموعہ تھا۔ ہمارے ملک میں اس سے بڑے عالم مورخ، سائنسدان، مدبر، مفکر اور دانشور موجود ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا نور، نیکی، بچوں کی سی طبیعت اور فرشتوں کی سی خصلت کسی میں نظر نہیں آتی، کسی کا قول ہے۔

"آپ کو زندگی میں بہت سے بڑے بڑے جرنیل، فلسفی، سیاستدان وغیرہ ملیں گے لیکن جس شخص سے آپ کی شاذ و نادر ہی ملاقات ہو گی وہ ایک شریف آدمی ہے"

وہ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے، ہر ایک کو مسکرا کر خوش آمدید کہتے تھے۔ عالی نے بجا طور پر ان کی مسکراہٹ کو نفیس اور بلیغ لکھا ہے۔ میں تو کہتا ہوں ہم مغرب زدہ بکیر کے نقیر مونا لیزا کی نادر روزگار مسکراہٹ کی تعریف میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے

کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اپنوں کی واقعی خوبیوں کے اعتراف میں خست اور تنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اکیڈمک کونسل کی تلخ سے تلخ بحث کے دوران میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ایک معنی خیز مسکراہٹ فضا کے تکدر کو دور کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ وہ سنجیدہ بھی تھے اور شگفتہ بھی۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اور ڈاکٹر محمود حسین مرحومین کی باغ و بہار شخصیتیں اور جاں بخش قہقہے ان کے جاننے والوں کو مدتوں یاد آئیں گے۔ غم واندوہ سے معمور اس دنیا میں وہ نہ صرف اپنے بلکہ اَن گنت دلوں کا سہارا تھے۔ وہ اپنے چاروں طرف خوشیاں بکھیرتے چلے جاتے تھے جنہیں لوگ آج بھی یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ ہر ایک کی مدد کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور ہر کس و ناکس کے نجی اور غیر نجی مسائل کے حل میں پیش پیش رہتے تھے ہر شخص کی ہمت افزائی کرتے اور اس کی ترقی و خوشی میں دل سے شریک ہوتے۔ پچھلے سال شعبہ اردو کے طلبا نے ڈاکٹر فرمان کے داؤد ادبی انعام اور ڈی لٹ حاصل کرنے پر استقبالیہ دیا۔ میں بحیثیت چیرمین بغیر پیشگی اطلاع انکی خدمت میں پہنچا کہ اس تقریب کی صدارت سے مزید عزت افزائی فرمائیں۔ وہ دفتری مسلوں کے انبار پر جھکے ہوئے تھے جیسے چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر کسی تکلف یا تامل کے میرے ساتھ ہولیے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ حتیٰ الامکان صدق دل سے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا تھے۔ اسی لئے شاید ہی کوئی شخص انکی زندگی سے جھوٹ، غلط بیانی، شیخی، کم ظرفی، ناجائز اقتدار، خیانت، خورد برد یا استحصال کی کوئی مثال پیش کرسکتا ہو، خواہ وہ ان کی اپنی ذات کے سلسلے میں ہو یا اپنی اولاد کی خاطر، گو ان کے روابط سمندر کی طرح وسیع تھے۔

وہ جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس میں خوردوں سے سعادت مندی اور بزرگوں کی تعظیم کی توقع کی جاتی تھی، ان میں یہ عجیب و غریب وصف تھا کہ وہ خوردوں کا احترام کرتے تھے۔ دورِ حاضر میں عموماً لوگ "ہمچو من دیگرے نیست" کے قائل ہوتے ہیں، وہ ہر ملاقاتی سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ ہیچ ہوں۔ غالباً یہ بھی انکی شخصیت کی دلکشی کا ایک راز تھا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، شاید اسی لئے وہ ہر ایک سے

امتیاز مندانہ ملتے تھے کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے لیکن مجھے ایک اور وجہ اس سے زیادہ معقول اور وقیع معلوم ہوتی ہے۔ انسان دوستی انکی رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ انسان دوستی جس کی خشت اوّل اسلامی تعلیمات اخوت و مساوات تھی۔ ان کے ایک دل میں کتنوں کا خیال تھا؟ کتنوں کا درد تھا؟ وہ کتنوں کے دلدادہ تھے؟ ہر ایک کیلئے انکے دل میں ایک الگ خانہ بنا ہوا تھا۔ وہ کتنے دلوں کی آماجگاہ تھے؟ انکی دلنوازی کی ادا دیکھ کے اردو شاعری کے معشوق کی تذکیر کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ان کا حسن صورت اور سیرت دونوں پر محیط تھا اور ہر کس و ناکس انہیں اپنا قابلِ اعتماد دوست گردانتا تھا۔ جو کسی بھی آڑے وقت میں کام آسکتا ہے کوئی مشکل پیش آتی۔ تو لوگوں کو اسی کا نام سوجھتا تھا۔ ان سے جو بھی ایک بار ملتا ہمیشہ کے لئے انہیں کا ہو رہتا بلکہ اپنے آپ کو ان کے عزیز ترین احباب میں شمار کرنے لگتا، یہ نتیجہ تھا ان کے خلوص

حسنِ طبیعت اور قول و عمل کی مطابقت کا۔ وہ گفتار اور کردار دونوں کے غازی تھے۔ ان کی تصانیف اور تراجم سے بھی ان کے طبعی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ ٹیپو سلطان شہید کے بہت بڑے شیدائی تھے۔ پچھلے سال ٹیپو سلطان ہال میں ٹیپو سلطان کی پونے دو سو سالہ برسی میں ڈاکٹر صاحب نے بڑے ذوق و شوق سے شرکت کی تھی۔ اور آپ کی تقریر حاصل مذاکرہ تھی۔ اس ضمن میں شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ خطابت کے بھی مردِ میدان تھے۔ ان کی مدلل اور جوشیلی تقریر کی جناب احمد جعفر اور دیگر حضرات نے بھی تعریف کی ہے، لیکن جب وہ اپنے کسی محبوب موضوع پر بولتے تو جی چاہتا کہ انھیں ٹیپ کر لیا جائے۔ اور بار بار سنا جائے۔ شمع علم کو فروزاں کرنے کے ذرائع مثلاً تعلیم بالغان اور کتب خانوں کا فروغ بھی، ان کا ایک بہت ہی محبوب موضوع اور خاندانی مشغلہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں مروت بھی بے حد تھی، جو بعض اوقات اس غلط فہمی کا باعث ہوتی تھی کہ اس کا مقصد سب کو خوش رکھنا اور مختلف و متحارب گروہوں میں توازن برقرار رکھنا ہے۔ لیکن دراصل وہ نقطہ نظر کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اور کسی کی حق تلفی سے بچنا چاہتے تھے۔

ایک فرانسیسی مقولہ ہے کہ سب کچھ سمجھنا سب کچھ معاف کر دیتا ہے۔

انکی جامعہ کراچی کے شعبۂ تاریخ اور کلیۂ فنون کی طویل المیعاد سربراہی نے جامعہ کے مسائل و معاملات کو ان کے شیخ الجامعہ بننے سے پہلے ہی ان کا جزوِ حیات اور ان کی شخصیت کو تاریخ ساز بنا دیا تھا ان کی فطرت کا خاصا تھا کہ وہ ہر کام دل لگا کر کرتے۔ وہ یہاں اپنی کشتیاں جلا کر آئے تھے اور اپنے آپ کو اس گندے اور گھناؤنے سیاسی ماحول سے بچا لائے تھے۔ جسے مفاد پرستوں اور ابن الوقتوں نے جنم دیا تھا اپنے تعلیمی مشن سے مختصر سے گریز نے ان پر کھوں اور کھن مثالیت اور واقعیت کا فرق نہایت بے دردی سے واضح کر دیا تھا۔ چیئرمین ماؤ کا قول ہے کہ اپنے طویل المیعاد منصوبوں کو قلیل المیعاد مقاصد پر قربان نہ کرو۔

الغرض ڈاکٹر عبادالرحمٰن خان مرحوم سے خاص روابط کی وجہ سے انکے رجسٹرار بننے کے بعد وائس چانسلر کے علاوہ رجسٹرار کا دفتر بھی ہر اہم معاملے میں ڈاکٹر محمود حسین کے مشوروں کا محتاج تھا اور انہیں اپنے روزانہ کے دستور العمل میں سے اس کیلئے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ جو بعد میں بھی جاری رہا۔

اس سے ان کی کوئی ذاتی اغراض وابستہ نہ تھیں۔ ورنہ ان کے بڑے صاحبزادے انور حسین آج کویت کے بجائے جامعہ کراچی یا تعلیم ملی سے منسلک ہوتے۔ جو شخص فیلڈ مارشل ایوب خان کے عہد میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے یہ کہہ کر مستعفی ہو جائے کہ میں ایک استاد ہوں پولیس والا نہیں۔ اس کا اپنا ذاتی مفاد کیا ہوگا؟

ڈاکٹر صاحب بیس سال سے زیادہ جامعہ کراچی سے وابستہ رہے گو اس سے پہلے بھی بحیثیت وزیر تعلیم، ان کا تعلق اس کے معاملات سے رہا تھا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کا خاندان وائس چانسلروں کا خاندان تھا۔ ذاکر صاحب بہار کی گورنری اور بھارتی صدارت سے قطع نظر مدتوں جامعہ ملیہ اور جامعہ علی گڑھ کے وائس چانسلر

رہے، ڈاکٹر یوسف حسین اسی جامعہ علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر تھے بعد کو شملہ کے تحقیقی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ ان کے بھتیجے ڈاکٹر مسعود حسین تقریباً دو سال سے جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ ہیں۔ باوجود ایں ہمہ آفتاب عالی نسبی اور ۱۹۳۲ء میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی سند کے وہ جامعہ ملیہ کی روایات کے مطابق صبر و قناعت کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہے اور اپنے سیاسی نظریات کے باعث ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ اور اپنی ساری عمر پاکستان کی نذر کر دی ۱۹۵۳ء سے ۵ جامعہ کراچی میں پروفیسری کلیہ فنون کی سربراہی، سنڈیکیٹ کی رکنیت اور بارہا قائم مقام وائس چانسلری کے مناصب پر فائز رہے اور جامعہ کی تعمیر و ترقی کے علاوہ صوبائیت اقربا پروری وغیرہ کے خلاف سدِ سکندری بنے رہے جامعہ کے بیشتر اساتذہ کا تقرر انکی مدد اور رہنمائی کا مرہون منت ہے۔ اس زمانے میں انکی شخصیت ایک شعلہ جوالہ کی سی تھی، جو ایک منشور (PRISM) میں سے منعکس ہو جس میں جمالی اور جلالی دونوں ہی عناصر کار فرما تھے، جو حسبِ موقع ضرورت نمایاں ہوتے۔ لیکن جمالی پہلو کو غلبہ حاصل رہا اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ تقریباً پوری طرح جلالی پہلو پر چھا گیا ابتداء میں کبھی کبھی ان کا جلال چمک اٹھتا تھا، مثلاً جب انھوں نے پروفیسر حلیم صاحب کے دور میں پہلی مرتبہ کلیہ فنون کی سربراہی سے استعفیٰ دیا تھا لیکن یہ تاریخی لمحے شاذ و نادر ہی وقوع میں آتے تھے ؎

علم را بر تن زنی مارے شود　　　علم را بر دل زنی یارے شود

اس مینارۂ نور شخصیت میں نور و نار اور جلال و جمال کا یہ تناسب، انکے بچوں کے ناموں کے انتخاب سے بھی جھلکتا ہے ملاحظہ ہوں یہ نام، انور، تنویر، ثریا، ثاقبہ، یاسمین، طارق،

آخر میں میں اپنے شذرات ایک دو ذاتی مشاہدات پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مقصد کوئی ذاتی نمود و نمائش نہیں اور نہ اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے میں آج سے بیس سال پہلے اپنی ذاتی غرض سے پروفیسر حسن عسکری اور غلام محمد خان سے مشورے کے بعد

۱۹۵۵ء کے وسط میں ایک دن صبح سویرے بغیر پیشگی اطلاع ڈاکٹر صاحب کے دفتر پہنچا۔ چپڑاسی میرا کارڈ اندر لے ہی گیا تھا کہ انھوں نے فوراً بلوالیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئے کہ میں نے میسور سے لکھنؤ پہنچ کے اردو میں پی، ایچ، ڈی کی تکمیل کی تھی۔ میں نے عرض کی کہ یہی چیز میرے خلاف سب سے بڑی دلیل بن سکتی ہے، انھوں نے فوراً میری ہمت افزائی کی اور قطعیت کے ساتھ فرمایا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ اردو کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ اردو تو پہلے پہل دکن ہی میں پروان چڑھی۔ اس کے علاوہ یہاں اردو کے لیے امیدواروں میں کوئی پی۔ ایچ ڈی نہیں ہے! آپ مطمئن رہیں۔ اتنے میں برٹش کونسل کے نمائندے آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا کہ دیکھئے یہ میسور کے دور دراز علاقے کے ہیں اور لکھنؤ سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے تقریباً سال بھر کے طویل انتظار کے بعد انٹرویو ہوا اور اس کے چھ ماہ بعد تقرری کی باری آئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے برسوں نجی اور دفتری مسائل میں میری رہنمائی فرمائی میں ان تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ مختصر یہ کہ میرا تقرر اور میری ترقی بڑی حد تک ڈاکٹر صاحب کی مرہونِ منت ہے اور میری طرح جامعہ کے متعدد دیگر اساتذہ کی بھی۔

ہر چند کہ ڈاکٹر صاحب عالم باعمل تھے، صاحب کردار تھے، لیکن ان کی قدر وہ کرے جسے وہ صفات عزیز ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں مروت بھی بیحد تھی، اسی لیے وہ سخت اقدام سے گریز کرتے تھے۔

بعض دوستوں نے ان کی اس شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی عاقبت سنواری اور بعض نے ان کے سرو قد سائے میں پناہ حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ کے تقدس کے قائل تھے اور اسکی خاطر سینہ سپر ہو جاتے لیکن ان کے لیے کون سینہ سپر ہوتا حالات کا یہ تقاضا آخر کب تک چلتا جب وائس چانسلری پل صراط اور صلیب بن گئی بقول عرفی ؎

ہوشیار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را۔

اور صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ——————

انہوں نے استعفیٰ دیدیا اور بار بار دیا، لیکن زبردست کا ٹھینگا سر پر مارے اور رد نہ دے۔ طلبہ، اساتذہ، حکومت سب نے اُن کے نہیں بلکہ اپنے مفاد میں اسے قبول نہ ہونے دیا اور نہ اپنا رویہ تبدیل کیا۔ وہ ناکردہ گناہ اتنی کڑی سزا کے مستحق تو نہ تھے۔ کیا معلوم تھا کہ تعاون کے بارے میں انکی توقعات اس قدر بے جا ثابت ہوں گی۔

موت العالِم موت العالَم کہنا ایک ریت سی بن گئی ہے، لیکن ایسے ہی نادر موقعوں پر اس کا صحیح مفہوم اجاگر ہوتا ہے مرحوم کے وصال پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ایک جانِ عالم تھا جس کی مفارقت پر ایک داستانوی ماتم بپا ہے، ایک آہ و بکا کا عالم ہے، جیسے اس دنیا پر ساری آفاتِ ارضی و سماوی ٹوٹ پڑی ہوں۔ جیسے ہر شخص کی ایک متاعِ عزیز چھن گئی ہو۔ خلق خدا کا ایسا اژدہام جس میں کہ ہر شعبۂ حیات کا عطر شامل تھا اور شہر سے بلیر کے مضافات تک ایسا میلوں لمبا موٹر کاروں اور مختلف سواریوں کا جلوس قائدین، مولانا شبیر احمد عثمانی، مادرِ ملت اور سردار نشتر سے قطع نظر، جو ظاہر ہے سیاسی شخصیتیں تھیں اور تحریک پاکستان کا ایک مقدس ورثہ ایک صاحبِ علم کیلئے شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو۔ یہیں اقدارِ حیات کا سوال پیدا ہوتا ہے اور ایک لمحے کے لئے سہی؟ حیات بعدِ ممات کا مفہوم اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

کسی شخص کی زندگی کی تکمیل ہی پر، اس کے بارے میں ایک صحیح تصور قائم ہوتا ہے مرحوم کو شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جب استقبالیہ دیا گیا تھا تو میں نے یہ دو رباعیاں کہی تھیں۔

ہے علم و لیاقت کا سفینہ محمود — اور خلق و مروّت کا خزینہ محمود
انصاف و توازن کا مثالی پیکر — بیباک صداقت کا نگینہ محمود

ہے جامع اوصاف حمیدہ محمود — خوبانِ دو عالم کا ہے دُرِّ مقصود
کیونکر نہ ہو خار کورِ چشم حاسد — خود جامعۃ العلم کا جوہر محمود

یقین نہیں آتا کہ برسوں کی چہکتی مہکتی شخصیت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے
کیوں نہ اپنی ابدی مسکراہٹ، شرافت، خوش خلقی اور مروت کی طرح وہ بھی ابدیت کا حامل
ہوا؟ انسان فانی ہے لیکن اس کی صفات اور نیک اعمال کا اثر لازوال ہے ع

رفتید ولے نہ از دل ما

ہم میں سے کوئی شخص جو اس ملک میں اور اس قوم میں علم و فن کی ترقی چاہتا
ہے۔ انگریزی کا مخالف نہیں۔ انگریزی ایک بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے
وہ ان ملکوں میں بھی کسی نہ کسی قدر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جہاں انگریزوں
کی حکومت نہیں رہی اور کم از کم چند زبانوں میں سے ایک ضرور رہی ہے جس میں
جدید علوم و فنون کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور ہمارے لیے ان تک رسائی
صرف اس وسیلے تک ممکن ہے۔ لیکن یہ ایک واضح اور متعین مقصد ہے اور
اس کے لیے ہمیں انگریزی کو ضرور اپنی گرفت میں رکھنا چاہیے، اس کی
تعلیم و تدریس کا نہایت معقول انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ آج
بعض زبانوں کی تحصیل بھی ہمارے لیے ناگزیر ہے آج کا سائنس دان روس
جاپان اور چین کے سائنسدانوں کے تحقیقات علمیہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا
بے شک انگریزی کے ذریعے سے ان زبانوں کی اکثر تحقیقات کا سراغ مل جاتا ہے
لیکن ظاہر ہے سائنس میں تحقیقات علمی کی رفتار جس قدر تیز ہے ترجمہ اس کا
ساتھ نہیں دے سکتا اور جب تک روسی، جاپانی یا چینی کسی مقالے یا کتاب
کا انگریزی میں ترجمہ ہوتا ہے اور پھر جب وہ ہم تک پہنچتا ہے اس
وقت تک بات بہت پرانی ہو چکی ہوتی ہے۔ محمود حسین

ڈاکٹر عبد القیوم

ڈاکٹر صاحب مرحوم

ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات بہت قریبی تو نہ تھے لیکن معمولی بھی نہ تھے۔ ان تعلقات کی مدت کم و بیش پچیس سال ہے۔ ان پچیس سالوں میں زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن ڈاکٹر صاحب کی حب الوطنی اور قومی دلسوزی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ سب سے پہلے استاد تھے پھر وزیر ہوئے اس کے بعد پھر پیشۂ تدریس کی طرف آئے اور کراچی یونیورسٹی سے متعلق ہو گئے اور یہ تعلق ایسا قائم ہوا کہ وہ یہیں کے ہو رہے ——— درمیان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر بھیجے گئے۔ لیکن کراچی یونیورسٹی سے ان کا ربط برابر قائم رہا۔ انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں مجھے دو تین خط دستی بھجوائے اور مجھ سے کئی مرتبہ اپنی ضرورت کی کتابیں منگائیں نہ معلوم کس شخص نے انھیں بتا دیا تھا کہ میرے پاس بعض ایسی کتابیں ہیں جن کی انھیں اکثر اوقات ضرورت رہتی تھی وہ جب بھی کوئی کتاب منگاتے میں بھجوا دیتا۔ چند روز بعد کتاب واپس آجاتی میرا کبھی ان کے مکان پر جانے کا اتفاق نہ ہوا لیکن جب کبھی کسی تقریب میں یا کسی جلسہ میں ملاقات ہو جاتی تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے کتابوں کا شکریہ ادا کرتے اور جلد ملاقات کی خواہش ظاہر کرتے۔ ملاقات کا یہ سلسلہ ڈاکٹر صاحب کے یونیورسٹی آجانے کے بعد بڑھا اگست ۱۹۵۵ء میں جب اردو کا شعبہ یونیورسٹی میں کھلا تو مجھے بھی وہاں تدریس کا موقع ملا۔ اس کے بعد برابر میری ان کی ملاقات ہوتی رہتی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان سے تعلقات میں یگانگت پیدا ہوتی گئی اور یہ کیفیت آخر تک قائم رہی اور کیوں نہ قائم رہتی جبکہ ڈاکٹر صاحب بڑے آدمی ہوتے ہوئے میری توقع سے زیادہ مجھ سے خوش اخلاقی برتتے ہمدردی کا اظہار کرتے اور ہر ضرورت میں کام آنے کے لئے تیار رہتے، دنیا میں بہت سے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور بیشمار لوگوں نے

اپنی کوششوں سے بڑائی حاصل کی اور بہتوں نے شہرت و عظمت کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے تمام وسیلے اور طریقے اختیار کئے اور جائز و ناجائز روا و ناروا کا خیال نہیں کیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عزت و شہرت حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی اور نہ کوئی ذریعہ اختیار کیا وہ خود بخود بڑھتے چلے گئے ممکن ہے دنیوی اعتبار سے انھیں کہیں ناکامی ہوئی ہو لیکن حقیقت میں انھیں کامیابی ہوئی ان کی مقبولیت بڑھتی گئی، ان کے جاننے والوں اور ملنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہی بات ان کی نیک نامی کی ضمانت ہے پاک و ہند کے بیشتر مشاہیر سے ان کے تعلقات تھے لیکن انھوں نے اپنی ذات کے لئے کسی کا سہارا نہیں لیا وہ چاہتے تو متعدد حکومتوں کی الٹ پلٹ میں شرکت کے مواقع پیدا کرتے رہتے لیکن انھوں نے ایک مختصر مدت کی سیاست کے بعد پھر معلمی کے پیشہ کو اختیار کر لیا اور آخر تک اسے نباہا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کا زندگی میں رویہ ہمیشہ اخلاقی رہا یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو دوسروں سے الگ نہیں سمجھتے تھے اور نہ اپنی پوزیشن اور حیثیت کے زعم میں گرفتار تھے بلکہ ہر شخص سے ملنے میں پیش قدمی کرتے اور ہر موقع پر کسی شناسا کو نظر انداز کرنا ان کی عادت کے خلاف تھا خواہ وہ کیسے ہی اہم اجتماع میں ہوں یا ارباب اقتدار کے ساتھ وہ اپنی وضعداری پر قائم رہتے۔ بڑھ کر ملتے دوسروں سے اس کا تعارف کراتے اس شخص کی صفات گنواتے اور ہر طرح کی مدد کے لئے تیار رہتے، ایسے وسیع القلبی کے مظاہرے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق قائم گنج (فرخ آباد۔ یو۔پی) کے پٹھان خاندان سے تھا ان پٹھانوں کا زندگی بسر کرنے کا مخصوص طریقہ ہے۔ ان کی بات چیت کرنے کا انداز بھی مخصوص ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں بھی اپنی آبائی اور خاندانی خصوصیات تھیں انھیں جلد غصہ آجاتا تھا لیکن ان کی طبعی شرافت اور باغ و بہار طبیعت اس غصہ کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہنے دیتی تھی۔ وہ بہت جلد معمول کے مطابق ہنسنے بولنے لگتے۔ بغض کینہ اور حسد جیسی لعنتوں سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا انتقام لینا یا کسی کی بربادی پر ہنسنا ان کے وہم و گمان میں نہیں آسکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خاندانی روایات سے میں زیادہ واقف نہیں لیکن وہ اور ان کے ممتاز بھائیوں میں ایک صفت ایسی تھی جو عام طور پر نہیں پائی جاتی وہ یہ کہ وہ کسی کو

نقصان پہنچانا جانتے ہی نہ تھے۔ مدد اور صرف مدد ان کا شعار تھا دوسرے ادبی ذوق اور
اردو زبان و ادب سے شغف اس کی ترقی و فروغ سے دلچسپی بھی ان کا خاندانی ورثہ ہے
ان کی علمی ادبی اور تعلیمی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے آج بھی اقبال اور غالب کے سب
سے اچھے نقاد ڈاکٹر صاحب کے منجھلے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین ہی ہیں روح اقبال اردو غزل
اور غالب اور آہنگ غالب جیسی بلند پایہ کتابیں اردو زبان و ادب کا قیمتی ورثہ ہیں۔ ڈاکٹر
صاحب کی تحریروں اور تقریروں میں بھی ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ
انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر وہ اس خدمت سے
جلد ہی الگ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب بیسویں صدی میں پیدا ہوئے لیکن ان کا ذہن انیسویں صدی کے مشاہیر سے
زیادہ مماثلت رکھتا تھا جن میں شہرت و ناموری حاصل کرنے سے زیادہ مقصد کی لگن اور خود نمائی
سے زیادہ کام کرنے کا جذبہ کارفرما تھا وہ قربانی و ایثار کو قومی کاموں کے لئے ضروری سمجھتے
تھے۔ ان بزرگوں کے یہاں شہرت کی خاطر کوئی کام کرنا اور اس سے کسی مقصد کو حاصل کرنا
اخلاقی جرم تھا۔ وہ مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے اور اس نصب العین کی خاطر نہ کسی کی
ناگواری سے ڈرتے تھے اور نہ کسی لالچ یا خوف کو خاطر میں لاتے تھے وہ انسانوں سے محبت
غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانیت کی وجہ سے کرتے تھے۔ وہ خدمت کو عبادت کا درجہ دیتے
تھے۔ احسان کرتے تھے لیکن احسان جتلاتے نہ تھے۔ ڈاکٹر محمود صاحب کا تعلق بھی اسی قبیلے سے
تھا۔ انھوں نے بہتوں سے سلوک کیا اور ہر قسم کا سلوک کیا لیکن اس کا اظہار کبھی نہیں کیا
اگر کوئی شکریہ ادا کرتا تو شرمندہ ہو جاتے اگر کوئی ان کی تعریف کرتا تو پریشان ہو جاتے۔ بات
کاٹتے اور گفتگو کا رخ کسی اور طرف پھیر دینا چاہتے۔ شاید انھیں اس موقع سے زیادہ پریشان
اور کبھی نہیں دیکھا گیا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب میں داخلیت کا عنصر بہت کم تھا جو انھیں خود پرستی
اور خود نمائی کی طرف مائل کرتا لیکن ان کی نگاہ بہت بلند تھی اور ہمیشہ کسی بڑے مقصد اور نصب العین
کی طرف رہتی تھی وہ فروغ تعلیم کو سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ جامعہ ملیہ ملیر کراچی ان کی تعلیمی
کوششوں کا مظہر ہے۔ اس کی بلند و بالا عمارت اس کا پرفضا ماحول اور کسی حد تک تعلیم اور اسکے

مقصد سے لگاؤ دراصل ڈاکٹر صاحب ہی کی بدولت پیدا ہوا لیکن اس کے انتظامی معاملات میں انھوں نے مطلق العنان رویہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ مسلمانوں میں فروغ تعلیم سے دلچسپی کچھ سرسید کے ساتھ ایسی مخصوص ہوگئی ہے کہ اور لوگ اسے بھاری پتھر سمجھ کر محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں اور ساری ذمہ داری حکومت کے سر ڈال دیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تو یہ جذبہ جسے اور بڑھنا چاہئے تھا، بالکل ہی سرد پڑ گیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے سرسید کی روایت کو اگر آگے نہیں بڑھایا تو کم از کم اس کے برقرار رکھنے میں سعی ضرور کی بعض اہل ثروت کو اس طرف متوجہ کیا اور ان کی خدمات سے جامعہ ملیہ کو فائدہ پہنچا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے ڈاکٹر محمود حسین کی تعلیمی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ کاش ہم میں اور محمود حسین ہوتے کاش یہ سلسلہ قائم رہتا افسوس کہ یہ روشن چراغ بھی بجھتے جاتے ہیں۔

جن کو کھو بیٹھے نظر ان کو کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

سمجھدار اور قومی مفاد کا خیال رکھنے والے ناشروں کا فرض ہے کہ وہ دنیا کو ہمارے ادیبوں کی کوششوں سے روشناس کرائیں یہ نہ ہو کہ صرف بکنے والی تصانیف کی سرپرستی کریں۔ اگر وہ چلتی ہوئی چیزیں چھاپیں تو ایک ایسی تصنیف بھی شائع کریں جو فن کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو چاہے اسے خریدنے والے آج کم ہی کیوں نہ ہوں۔ سنجیدہ ادب ہمارے ہاں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ناشر الا ماشا اللہ یا تو درسی کتابیں چھاپتا ہے جو ہزاروں کی تعداد میں جلد فروخت ہو جاتی ہیں یا گھٹیا قسم کا لٹریچر جس کی مانگ ہے۔ بدقسمتی سے آج زیادہ تر مانگ ایسے ادب کی ہے جس کا طرۂ امتیاز عریانیت اور فحش ہے یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ منڈی میں کھپت اسی مال کی ہے۔ ناشر ہیجان انگیز مال مانگتا ہے اس لئے کہ عوام کو یہی مرغوب ہے۔ اس طرح عفونت اور گندگی کا یہ ڈھیر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اچھے ناشر کا فرض ہے کہ لوگوں کو نہ صرف ان کی پسند کی تصانیف مہیا کرے بلکہ ان کے مذاق کی بھی اصلاح کریں۔ محمود حسین

علی محمد شاہین

علمی دُنیا کا روشن چراغ

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین بھی آخر چل بسے وہ چند روز سے صاحبِ فراش تھے۔ فالج کے حملے اور دل کا دورہ پڑنے کے بعد انہیں بے ہوش ہوئے تین روز گذر گئے تھے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور پھر موت بھلا کسی کو کب بخشتی ہے وہ بڑی سے بڑی ہستیوں کے قصے تمام کر دیتی ہے علم کے اس آفتاب کو بھی نے ڈوبی اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

برِصغیر پاک و ہند کی علمی و ادبی تاریخ میں ڈاکٹر محمود حسین نے جو کارنامے انجام دیئے انہیں ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان تھا۔ انگریز نے جو تعلیمی ادارے قائم کیئے ان میں مسلمانوں کے علوم و فنون کے احیار وارتقا میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا مسلمان زعمار نے اس ضمن میں قدم اٹھایا اور دینی و دنیاوی ہر دو طرح کے علوم و فنون کو اپنے نصاب میں سمیٹنے کی مساعی کیں انہوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیئے ان میں جامعہ ملیہ دہلی بھی سرِ فہرست ہے جس میں ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین نے نمایاں کردار ادا کیا اور جامعہ ملیہ کی توسیع اور نئی زندگی کا سرو سامان فراہم کیا اس میں ڈاکٹر محمود حسین بھی پیش پیش رہے۔

جامعہ ملیہ کی بنیاد کس مپرسی کے دور میں پڑی، ناساز گار حالات میں حکیم اجمل خاںؒ پروفیسر محمد حبیب، مولانا اسلم جے راجپوری، سعید الدین، شفیق الرحمٰن قدوائی، ارشاد الحق، خواجہ عبدالحیٔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے بھائی ڈاکٹر محمود حسین وغیرہ نے اپنی انتھک مساعی کو روبہ کار لاکر ادارہ کو اس مقام پر لاکھڑا کیا کہ ترکی سے خالدہ ادیب خانم اور مصر سے ڈاکٹر وہبی لیکچر دینے کے لیئے آئے اور یہی ادارہ تھا جس نے برصغیر میں سب سے پہلے ٹریننگ کالج قائم کیا۔

جامعہ ملیہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا یہ ایک تحریک تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک پلیٹ فارم کا کام کیا اور ان میں تعلیمی، ثقافتی، سیاسی شعور بیدار کیا۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم

تحریکِ پاکستان کے اہم ستون تھے وہ روشنی کے ایسے مینار تھے جو لوگوں کے لیے نشانِ منزل کا کام کرتا ہے۔
قیامِ پاکستان کے بعد وہ ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے آئے اور یہاں علم و ادب کی شمع روشن کی جامعہ ملیہ
دہلی کی طرز پر عروس البلاد کراچی میں ملیر کے مقام پر ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو آج بھی "جامعہ ملیہ ملیر"
کے نام سے اپنے بانی کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیدا ہوئے یہ دور مسلمانانِ عالم کے لیے
بڑا پرآشوب دور تھا۔ سلطان عبدالحمید خان ثانی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۹ء) کی معزولی، انجمن اتحاد ترقی کا
دور، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، پہلی عالمی جنگ، ترکیہ کی تقسیم، شرقِ اوسط میں افراتفری اور پھر
اسلامی ممالک میں استعمار کے خلاف شیخ لینین، عبدالکریم ریفی، سعد زغلول پاشا وغیرہ کی حصولِ آزادی
کی کشمکش سے متاثر ہو کر برصغیر میں انگریزوں کے خلاف تحریکِ خلافت اور مسلم لیگ کی جدوجہد وغیرہ کا ڈاکٹر
محمود حسین مرحوم پر اوائل عمر ہی سے گہرا اثر پڑا اور وہ مسلمانانِ ہند کی کاوشوں میں برابر کے شریک ہوئے اور
آخری دم تک ان کا ساتھ دیا۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کے بھائی ذاکر حسین ان سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف
اصول پرست واقع ہوئے انہیں دولت، عزت، شہرت وغیرہ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے مواقع میسر
تھے وہ چاہتے تو اپنے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے، انہوں نے اصول پرستی کو ملحوظ رکھا۔ اپنی وابستگی تحریک
پاکستان سے رکھی اس سے بڑھ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ
ہند کے جلیل القدر منصب پر فائز تھے۔ اور ڈاکٹر محمود حسین کراچی میں ایک معمولی مکان کے جزوی حصہ میں
اقامت گزیں تھے۔

ڈاکٹر موصوف نے اصولوں کی خاطر وطن کو خیرباد کہا۔ یہی اصول پرستی تھی جن کی بدولت وہ عوام و
خواص میں مقبول رہے، ہر طبقہ اُن کا احترام کرتا تھا، انہوں نے عہدہ حاصل کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا۔
کچھ مدت کے لیے وہ پاکستان کے وزیر تعلیم بھی رہے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر
فائز رہے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے جن افراد نے ہر دلعزیزی حاصل کی اُن میں ڈاکٹر محمود حسین
مرحوم کی ہستی سرِ فہرست ہے مشرقی پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ انہیں فراموش نہیں کر سکتا لیکن اصولوں
کی خاطر انہوں نے استعفیٰ دیدیا اور کراچی یونیورسٹی کے تاریخِ عالم کے شعبہ کو وائس چانسلری پر ترجیح دی۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم نے سادگی کو شعار بنایا - طلبہ سے ان کی شفقت اپنی مثال آپ تھی، انہیں طلبہ اور درسگاہوں سے ہمیشہ لگاؤ رہا - درسگاہوں میں بہتر تربیت دینے اور طلبہ کے کردار کو مثالی بنانے میں وہ ہر وقت کوشاں رہتے تھے - ایک نجی ملاقات میں راقم الحروف سے گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ

"درسگاہیں سانچہ ہوتی ہیں جہاں پر طلبا کا کردار اور سیرت ڈھلتے ہیں —"

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم ایک استاد، ایک مصنف، ایک مفکر، ایک مورخ اور ایک بہترین مترجم تھے تاریخ پر انہیں مہارت تامہ حاصل تھی - میکاولی کی "بادشاہ" روسو کا "معاہدہ عمرانی" اور نجیبا عزالدین کی "عرب دنیا" وغیرہ اردو ادب کے لیے ناقابل فراموش سرمایہ ہے جو ہمارے لیے عباسی دور کے مترجمین کی یاد تازہ کرتے ہیں - ان کی تصنیفات بھی علمی دنیا میں ایک بے مثال سرمایہ ہیں -

ڈاکٹر موصوف جیسی شخصیتیں تاریخ میں کبھی کبھار جنم لیتی ہیں - وہ پیدائشی استاد تھے - وہ کسی دور میں بھی اپنے اس فرض سے غافل نہ رہے - علم کی خاطر جدوجہد کی - علم کی خاطر جیئے اور علم کی مسند پر راہیِ ملکِ عدم ہوئے - ان کی موت ایک علمی سانحہ کے مترادف ہے ان کی موت سے اقدار کا ایک دور ختم ہو گیا -

> بعض معترضین کو اصرار ہے کہ اردو زبان میں تعلیم کی وجہ سے، بین الاقوامی میدان ہم پیچھے رہ جائیں گے اور ہم اپنے وطن کی چار دیواری میں محبوس ہو جائیں گے، ان کا یہ خیال لاعلمی پر مبنی ہے - اردو زبان میں تعلیم کی وجہ سے، دوسری زبانوں کے دروازے مسدود نہیں ہو جاتے - اور نہ اس کا مقصد ایسا امتناع عائد کرتا ہے جس کے تحت غیر زبانوں کی تحصیل جرم ہو جائے گی - ملک کے وہ چند فیصدی انسان، جن کو بیرونی ارتباط کی ضرورت پیش آتی ہے یقیناً غیر ملکی زبانیں سیکھ سکتے ہیں - مگر عوام الناس پر ان چند فی صد اشخاص کی خاطر، ایک غیر زبان کا یہ جبل طوق مسلط کرنا کہاں کا انصاف ہے، کسی ترقی یافتہ ملک پر نظر ڈالیے اور اعداد و شمار پر غور کیجیے - ملکی زبان میں پڑھے لکھوں کے مقابل بیرونی زبان جاننے والوں کی تعداد صرف چند فیصد ہوتی ہے ایسی صورت میں ہمارے لیے بھلا یہ کہاں جائز ہے کہ بنیادی تعلیم کو چھوڑ کر غیر ملکی غیر مانوس زبان کے حصول میں قوم کی عمر ضائع کریں — محمود حسین

شفیع نقی جامعی

اَب اُنہیں ڈھونڈ ——

۹ ر اور ۱۰ ر اپریل ۱۹۷۵ء کی درمیانی رات ہے۔ جناح ہسپتال کراچی کے شعبۂ امراض قلب (کارڈیو ویسکولر) کے C.C.U یونٹ کے روم نمبر ۶ میں ڈاکٹر محمود حسین بستر علالت پر بے ہوش ہیں۔ بیہوشی کا سلسلہ تین دن سے جاری ہے۔ کمرہ میں دائیں جانب وہ مشینیں رکھی ہیں جن سے تنفس اور حرکتِ قلب کو مصنوعی طور پر جاری رکھا گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب سخت کوشش کر کے سانس لے رہے ہیں کمرہ نمبر ۶ میں اور باہر کنٹرول ٹیبل پر دو اسکرین لگے ہیں دونوں ایک سلسلے میں مربوط ہیں اس اسکرین میں ایک ننھا سا برقی نقطہ لہراتا ہوا دائیں سے بائیں گذر رہا ہے۔

اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ کو بمشکل تمام اوپر کی منزل میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی راتیں مستقل طور پر جاگتے کٹ رہی ہیں۔ میں اسکرین پر اس ننھے سے نقطہ کی گردش کو بغور دیکھ رہا ہوں حرکت میں یکسانیت ختم ہو چکی ہے کچھ اضطرابی اور غیر استحکامی کیفیت ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہو —— یکایک خطرے کی گھنٹی بجی ہے۔ دوسرے ہی لمحہ ڈاکٹر کمرہ میں داخل ہوا —— انجکشن لگایا —— ساتھ ہی ڈرپ کی رفتار بھی تیز کر دی —— ۲ بجکر ۱۵ منٹ ہو چکے ہیں —— تمام سینر ڈاکٹر ٹیلیفون سے اطلاع ملنے پر فوراً پہنچ چکے ہیں —— کمرے کے سفید پردے کھینچ دیئے گئے ہیں —— اسکرین پر وہ چھوٹا سا نقطہ خاصے وقفہ سے تڑپ رہا ہے۔ جیسے —— جیسے ڈاکٹر صاحب کی روح قفسِ عنصری سے باہر آنے کے لیے مچل رہی ہو —— ڈاکٹر شفقت صاحب کی ہدایت کے مطابق میں بالائی منزل سے ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ کو نیچے بلا لایا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ ماحول پر سکوتِ مرگ طاری ہے لیکن مشین کے ذریعہ آنے والی سانسیں یہ سکوت توڑ رہی ہیں —— ڈاکٹر صاحب موت سے زور آزما ہیں ——

سانس ان کا رک رہا ہے ۔ دل ہمارے دھڑک رہے ہیں ۔ ہمارے دلوں کی دھڑکن اور ہر دھڑکن کے ساتھ ایک نئی دعا ، گھڑی کی سوئی سب ایک ہی رفتار سے چل رہے ہیں ـــــــ ۲ بجکر ۳۸ منٹ ہو چکے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کی نبضیں تھم رہی تھیں مصنوعی سانس کی آواز بھی سناٹے میں گم ہوتی جارہی ہے اور اب ٹھیک ۲ بجکر ۴۰ منٹ پر اسکرین کا وہ نقطہ تڑپ کر اچھلا اور اچھل کر ساکت ہو گیا زندگی کی گاڑی رُک گئی ـــــ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو گئے ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

ہم سب کو باہر بھیجدیا گیا ۔ کوئی سسک سسک کر تڑپا اور کوئی بلک بلک کر رویا بہرحال سب بادیدۂ گریاں باہر آئے ۔ ہم طلبہ ہی ڈاکٹر صاحب کا سرمایۂ حیات تھے لیکن ہم محسوس کر رہے تھے جیسے ہمارا خزانہ لٹ گیا ہو ۔ ایسا لگتا تھا جیسے کلیجے حلق میں آکر اٹک گئے ہوں ـــــ آج جبکہ ڈاکٹر صاحب کی ملک وملت کو پہلے سے زیادہ ضرورت تھی ـــ آج جبکہ وہ سب کی نگاہوں کا مرکز ـــــ مسلموں کا دانشمند از حل حکومت اور طلبہ دونوں کے معتمد اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کی طلب بن چکے تھے اسی وقت عرصۂ حیات مختصر ہو گیا ۔

۶ر اپریل سے ۱۰ر اپریل تک کارڈیو ولیسکولر میں عیادت کے لیئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا ۔ جامعہ ملیہ کے طلبہ اور اساتذہ ۔ جامعہ کراچی کے طلبہ اور اساتذہ ڈاکٹر صاحب کے رفقاء اور احباب غیر ملکی سفارتی نمائندے ۔ ہم خیال بھی ۔ مختلف الخیال بھی ۔ حکام بھی ۔ خدام بھی ۔ امرا بھی ۔ غربا بھی سرکاری عہدیداران بھی گورنر اور وزرا بھی بریو وائس چانسلر پیار علی الانہ تو دن میں دو مرتبہ آئے ۔ انہوں نے تو ڈاکٹروں کی خصوصی ہدایات بھی دیں کہ ڈاکٹر صاحب کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے ۔ اگر کسی ایسی دوا کی ضرورت ہو جو پاکستان میں دستیاب نہ ہو تو بیرون پاکستان سے جہاں بھی ملے فوراً منگائی جائے اگر کسی ماہر ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو فوراً بلوا لیا جائے ۔ حکومت جہاز چارٹر کرنے کے لیئے بھی تیار ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کی عیادت کے لیئے آنے والوں میں ، میں اس خاتون کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ۸ر اپریل کو چھٹے کے وقت عیادت کے لیئے آئیں تو ان کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک بڑا سا

گلدستہ تھا جس میں اودے اور سفید ڈھیر سارے پھول تھے ــــ یہ وہ وقت تھا جب عیادت کرنے والوں کا ہجوم بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کمرے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی چنانچہ ڈاکٹروں نے اس خاتون کو بھی کمرے میں داخل ہونے سے روک دیا وہ مایوس سی ہو گئیں ــــ پھر گلدستہ سے ایک ایک پھول نکال نکال کر ڈاکٹروں اور نرسوں میں تقسیم کر دیا پھر ملتجیانہ نگاہوں سے ڈاکٹروں کو دیکھا۔ خدا جانے ڈاکٹروں کے دل میں کیا آئی۔ انہوں نے خاتون کو کمرے میں جانے کی اجازت دے دی میں اس پورے منظر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ گلدستہ ڈاکٹر صاحب کے سرہانے رکھا اور خود ڈاکٹر صاحب کے پاؤں کی سمت چند لمحے خاموش کھڑی رہیں پھر ہاتھ سے اپنے سینے پر "صلیب" کا نشان بنایا اور الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ یہ کرسچن خاتون ڈاکٹر صاحب کی کوئی شاگرد تھیں۔ وہ تو چلی گئیں لیکن میرے ذہن پر ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا ایک نشان ثبت ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب فاتحین کا حال پڑھانے والے "تاریخ" کے استاد ہی نہیں خود بھی بہت بڑے فاتحِ زمانہ تھے کیونکہ وہ لوگوں کے دل فتح کر لیتے تھے۔

آج سوچتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت مجھے ہشت پہلو نظر آتی ہے، بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی تین حیثیتیں بڑی نمایاں تھیں ــــ "ڈاکٹر صاحب" ــــ "شیخ الجامعہ" اور "ڈاکٹر محمود حسین" ــــ ڈاکٹر صاحب کی حیثیت کا جہاں تک تعلق ہے اس حیثیت میں میں نے چودہ سال تک انہیں شب و روز دیکھا وہ

ع   ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

کے مصداق ہم طلبہ کے لیے پیر کامل اور ہمارے اساتذہ کے لیے رہنما تھے۔ وہ جامعہ ملیہ کے بانی تو تھے ہی لیکن اس ادارے کی ہمہ گیر تعمیر و ترقی سے انہیں دلی محبت تھی۔ یہی ادارہ ان کا حاصلِ زندگی تھا۔ یہاں اگر ایک تازہ کونپل بھی پھوٹتی تو ان کے دل میں بہاریں رقص کرنے لگتیں جامعہ ملیہ کے طلبہ دوسرے اداروں سے انعامات حاصل کر کے لوٹتے تو ان کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ مجھے خوب یاد ہے جب مجھے جامعہ ملیہ میں دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور میٹرک میں پوزیشن لینے پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے جب ادارے سے نسبت قائم رکھنے کے لئے مجھے "جامعی" کہا گیا اور پھر جب میں نے اپنے نام کے ساتھ "جامعی" کا اضافہ کر لیا تو سو سو طرح خوش ہوئے اور خوب خوب سراہا۔ میں سولہ برس سے ڈاکٹر صاحب کو

دیکھ رہا ہوں ـــــ لیکن میں نے کبھی یوں نہ دیکھا کہ وہ اتوار کو کراچی میں ہوں جامعہ ملیہ تشریف نہ لائیں۔ بلاناغہ ہر اتوار کو موجود، اپنی ڈھیر ساری مصروفیات کے باوجود ـــــ جامعہ ملیہ کی ہر تقریب میں دل و جان سے شریک ـ حتیٰ کہ عیدین کی نمازوں میں بھی جامعہ ملیہ ہی کے مرکزی مسجد میں ادائیگی نماز ـــــ سیکریٹری عبدالحی صاحب (مرحوم) کے ساتھ ایک ایک عمارت کا سرد ئے بورڈنگ کا معائنہ " ایک دن کے مدرسے " میں (جو سال میں ایک مرتبہ طلبہ کے راج کا دن ہے جس میں ادارے کی ساری ذمہ داریاں طلبہ سنبھالتے ہیں) خود بھی آتے دوسروں کو بھی لاتے ـــــ۔

ـــــ ڈاکٹر صاحب کو قلم چلاتے توسبھی نے دیکھا ہے لیکن میں نے انہیں ہم طلبہ کے ساتھ کدال اور پھاوڑے چلاتے بھی دیکھا ہے ـــــ آہ

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

"شیخ الجامعہ" ـــــ کی حیثیت سے وہ جامعہ کراچی اور کراچی کے تمام کالجوں کیلئے تعلیمی رہنما تھے ـ یہاں بھی مجھے ڈاکٹر صاحب کی زیر سرپرستی دو سال گذارنے کا موقع ملا ہے۔ جامعہ کراچی میں اُن کے ساتھ گزرنے والی ساعتیں جو سیاسی شعور، غور و فکر کا سلیقہ، مسئلوں کا باتدبیر اور پر امن حل ہمیں دے گئیں وہ آج بھی ہمارے دلوں پر نقش ہے ـ سیاست سے بالا تر، غیر ضروری مداخلت سے دور اور دقت پڑنے پر طلبہ کے لیے اپنا حق استرداد تک طلبہ کے لیے استعمال کرنے سے دریغ نہ کرنے والا شیخ الجامعہ ہمیں شاید ہی اب میسر آئے ـ جامعہ کراچی کا مالی خسارہ ـ اس کے لیے شیخ الجامعہ کی فکر مندی، اساتذہ کی کمی کا مسئلہ، کثرتِ طلبہ کی پرابلم ـ یہ ایکشن کمیٹیاں ـ مطالبات کا انبار، مسائل کی بھرمار کوئی ایک مسئلہ ہو تو آدمی حل بھی کرے لیکن ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ہر محاذ پر سینہ سپر ہیں ـ سچ کہا ہے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے ـــــ " ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے آپ کو بچا بچا کر نہیں رکھا۔ طلبہ آج بھی کہتے ہیں کہ ہم جب بھی ان سے ملے وہ ہم سے ٹوٹ ٹوٹ کر ملے ـ ہر ایک کو یہ احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شفقت بس اس کے لیے ہے ـ وہ چلتا پھرتا، جیتا جاگتا پیغام محبت تھے ـ ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ـ

۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس تھے پھر وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اس زمانے میں شعبۂ تاریخ میں ایک ملازم تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب

روانہ ہونے لگے تو وہ شخص رو رو کر کہنے لگا ——— " غلطی میری ہے۔ میں دعا کرتا تھا کہ خدا ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلر بنا دے لیکن یہ کہنا بھول گیا کہ کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دے " ——— دعا گو کی معصومیت اور پر خلوص دعا ایک طرف لیکن اساتذہ، طلبہ اور ملازمین میں ڈاکٹر صاحب کی مقبولیت بجائے خود ایک بڑی چیز ہے ۔

سنڈیکیٹ کی کئی میٹنگوں میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کئی نشستیں رہیں آخر دنوں میں ایک میٹنگ میں ڈاکٹر صاحب اشاروں میں اپنے رخصت ہونے کی بات کہہ گئے، تمام ممبران نے انہیں مجبور کیا کہ وہ " ٹھہریں " کیونکہ موجودہ حالات میں جامعہ کراچی کو صرف وہی سنبھال سکتے ہیں اس وقت ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا ۔

" ——— یہ دن میرے پاس امانت ہیں اور چاہتا ہوں کہ اب کچھ اپنا تحقیقی کام مکمل کر لوں، میں چالیس سال اس تعلیمی میدان میں گذار چکا ہوں ——— "

ہم نے مجبور کر کے انہیں ٹھہرا تو لیا۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ " امانت کے دن " واقعی بہت تھوڑے ہیں ۔

——— ڈاکٹر صاحب کی تیسری حیثیت " ڈاکٹر محمود حسین " کی ہے۔ اس حیثیت میں وہ تحریک پاکستان کے ایک کارکن، پاکستان کے ایک بڑے اسکالر تھے اس حیثیت میں وہ نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی مقبول و محترم تھے ۔ تحریک پاکستان کے ایک کارکن ہونے کے تعلق سے انہیں پاکستان سے بے پناہ محبت تھی وہ کشتِ ویراں سے مایوس نہیں تھے بلکہ اپنے خون جگر سے نم کر کے اس مٹی کو زرخیز بناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے ——— " نظریۂ پاکستان " پر انہیں غیر متزلزل یقین تھا۔ مشرقی پاکستان میں جب " بنگلہ دیش " کی تحریک عام ہو گئی ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اس تحریک کا گڑھ بن گئی اور مشرقی پاکستان ——— مغربی پاکستان سے نفرت کے سیلاب میں ڈوب گیا ایسے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب کو شرکت کا خصوصی دعوت نامہ ملا۔ رفقاء اور احباب نے شرکت نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن ڈاکٹر صاحب بضد رہے کہ میں ضرور شریک ہوں گا۔ چنانچہ شریک ہوئے پھر چند لوگوں نے حالات کی خرابی کے پیش نظر تقریر کے چند حصوں کو قلمزد کرنے کا مشورہ دیا لیکن ڈاکٹر صاحب

نے یہ مشورہ بھی مسترد کر دیا اور جو باتیں کہیں وہ صرف ڈاکٹر محمود حسین ہی کا حصہ تھیں ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی اور یہ باتیں اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں کہتا تو شاید بچ کر واپس نہ آتا ۔ لیکن یہ ڈاکٹر صاحب کے خلوص و محبت کی شبنم ہی تھی جس نے نفرت کے شعلوں کو بھڑکنے نہ دیا اور وہ بنگلے میں اذان دے آئے ۔

بین الاقوامی سطح پر ڈاکٹر محمود حسین پاکستان کے عظیم اسکالرز میں سے ایک تھے اور شاید سرفہرست بھی ۔ "کولمبیا" یونیورسٹی میں پڑھ کر لوگ فخر کرتے ہیں لیکن اس یونیورسٹی میں پڑھا کر بھی ڈاکٹر صاحب کو فخر نہ تھا ۔ آہ ! اے چشم نم ۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر ۔

زبان مافی الضمیر کی ادائیگی کا ذریعہ ہے ، صدیوں کے ارتقاء نے اس کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ علوم و فنون کے گنجینے اس میں محفوظ ہو گئے ۔ اور یہ خزانے بجائے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے تصانیف کے ذریعے ہم تک پہنچے ۔ تعلیم کا اصل مقصد کتابوں کے توسط سے ، نونہالانِ وطن کے لئے علم کی خوشہ چینی کے مواقع پیدا کرتا ہے ۔ تاکہ ہر شخص اپنی بساط اور ظرف کے مطابق مستفید ہو سکے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کسب سب سے بہتر طریقہ پر اپنی زبان میں ہی ہو سکتا ہے ۔ تاریخ ادب میں کہیں ایسی مثالیں نہیں ملتیں کہ عربوں نے لاطینی زبان میں یا ہندیوں نے ساسانی زبان میں علم حاصل کیا ہو ۔ ہر قوم نے اپنی زبان میں تحصیل علم کی ۔

ہاں یہ ضرور کیا کہ جہاں کہیں بھی ، کسی زبان میں ، یا سرزمین پر ، سبز گل دیکھا اپنے لئے چن لیا ۔ ہماری زبان اُردو ہے ۔ اس لئے یہی ابتدا سے انتہا تک ذریعہ تعلیم ہونی چاہیئے ۔ محمود حسین

انوار احمد خاں

صبر و تحمّل کا پیکر

ڈاکٹر محمود حسین خان مرحوم سے میری پہلی ملاقات گیارہ بارہ سال پہلے جانے کس موقع پر اور کس طرح ہوئی تھی یہ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی شاندار اور جاذب نظر شخصیت نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اُن سے ملنے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا رہا میں اُن کی اعلیٰ شخصیت سے اس لئے بیحد متاثر رہتا تھا کہ وہ مجھ جیسے معمولی اور غیر تدریسی ملازم کیساتھ ایسے اخلاق اور ایسی مسکراہٹ سے ملتے تھے جس کا رواج آجکل نہیں رہا ہے۔ اُن کی مسکراہٹ دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ زیادہ دیر تک اُن کے ساتھ رہا جائے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ شیخ الجامعہ نہیں تھے بلکہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور تاریخ کے پروفیسر تھے لیکن جب انہیں شیخ الجامعہ کے عہدے پر فائز کیا گیا تو حالات کافی بدل چکے تھے۔ ٹریڈ یونین کے ذریعے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کے جس جذبے کو میں عرصہ ہوا دفن کر چکا تھا۔ وہ پھر سر ابھارنے لگا تھا اور بالآخر میں جامعہ کراچی کی ایمپلائز یونین کا ایک عہدیدار چن لیا گیا اور یہیں سے وہ بدقسمت دور شروع ہوتا ہے جب مرحوم اور راقم الحروف کے درمیان آجر اور مزدور لیڈر کا رشتہ قائم ہوا۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آجر اور ٹریڈ یونین لیڈر اور خود ٹریڈ یونین کے درمیان تعلقات پر کچھ روشنی ڈالی جائے ورنہ ڈاکٹر محمود حسین خان کی شخصیت ایک آجر کی حیثیت سے واضح نہ ہو سکے گی۔

لعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ مرحوم ایک نیم سرکاری ادارے کے سربراہ (شیخ الجامعہ) ضرور تھے لیکن آجر نہ تھے کیونکہ اس ادارے کے ملازمین کو اُجرت حکومت کی جانب سے ملتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آجر کا نمائندہ بھی آجر ہی ہوتا ہے اس لئے کہ وہ ملازمت برقرار رکھنے یا ختم کر دینے کا مجاز ہوتا

ہے۔ ترقی اور تنزلی کے ضابطے موجود ہونے کے باوجود وہ اپنی آجرانہ حیثیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے علاوہ ازیں مراعات دینے یا سلب کرنے کیلئے وہ مناسب طاقت رکھتا ہے۔ اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ عام طور پر وہ آجر جو "بے اختیار" ہونے کی وجہ سے قدم قدم پر حکومت کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں پھر بھی وہ مزدور کے خلاف ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں لیکن ایک ایسا آجر جو "بااختیار" ہو مجاز ہو اور جواب دہ بھی نہ ہو اس کا اندازِ فکر اور طریقۂ کار اور جذبات و احساسات کیسے تھے۔ کیا واقعی وہ ایک دردمند انسان، کم اُجرت پانے والے ماتحتوں کے مسائل سے واقف اور انہیں حل کرنے میں مددگار و معاون تھا یا نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم کے دور میں درجہ سوم و چہارم کے ملازمین کے مسائل ہی نہیں بلکہ جامعہ کے دوسرے شعبوں سے بھی مسائل کی بھرمار رہی ہے اور یہ قدرتی بات تھی کہ وہ طلبا کے مسائل کو اولیت دیتے۔ اساتذہ کو ان کا مقام اور حیثیت دلوانے میں کوشاں ہوتے لیکن سابقہ تمام روایتوں کو توڑتے ہوئے مرحوم نے غیر تدریسی ملازمین کے مسائل کے حل کیلئے بھی حتی الوسع کوششیں کیں۔ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر خود کو غیر تدریسی ملازمین سے بہت زیادہ قریب کر دیا۔ چنانچہ ایمپلائز یونین کے نمائندے سیکڑوں بار ڈاکٹر مرحوم سے اپنے مسائل کے سلسلے میں ملے ہوں گے۔ لیکن ایک بار بھی ان کی جانب سے کسی عنوان بیزاری کا اظہار نہیں ہوا خصوصاً راقم کو یونین کے صدر کی حیثیت سے اور سید جمال الدین صاحب کو جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مسائل پر بات کرنے کے بہت سے مواقع ملے چنانچہ ہم لوگوں نے ٹریڈ یونین کی روایتی شدت کا بھی سہارا لیا..... خصوصاً میرے ساتھیوں کا خیال ہے کہ میرے مزاج میں شدت کچھ زیادہ ہی ہے جو ٹریڈ یونین لیڈر کیلئے مفید ہوتی ہے لیکن آج مجھے کتنا افسوس ہوتا ہے۔ ان دنوں کو یاد کرتا ہوں جب میری طرف سے دلائل کی بھرمار ہوتی تھی اور الفاظ میں سختی۔ اندازِ تخاطب میں حفظِ مراتب کی کمی اور مرحوم کی نرم اور ٹھہری ہوئی گفتگو کے نتیجے میں میرا جھنجلا جھنجلا کر بکھرنا...... میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں، ایک طرف شوریدہ سر نوجوان تیز و تند گفتگو کر رہا ہے جیسے تیرہ سو آدمیوں کے لیڈر ہونے کا گھمنڈ ہے اور یہ خیال ہے کہ اس کی پشت پر نہ صرف اپنی یونین کے مزدور ہیں بلکہ پاکستان بھر کی جامعات کے ہزاروں کارکنان کی فیڈریشن ہے

دوسری طرف تمام انتظامی اختیارات کا حامل اور ہر قسم کے انتظامی فیصلوں میں با اختیار وائس چانسلر صرف مسکرا مسکرا کر گردن ہلا ہلا کر بہت ہی تحمل اور انہماک سے تیز تیز الفاظ سن رہا ہے بلکہ پی رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سر پھرے نوجوان میں کچھ تلاش کر رہا ہے، وہ اس کی ہمت افزائی کر رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے "کچھ اور باقی ہے، مزید کچھ اظہار کرنا چاہتے ہو؟ لاؤ دل کی گہرائیوں سے کچھ تلخیاں اور انڈیل دو۔ تم نئی نسل کے نوجوان ہو...... ان تمام محرومیوں کو ہم بوڑھوں پر تھوپ دو........ اتار لو اپنا غصہ نکال لو اپنی جھنجلاہٹ۔ ہم بوڑھے اور تمہارے خیال میں ظالم لوگوں پر........ پھر شاید تم کو موقع نہ ملے۔"

اس جانب دلائل ختم ہو گئے۔ جوش سرد ہونے لگا۔ ابال اتر چکا۔ تو اس طرف سے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ ارشاد ہوا۔ "آپ نے جو مسائل پیش کئے ہیں وہ تحریری صورت میں مجھے دے دیں۔ میں اسے سنڈیکیٹ میں رکھ دوں گا۔" ادھر پھر ایک پٹاخا چھوٹا۔

"واہ ڈاکٹر صاحب! آپ خود ہی حکم کیوں نہیں دیتے؟" بڑے تحمل سے جواب ملا۔ "ضابطے کے خلاف میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ اپنی حد تک مجھے آپ کی ایک ایک بات سے اتفاق ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ جو کچھ آپ مانگ رہے ہیں میرے پاس ہو تو ابھی اور اسی وقت دے دوں لیکن آپ خود بھی جانتے ہیں کہ میں مجبور ہوں۔ کہنے کو یہ ایک خود مختار ادارہ ہے لیکن اس ادارے کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بہر حال اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ اپنے ان تاثرات کے ساتھ اسے آگے بڑھا دوں"......... کاش وہ اس وقت اتنا اور کہہ دیتے کہ تمہارا اندازِ فکر درست ہو سکتا ہے لیکن یہ اندازِ گفتگو احمقانہ ہے۔ باغیانہ ہے اور میری بلند و بالا شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن شاید وہ اس قسم کے الفاظ اور جذبات سے ناآشنا تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین خان مرحوم کی زندگی کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے اور یہ پہلو اُن کی شخصیت کی عظمت سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا دل و دماغ جذبۂ انتقام سے یکسر پاک تھا۔ وہ غم اور غصے سے دوچار ہونے کے باوجود لوگوں کے ظلم و ستم اور زیادتیوں کو سمجھتے ہوئے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی کبھی بھول کر یہ نہیں سوچتے تھے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ حیرت کی

بات یہ ہے کہ میں اکثر اس کا منتظر رہا کہ شاید ڈاکٹر صاحب اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کریں گے لیکن اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔

یہ بات تو پاکستان بھر میں کسی سے پوشیدہ نہیں رہی ہے کہ جامعہ کراچی میں مسائل زیادہ ہیں اور وسائل محدود ہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک بات یہ ہے کہ جامعہ کی حدود میں مرحوم شیخ الجامعہ کیلئے جو مسائل پیدا کئے گئے ان میں سے اکثر ایسے رہے ہیں جن کے پیچھے ذاتی اغراض، پیشہ وارانہ رقابت اور ذاتی شہرت کو دخل تھا۔ آج جب ہم میں سے ہر شخص اس کا دعویدار ہے کہ مرحوم کی شخصیت لاجواب تھی وہ علم و حلم کا مجسمہ تھے اور آج ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد ہم ان کی شان میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں ذاتی شہرت اور خود کو ان کی ذات سے منسلک کر کے شہرت حاصل کرنے کا جذبہ زیادہ ہے بلکہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو یہ عرض کروں گا کہ بیشتر مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ تو کیا میرا یہ سوال بے جا ہوگا کہ آئیے مرحوم کی تعریف و توصیف کو کچھ دیر کیلئے روک کر ہم اپنا محاسبہ کرلیں اور اس بات کو مان لیں کہ ہم نے انہیں صرف مسائل دیئے اور اپنی ذات کیلئے نفع ہی نفع حاصل کیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کی بلندی اور جامعہ سے باہر عوامی حلقوں میں ان کی مقبولیت کا اظہار ایک موقع پر اس طرح ہوا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میں لیبر اینڈ منسٹریشن کے ٹریننگ کورس میں شریک تھا اس کورس میں تمام طالبعلم ٹریڈ یونینسٹ اور مزدور یونینوں کے عہدیدار ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ واہ آرڈیننس فیکٹری کی ایمپلائز یونین کے صدر جناب عبدالغفار صاحب بھی تھے وہ ایک نہایت قابل اور سنجیدہ آدمی تھے اور میں اُن پر رشک اس لئے کرتا تھا کہ وہ چوبیس پچیس ہزار آدمیوں کے منتخب کردہ صدر تھے جب کہ میں صرف تیرہ سو آدمیوں کی یونین کا صدر۔ اس مناسبت سے میں اکثر ان کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن جب غفار صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ میں کراچی یونیورسٹی کا ملازم ہوں اور ڈاکٹر محمود حسین خان کا ماتحت ہوں تو الٹا وہ مجھ پر رشک کرنے لگے بلکہ کئی مرتبہ واضح الفاظ میں انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ آپ خوش نصیب ہیں کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں جیسی عالم اور انسان دوست شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے۔ غرض کہ غفار صاحب کے بار بار اصرار کرنے پر میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے اُن کی ملاقات کرائی ملاقات ہونے پر غفار صاحب نے اسے اپنے لئے بڑی سعادت سمجھا اور اس کا اظہار

بھی ڈاکٹر صاحب پر کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس قدر عجیب آدمی تھے کہ اپنی بڑائی سن کر بوکھلا گئے اور عجیب انداز میں پریشان ہو گئے۔ یہ کسرِ نفسی اس روایتی صورت میں نہیں تھی جس میں خود بڑائی کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے سیدھے اور سادے ذہن پر اپنی تعریف سُن کر بڑا بوجھ پڑتا تھا۔ اور اس کے برعکس میرے بارے میں مہمانوں سے تعریف کے پل باندھتے رہے اور میں یوں محسوس کرتا رہا کہ جیسے گھڑوں پانی پڑ رہا ہو جبکہ مرحوم کا مقصد صرف یہ تھا کہ مہمانوں پر میری شخصیت کا اچھا اثر قائم ہو جائے۔

میں اسے اپنی خوش نصیبی کہوں یا بدنصیبی کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے تھوڑے ہی دن پہلے مجھے اس شفیق، حلیم اور مجسمۂ شرافت کی شخصیت و عظمت کا احساس ہوا۔ بہر حال لوگ کہتے ہیں کہ مرحوم کے انتقال سے کوئی استاد سے محروم ہوا۔ کوئی مورخ سے کوئی عالم سے اور ملک ایک دانشور اور مدبر سے۔ یہ سب باتیں درست ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور میں قطعی سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ کراچی یونیورسٹی کے تیرہ سو ملازمین ایک ایسے شفیق، مہربان اور ناصح بزرگ سے محروم ہو گئے کہ اُن جیسا اب دوبارہ نصیب ہونا مشکل ہے۔

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ صرف سرکاری دفاتر میں اُردو کو رواج دیا جائے بلکہ دوسرے غیر سرکاری اداروں میں بھی اُردو کو رائج کیا جائے۔ زبانیں قوموں کی طرح عوام کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہیں۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ابھی تک ہمارے عوام وقت کی اس اہم پکار پر خاموش ہیں۔ سب کام حکومتیں سرانجام نہیں دے سکتیں۔ قوم کا تعاون، تعمیری کاموں میں خاص طور پر ضروری ہے۔ محمود حسین

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

بڑوں کی نشانیاں

اتوار کا دن، صبح نو ساڑھے نو بجے کا وقت، ملیر کی کھلی فضا، جامعہ تعلیم ملیہ کے سکریٹری ماسٹر عبدالحیٔ مرحوم کا کمرہ، چار چھ آدمی بیٹھے ہیں۔ جامعہ ملیہ کے سارے ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر طرف چہل پہل ہے۔ ماسٹر صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک صاحب نے پوچھا " ساڑھے نو ہو رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔ ماسٹر صاحب بولے، ہاں آج انھیں صبح آٹھ بجے فلاں کے سوم میں جانا تھا۔ شاید اس لئے دیر ہوئی آنے ہی والے ہوں گے " بات ابھی ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ بولے " دیکھو وہ آگئے " سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ سلام کے لئے پہلے ہی سے ہاتھ اٹھائے ہوئے، ایک ایک سے ہاتھ ملایا، خیریت پوچھی، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر لطیفے شروع ہوئے قہقہے لگے۔ ہفتے بھر کا سارا غم دور ہو گیا۔ اسی عالم میں دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر صاحب نے پہلو بدلا اور ماسٹر صاحب سے پوچھا، ہاں تو مجلس کی میٹنگ کا کیا وقت ہے؟ کالج میں بھی ایک جلسہ ہے لڑکیوں کے اسکول میں بھی کوئی فنکشن ہے۔ ایک صاحب کو میں نے جامعہ دکھانے کے لئے بھی بلایا ہے، پھر کیا تھا ڈاکٹر صاحب بھی کام میں لگ گئے اور دوسرے بھی۔ تفریح کے وقت تفریح اور کام کے وقت کام محض ایک مقولہ نہیں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا معمول تھا۔

جس اتوار کو نہ کوئی میٹنگ ہوتی اور نہ کوئی جلسہ، تو پھر ڈاکٹر صاحب پورا اتوار تفریح طبع میں گزارتے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ پھر ان کی نظریں تاش کھیلنے والے ساتھیوں (ڈاکٹر اسمٰعیل سعد، ظہور صاحب، نیاز صاحب) کو تلاش کرنے لگتیں۔ دس ساڑھے دس بجے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، اسمٰعیل ابھی تک نہیں آئے۔ ماسٹر صاحب نے کہا، فون آیا تھا، کہہ رہے تھے، ذرا دیر سے پہنچوں گا، ڈاکٹر صاحب بولے ' عجیب آدمی ہیں مجھ سے کہا تھا ساڑھے دس بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ اچھا تو ظہور صاحب کہاں ہیں، ماسٹر صاحب!

اکرم کو بھیج کر انھیں بلوا لیتے اتنے میں ظہور صاحب آ گئے ، نیاز صاحب موجود ہی تھے۔ اسمٰعیل صاحب کی جگہ ماسٹر صاحب نے لے لی اور کھیل شروع ہو گیا۔ اور کھانے کے وقت تک جاری رہا۔

بعض اتوار کو کھیلنے کا پورا موقع نہ ملتا ، یکے بعد دیگرے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے بہت سے لوگ جامعہ ملیہ پہنچ جاتے۔ تانتا سا بندھ جاتا ، ڈاکٹر صاحب کھیل چھوڑ دیتے ہر ایک سے مل کر اس کا دل خوش کرتے ، لوگ اپنی ضرورتیں بتاتے۔ ڈاکٹر صاحب ممکن امداد کرتے۔ کسی کے لئے فون کر دیا کسی کو خط لکھ دیا اور کسی کے ساتھ چلنے کا وعدہ کر لیا ، غرضکہ صبح سے شام تک جامعہ ملیہ میں اتوار کو جس طرح کی رونق رہتی تھی۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دم قدم کی بدولت تاحدِ نظر تازگی و شگفتگی فضا میں بکھر جاتی تھی۔ زندگی اپنے روشن امکان پر رقص کرنے لگتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی رجائی شخصیت اور جاندار گفتگو مردوں میں جان ڈال دیتی تھی۔ مایوسیاں چھٹ جاتی تھیں اور امید کے کنول جسم و جان میں کھل اٹھتے تھے۔ ان کا تکلم و تبسم ، ماحول میں محبت و شرافت کا رس گھول دیتا تھا۔ اصغر گونڈوی کا یہ شعر انھیں کے اندازِ گفتگو پر صادق آتا ہے ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی　　　یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کتنی ہی یادیں اور کتنی ہی باتیں جامعہ ملیہ کے حوالے سے ذہن میں ابھر رہی ہیں ، اسلئے کہ سولہ سترہ سال میں ایک دو نہیں ، نہ جانے کتنے اتوار ، میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جامعہ میں گزارے ہیں۔ جامعہ ملیہ کے تو میلئے جانے سے قبل تک میرا قیام جامعہ ملیہ کیمپس سے ملحق تھا۔ اتوار کو اساتذہ کے تربیتی اداروں میں اردو تدریس پر میرا اعزازی لکچر بھی ہوتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب سے ہر اتوار کو ملاقات ہوتی تھی۔ کسی اتوار کو نہ گیا تو وہ فون کر کے گھر سے بلوا لیتے تھے خاص کر ایسے موقعوں پر جبکہ جامعہ ملیہ میں اس دن کوئی علمی ادبی تقریب ہو۔ کبھی کبھی جب ان کا گذر ، میرے گھر کے سامنے سے ہوتا تو وہ جامعہ جاتے ہوئے مجھے گھر سے لے لیتے۔ غرضکہ ان کا پیار ، ان کی دلجوئی ، ان کے چہرے کی مسکراہٹ ، ان کے قہقہے ، ان کی پرسشِ احوال اور ان کی ہمت افزائی میرے اور مجھ جیسے بہتوں کے حق میں

بہت ارزاں تھی ۔ اس لطف ارزانی کی داستان اگرچہ لذیذ بھی ہے اور مجھے بہت عزیز بھی لیکن اس کا ذکر اس جگہ نہ چھیڑوں گا۔ یوں بھی اس قسم کی ذاتی باتوں سے دوسروں کو دلچسپی نہ ہوگی، ہاں ڈاکٹر صاحب کو میں نے کیسا پایا اور ان کی صحبتوں میں کیا کچھ سیکھا ۔ اس کا مختصر ذکر البتہ کروں گا ۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ڈاکٹر محمود حسین ایک غیر معمولی مورخ، غیر معمولی ماہر تعلیم اور غیر معمولی دانشور تھے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مجھ جیسے بے بصر لوگوں میں بھی نہ تھے، پاکستان میں اس وقت، تعلیم و تعلّم اور فکر و دانش کی نمائندگی کرنے والا جو بھی اچھا بُرا طبقہ موجود ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر محمود حسین کا دم بہت غنیمت تھا بلکہ اس سلسلے میں ان کا قد و قامت بہتوں سے بلند بھی تھا ۔ ان کی سوچ اور نظر، کسی مسئلے میں ممکن ہے بہت بلند نہ رہی ہو لیکن ان کا شمار پست نظروں میں نہیں کیا جاسکتا ۔ تعلیم و تدریس سے لے کر ملّی سیاست و قیادت تک ان کی نظر خاصی بلند تھی، کم از کم اتنی بلند ضرور کہ پاکستانی معاشرے میں اس کی مثالیں بہت آسانی سے نہیں مل سکتیں ۔ ان میں ایک خاص بات جو اُن کے قبیل کے لوگوں میں کم دیکھنے میں آئی ہے، یہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر مسئلے میں ایک ذاتی رائے رکھتے تھے یہ رائے سنی سنائی نہیں انفرادی غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہوتی تھی، اسی لئے اٹل ہوتی تھی ۔ رائے کے مسئلے میں وہ موقع محل کو دیکھ کر پہلو بدل لینے والے آدمی نہ تھے ۔ جو کچھ دل میں رکھتے تھے اور جس بات کو جس طرح صحیح سمجھتے تھے اس کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے ۔

پھر یہ بھی تھا کہ کسی مسئلے میں بھی ان کی فکر محض نظری یا مجرّد نہ تھی یعنی وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو نظری طور پر عقیدہ کچھ رکھتے ہیں اور عمل اس کے برعکس کرتے ہیں ۔ ان کے فکر و عمل میں پوری مطابقت تھی ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فکر و عمل کے درمیان دو قدم کا بھی فاصلہ نہیں تھا ۔ دونوں کی سرحدیں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ انھیں فکر سے آگے بڑھ کر عمل کے میدان میں داخل ہو جانے میں دشواری نہ ہوتی تھی بلکہ ان کے کام کرنے کے ڈھب سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فکر کو عمل کے بغیر بے معنی چیز سمجھتے تھے ۔ ممکن ہے

یہ بات ان کے اندر ان کے محبوب شاعر علامہ اقبال کے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا جوہر سے شدید ذہنی و قلبی وابستگی کا نتیجہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو کچھ سوچتے تھے اسکو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے یا کر گذرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ شاید اسی لئے اہم سے اہم مسئلے میں بھی بہ عجلت فیصلہ کر لیتے تھے ۔ جب کسی مسئلے میں دوسرے فیصلہ کرتے ہچکچاتے یا ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتے تو وہ انگریزی کا یہ مقولہ دہراتے تھے کہ فیصلہ نہ کرنے سے غلط فیصلہ کرنا بہتر ہے[١] ۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی فیصلہ خواہ کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ کیا جائے، جب اسے عملی جامہ پہنایا جائے گا تو غلطیوں کا احساس بہرحال ہوگا، اسی لئے وہ ہر مسئلے میں عملی اقدام کو سوچ کی طوالت پر ترجیح دیتے تھے ۔

فکر کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں بھی ان کا مخصوص طریقہ کار تھا ۔ وہ کام کو مختلف افراد یا کمیٹیوں میں بانٹ دیتے تھے اور جس کے سپرد جو کام کرتے تھے اس پر ہر طرح اعتماد کرتے تھے ۔ اگر وہ کسی کام کے سربراہ ہیں تو چاہتے تھے جو کام جس ماتحت کے سپرد ہے، اسی کے ذریعے اس کام کو ان تک پہنچنا چاہیے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام میں ان کا رویہ یہی تھا ۔ اس اعتماد اور اصول پرستی کے نتیجے میں ماتحت عملے کا ہر فرد ان سے مطمئن اور خوش رہتا تھا ۔ سب کو علم ہے کہ بہت سے لوگ اپنی نجی ضرورتوں کے تحت ڈاکٹر صاحب سے ملتے تھے اور اپنے مسائل کے سلسلے میں سفارش کے طلبگار ہوتے تھے ڈاکٹر صاحب بہت سی باتوں میں بااختیار ہوتے تھے ۔ اور چاہتے تو اس کام کو اپنے حکم یا قلم سے کر دیتے لیکن ایسا کرنا ان کے مزاج اور اصول دونوں کے خلاف تھا ۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ لوگ جامعہ ملیہ کے تعلیمی اداروں میں اپنے بچوں کا داخلہ چاہتے تھے اور اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب فوراً حکم صادر فرمادیں گے لیکن وہ کبھی ایسا نہ کرتے تھے اور ادارے کے سربراہ سے ملنے کا مشورہ دیتے تھے اور اپنے کو یکسر بے اختیار ظاہر کرتے تھے اس سے ان کا مقصد ادارے اور ادارے کے سربراہ کے احترام کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا تھا ۔ ان کے اس رویئے سے اداروں کے سربراہوں کا وقار، عام و خاص سب میں برقرار رہتا تھا ۔ غرض مندوں

A WRONG DECEISION IS BETTER THAN NO DECISION. ١؎

کی غرض بھی سلیقے کے ساتھ پوری ہو جاتی تھی، اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی انداز سے اپنی سفارش سربراہ تک پہنچا دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک بنیادی وصف یہ بھی تھا کہ نہ تو وہ خود کسی کی برائی کرتے تھے اور نہ کسی کی برائی سننا پسند کرتے تھے۔ ہاں اصولوں پر تبادلۂ خیال اور تنقید کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتے تھے اور بحث میں بے باکی کے ساتھ حصہ لیتے تھے لیکن اس پر جب لوگ کسی کی ذاتی برائیاں گنوانے لگتے تو وہ ان کی باتوں سے خوش نہ ہوتے۔ ان کا رنگ رُخ بدل جاتا۔ وہ جبراً قہراً، مخاطب کی بات سن لیتے تھے لیکن اس کی ہمنوائی انکے بس کی نہ تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ عموماً یکسر خاموش بیٹھے رہتے تھے، لیکن کبھی کبھی غم و غصہ سے مغلوب بھی ہو جاتے تھے۔ ان کی شخصیت و کردار کے اس وصف کو میں نے ان کے پیرائیہ عمل میں بھی پوری طرح جلوہ گر دیکھا ہے وہ اچھے بُرے ہر قسم کے آدمی سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لے لینے کو منتظم کی سب سے بڑی خوبی سمجھتے تھے۔ جامعہ ملیہ میں ابتدائی مدرسے سے لیکر کالج تک متعدد ادارے ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے مسائل تھے اور ان کو حل کرنا ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داری تھی۔ اداروں کے بعض نگراں ان کے سامنے یہ شکایت لے کر بیٹھ جاتے کہ فلاں فلاں کام نہیں کرتے۔ دیر سے آتے ہیں چھٹیاں بہت لیتے ہیں، بات بات پر لڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب پوری بات غور سے سنتے پھر نہایت نرم لہجے میں سمجھاتے۔ "یہ دنیا ایسی ہی رہی ہے اور رہے گی۔ افراد اچھے بُرے ہر طرح کے پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انھیں سے کام لیجئے اور کام چلائیے اچھوں سے تو سبھی کام لے لیتے ہیں۔ بروں سے کام لینا مانا مشکل ہے لیکن سب نے اچھوں ہی کو اپنا لیا تو بُرے کہاں جائیں گے۔" ڈاکٹر صاحب کی ان باتوں کا خاصا اچھا اثر ہوتا، طرفین میں مطابقت کی صورت، کچھ دنوں میں پیدا ہو جاتی۔ میرا اندازہ ہے کہ اچھے اور بُرے کو اپنانے کا یہ تصور، ڈاکٹر صاحب کو آنحضرتؐ کے قول اور مولانا جوہر کے ایک شعر سے ملا تھا سب کو علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو مولانا جوہر سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ انکی زندگی اور شخصیت سے اتنا متاثر تھے کہ مولانا جوہر ٹرافی کی سالانہ تقریب میں جب بھی

تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو خلاف معمول جذبات سے مغلوب ہو جاتے، آواز بھرّا جاتی اور آنکھیں نمناک ہو جاتیں آخر میں جوہر کے چند اشعار بھی ضرور سناتے تھے اور ان میں یہ یہ نعتیہ شعر بھی ہوتا تھا ؎

کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے　　　اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

ایک اور صفت ان میں تھی، وہ اپنے ملنے والوں کی ذاتی باتوں اور ان کے رازدل کے امین تھے۔ لوگ ان کے پاس آتے تھے، اپنی ضرورتیں بیان کرتے تھے، اپنا دکھ درد سناتے تھے، اور بیان کے منظر و پس منظر میں دوسروں کے مظالم و عیوب کا بھی ذکر کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب سب کی باتیں پوری توجہ سے سنتے لیکن کبھی کسی سے اس کا ذکر نہ کرتے تھے۔ اس خاص کردار کی بنا پر، ہر شخص ڈاکٹر صاحب پر حد درجہ اعتماد کرتا تھا۔ ہر ملنے والا جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے یا مطلب برآری کے لئے جس طرح گریہ وزاری کی جا رہی ہے، ڈاکٹر صاحب کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کریں گے، میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں، ان میں چھوٹے بھی ہیں بڑے بھی، جنھوں نے ضرورتمند بن کر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی راہیں تلاش کیں، ان سے ملے ان سے فائدہ اٹھایا اور پھر ان کا ذکر اس خاص انداز سے کرنے لگے جیسے ڈاکٹر صاحب نے ان کے ساتھ کوئی احسان کیا ہی نہیں۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی نفسیات سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ ان پر جو احسان کیا گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے سینے کا ایسا راز ہے جو بھول کر بھی ان کی زبان پر نہ آئے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نیکی کر دریا میں ڈال کے قائل تھے۔ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ ہوتی تھی کہ انھوں نے کسی کے ساتھ کچھ کیا ہے اس لئے تذکرے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا اگر کبھی کوئی احسان شناس ان کا شکریہ ادا کرتا تو عجب طرح سے محجوب ہوتے اور فوراً بات کاٹ کر دوسری بات شروع کر دیتے، اس کے برعکس ہم آپ اگر کسی کے ساتھ کوئی بھلائی کرتے ہیں تو خود اس کا تذکرہ دس جگہ کرتے ہیں اس طرح بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں کہ احسان مند حیرت زدہ رہ جاتا ہے لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ احسان ناشناس کو چار ناچار احسان کا

اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے لیکن جو لوگ ڈاکٹر محمود حسین کی طرح، احسان کو احسان ہی نہ سمجھتے ہوں اور کسی کی مدد کو اپنا فریضہ جانتے ہوں، ساتھ ہی کسی کے ساتھ کچھ کرنے کا ذکر تک زبان پر نہ لاتے ہوں۔ ایسوں کے احسانات کو اگر لوگ بھول جائیں تو ہمیں چنداں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کسی قسم کی احساس کمتری یا برتری کا شکار نہ تھے۔ وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے دوست دشمن سب سے ملتے تھے اور ایک بڑے صوفی کی طرح اپنی انا کو ہر طرح مار کے اور اپنی ذات کی نفی کر کے ملتے تھے۔ مل کر خود بھی خوش ہوتے تھے دوسرے کا دل بھی خوش کرتے تھے اور خلوصِ نیت سے ہر قسم کی مدد کو تیار رہتے تھے۔ یہ خوئے دلنوازی انھیں اپنے خاندان سے ورثے میں بھی ملی تھی اور ڈاکٹر حسین نے بھی اس باب میں ان پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ سبب کچھ رہا ہو ان کی کرم فرمائیاں اور لطف ارزانیاں بہت بہت عام تھیں، لیکن امداد و سفارش کی یہ ساری ارزانی نجی کاموں کے لئے ہوتی تھی۔ قاعدے قانون اور اصولی معاملوں میں وہ بڑے سخت گیر تھے اور کسی کی نہ سنتے تھے جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اسی پر اڑے رہتے تھے۔ طبیعت میں ایسی لچک تھی کہ انھیں عام مسائل میں جمہور کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے میں دشواری نہ ہوتی تھی۔ لیکن جہاں کہیں وہ مطابقت پیدا نہ کر پاتے تو اختلاف کرنے سے گریز نہ کرتے، اپنی رائے کا اظہار برملا کرتے اور پورے طنطنے کے ساتھ کرتے۔ بڑے سے بڑے دوست اور بڑی سے بڑی قوت کی پروا کئے بغیر کرتے۔ بات یہ ہے کہ وہ اجتماعی مسائل کو ہمیشہ اصولوں کی روشنی میں، ہر قسم کی جانب داری سے بالاتر رہ کر دیکھتے تھے، دوستی، مروّت اور قرابت کو درمیان میں نہ آنے دیتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کے سیاسی مسلک سے اختلاف کر کے، قیام پاکستان کی تحریک میں شامل نہ ہوتے۔

سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو رائے قائم کرتے تھے وہ کسی کے دباؤ سے نہیں اپنے طور پر کرتے تھے اور جب یہ دیکھتے کہ اختلاف رائے کو اہمیت نہیں دی جا رہی اور اصولوں پر ضرب پڑ رہی ہے تو وہ احتجاجاً اس مسئلے سے خود کو الگ کر لیتے تھے۔ اس قسم کے احتجاجی فیصلوں

کی مثالیں ان کی زندگی میں ایک دو نہیں بہت سی ملتی ہیں۔ پچھلے پندرہ سولہ سال میں سبھی نے دیکھا ہے کئی ایسے واقعات گزرے ہیں ۱۹۵۷ء میں ڈین تھے۔ ایک مسئلے میں شرکائے مجلس کی رائے سے اتفاق نہ کر سکے اس لئے مستعفی ہو گئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دینے کا بھی یہی سبب تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب کے زمانے میں شعبۂ ریاضی کی استاد محترمہ شائستہ زیدی کو بعض وجوہ سے معطل کر دیا گیا۔ اس وقت کی اکیڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے بیشتر ارکان، ڈاکٹر قریشی صاحب کے ساتھ تھے، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر قریشی کے دیرینہ اور غیر معمولی روابط کا حال بھی سب کو معلوم ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم اس مسئلے میں ڈاکٹر قریشی سے اتفاق رائے نہ کر سکے۔ انھوں نے صاف لکھا کہ میرے نقطۂ نظر سے چونکہ یہ عمل یکسر غیر منصفانہ ہے اس لئے میرے لئے سنڈیکیٹ کا ممبر رہنا ممکن نہیں، ڈین کے عہدے سے میرا استعفیٰ منظور کیا جائے اور کسی وجہ سے میرا صدر شعبہ رہنا مناسب نہ ہو تو مجھے اس سے بھی سبکدوش کر دیا جائے۔ وفات سے چند مہینے پہلے کی بات ہے انھوں نے کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری صرف اصولوں کی خاطر استعفیٰ دیدیا تھا ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو کی معتمدی سے بھی اختلاف رائے کی بنا پر مستعفی ہوئے تھے اسی طرح اب سے چند سال پہلے جب جامعہ ملیر کے مختلف اداروں کے درمیان مستقل تنازع کی صورتیں پیدا ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا وہ اپنے بعض رفقاء کار کی رائے سے متفق نہ ہو سکیں گے تو انھوں نے مجلس جامعہ تعلیم ملی کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان کا کونسا استعفیٰ منظور ہوا اور کونسا نامنظور۔ میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ نجی معاملوں میں حد درجہ نرم ادا اور اصولی باتوں میں حد درجہ سخت تھے۔ کرسی چھوڑ سکتے تھے، کسی مصلحت کی بنا پر اصولوں کا سودا کرنے پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔ اب یہ اپنے اپنے ظرفِ طبع کی بات ہے کہ اسے ان کی خالص صحابیت سے تعبیر کیا جائے یا ضد سے اور یا اقبال کے لفظوں میں ایک مومن کا کردار سمجھا جائے۔

ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس طرح میں نے ڈاکٹر صاحب کو کسی کی غیبت اور برائی کرتے نہیں دیکھا اسی طرح ان کے کردار میں جذبۂ انتقام کی کوئی لہر بھی مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ ان کا سینہ، ہر قسم کی کدورت سے پاک آئینہ کی طرح شفاف تھا۔ جانتے تھے فلاں شخص میرا مخالف ہے، ہر جگہ میری برائی کرتا ہے، پھر بھی اگر وہ ان سے ملتا اور ان سے مدد چاہتا تو وہ اس کی پذیرائی اسی طرح کرتے جیسے خاص اپنوں کی۔ بعض باتوں میں وہ دوسروں سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اس اختلاف کو سینے میں سانپ بنا کر پالے رکھنے اور موقع پا کر دوسروں کو ڈسنے کی خوئے بد ان میں نہ تھی۔ غم و خوشی دونوں کا حساب وہ ہر شخص کے ساتھ روزگار وزبے باق رکھتے تھے۔ خفا ہوتے تھے، لیکن خفگی کو کینے کا وسیلہ نہ بننے دیتے تھے۔ ان کا غصہ شعلۂ مستعجل تھا۔ ذرا دیر کے لئے لپکتا پھر خنکی میں بدل جاتا۔ بقول شخصے ان کا غصہ کیا تھا، ایک طرح کا انجکشن تھا۔ ایک لمحہ کے لئے جھٹکا سا لگتا تھا اور ہلکی سی چبھن محسوس ہوتی تھی پھر افاقہ ہی افاقہ۔ یعنی دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر صاحب اپنی مسکراہٹوں سے مریض کے زخم پر مرہم رکھتے اور اس انداز سے جیسے وہ انجکشن دینے میں خود بھی چبھن محسوس کر رہے تھے۔ اگر کسی کی کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوتی تو بھی ایسی شانِ بے نیازی سے کام لیتے کہ ان کے نیاز مند ان کی فراخ دلی پر حیرت زدہ رہ جاتے۔ اس طرح کا ایک تجربہ مجھے ذاتی طور پر بھی ہوا۔ پروفیسر این۔ ڈی خاں جامعہ ملّیہ کالج میں استاد تھے۔ ایک مسئلے پر مجلس سے اختلاف ہوا اور انھیں برطرفی کا نوٹس دے دیا گیا۔ تحقیقی کمیشن اور مقدمہ بازی تک بات گئی۔ پروفیسر ان۔ ڈی خاں صاحب نے مختلف اخبار و رسائل کو اپنی صفائی میں ایک طویل مراسلہ بھیجا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ یہ مراسلہ مجھے بھی بھیجا گیا اور میں نے اکتوبر ۱۹۶۹ء کے نگار میں اسے مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا:

"آپ کا مراسلہ مفصل تبصرہ چاہتا ہے اور میں نے اسی خیال سے حالات و واقعات کا جائزہ بھی لیا تھا لیکن جب معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں ہائی کورٹ کے ایک چیف جسٹس کی سربراہی میں تحقیقی کمیشن مقرر کر دیا گیا ہے تو میں نے اپنے جائزے کو شاملِ اشاعت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جہاں تک آپ کے عقائد کا تعلق ہے اس

سلسلے میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔ خود آپ کا مراسلہ واضح شہادت ہے کہ آپ بحمداللہ راہ مستقیم پر ہیں ۔ اس وضاحت کے بعد کسی کا یہ اصرار کہ آپ مسلمان نہیں ہیں یا اللہ و رسول پر ایمان نہیں رکھتے ۔ ایسی مذہبی اجارہ داری کے مترادف ہے جسے کوئی اسلامی معاشرہ یا مسلمان کبھی استحسان کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا ۔ رہا کسی کے غیر ارادی فعل یا سہو و خطا کا سوال ، سو اس کا امکان بہر حال مجھ سے بھی اور آپ سے بھی رہتا ہے اللہ تعالےٰ ہی اس کا بصیر و محاسب ہے ۔ بندوں کو خدا بننے کا حق نہیں پہنچتا ۔"

جامعہ ملیہ کے بعض احباب نے میرے اس نوٹ کو پسند نہ کیا ۔ ڈاکٹر صاحب کی توجہ بھی لوگوں نے اس طرف بطور خاص مبذول کرائی ۔ ضمناً یہ بھی ظاہر کیا کہ ڈاکٹر نے اسے پسند نہیں کیا لیکن یہ محض قیاس تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ کبھی اس کا مجھ سے ذکر کیا ——————— اور نہ میرے حال پر اُن کی لطف ارزانی میں کوئی کمی آئی ۔ وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو کسی معاملے میں کسی اختلاف رائے کو بہانا بنا کر دل میں گرہ ڈال لیتے ہیں اور اصولی مسئلوں کو ذاتی مسئلہ بنا لیتے ہیں ۔ اظہار رائے کے سلسلے میں وہ خود بھی آزاد و بے باک تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حق دیتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی طرح ان کا علمی و ادبی ذوق بھی ہمہ گیر تھا ۔ اپنے مخصوص مضامین یعنی تعلیم ، تاریخ اور سیاست کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب پر بھی وہ اچھی نظر رکھتے تھے ۔ فارسی اور اس کی شعری و ادبی روایات سے آگاہی کے سبب اردو شاعری کے رموز و نکات کو خوب سمجھتے تھے اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ان سے لطف اندوز ہوتے تھے ادبی اجتماعات میں ان کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی تھی ۔ جس موضوع پر بولتے تھے ۔ بعض بہت خوبصورت اور انفرادی نکتے پیدا کر لیتے تھے ۔ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتے اور بولتے تھے ۔ اور اس انداز خاص سے کہ دونوں میں لطف زبان برقرار رہتا تھا ، یہی سبب تھا کہ علم و فن کی بیشتر شاخوں کے اجتماعات میں انھیں بلایا جاتا تھا اور ان کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی ۔ چنانچہ ان کے قلمی مسودات میں تعلیم ، تاریخ اور مختلف ثقافتی موضوعات

کے علاوہ اردو زبان اور شعر و ادب کے مسائل پر بھی کئی مقالے نظر آتے ہیں۔ یہ مقالے فکر و نظر اور زبان و بیان ہر لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں اور بعض بالکل نئے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ درس و تدریس اور انتظامی امور کی بے پناہ مصروفیت کے سبب وہ تصنیف و تالیف کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ پھر بھی سات آٹھ کتابیں مطبوعہ شکل میں دے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ سماجی مشاغل میں صد درجہ مصروف رہنے کے باوصف تحقیقی و تنقیدی کام کی طرف سے غافل نہ تھے۔ لکھنے پڑھنے کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ ان کے درجنوں خطبے اور مقالے غیر مطبوعہ صورت میں پڑے ہیں اور متعلقہ موضوعات کے بعض بالکل نئے پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات و صفات کی طرف سے ایسی بے نیازانہ زندگی بسر کر گئے کہ ان کے یہ مقالات۔ کتابی صورت میں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکے ورنہ اگر وہ چاہتے تو آج بہت آسانی سے ان کی کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں موجود ہوتیں۔ معاہدہ عمرانی کا دیباچہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس وقت کلکتہ ریویو اور ماڈرن ٹائمز میں ان کے جو مضامین انگریزی میں چھپے تھے وہ علمی حلقوں میں خاصے پسند کئے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۳ء سے لیکر تادمِ مرگ تقریباً چالیس سال تک دوسری مصروفیتوں کے باوجود وہ برابر لکھتے رہے اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں شکلوں میں تصنیف و تالیف کا ایک ایسا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے جو ان کے قبیل کے لوگوں کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دلجوئی و دلنوازی کا تجربہ سبھی کو ہے۔ اس دلجوئی و دلنوازی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے مخاطب یا میزبان کو خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجے کا کیوں نہ ہو احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دیتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں اپنے اخلاقی رویّوں سے وہ اسے اتنا بلند کر دیتے تھے کہ وہ خود بھی اپنے کو تھوڑی دیر کے لئے بڑا محسوس کرنے لگتا تھا۔ ان کا یہ عمل کسی تصنع یا بناوٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی سیرت کا جزوِ اعظم تھا۔ اپنے چپراسیوں اور دھوبیوں کی دعوت پر بھی وہ ان کے گھر جاتے اور نہایت خوش دلی سے اُن کی

تقریبات میں ایک عام آدمی کی طرح شریک ہوتے ۔ ٹوٹی ہوئی پلنگ اور معمولی فرش پر
جھٹ سے بیٹھ جاتے اور میزبان کی خوشیوں کو دوبالا کردیتے ۔ ذیابیطس اور دل کے مریض
تھے ۔ کئی چیزوں سے پرہیز کرتے تھے لیکن میزبان کی خاطر ہر چیز کھالیتے ۔ بعض لوگ ازراہ
ہمدردی ڈاکٹر صاحب کو روکنا چاہتے ۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ، بھائی اب یہ کہہ رہے ہیں تو تھوڑا
سا لئے لیتا ہوں "کھانا کیسا ہی ہو تعریف کرتے اور خنداں پیشانی سے مزے لے کر کھاتے
دسترخوان پر جتنی چیزیں ہوتیں ، میزبان کے اصرار پہ ہر چیز چکھتے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے
کہ اگر کسی کھانے میں اتفاق سے کوئی کمی رہ گئی یعنی سالن میں مرچ یا نمک زیادہ ہو گیا یا فیرنی
میں شکر کم ہو گئی تو لوگ اس کا اظہار اس طرح کرنے لگتے ہیں کہ میزبان کو بڑی خفت ہوتی ہے
ڈاکٹر صاحب دوسروں کے برعکس اس قسم کی چیزوں کو زیادہ کھاتے ۔ بار بار لیتے اور
بڑی تعریف کرتے ، مقصود صرف یہ ہوتا کہ میزبان کو خفت کے احساس سے بچایا جائے
کھانے کے معاملے میں گھر اور گھر کے باہر دونوں جگہ ان کا عمل یہی تھا ۔ جو کچھ سامنے آگیا
صبر وشکر کے ساتھ کھا لیا اور پکانے والے کی معمولی کمزوری کی آڑ لے کر رزق کو تنقید سے
دیکھنا یا میزبان کو خفیف کرنا کبھی پسند نہیں کیا ۔

معمولی جلسوں سے لے کر شادی بیاہ تک ، چھوٹا بڑا ہر آدمی ڈاکٹر صاحب کو
بلانا چاہتا ۔ ایک دن میں درجنوں جگہ انھیں جانا پڑتا تھک کر چور ہو جاتے بیگم ، بچے اور
بعض احباب روکنا چاہتے ، لیکن ڈاکٹر صاحب کہتے یہ بھائی اتنے خلوص سے بلا رہے
ہیں کیسے انکار کروں ، ذرا دیر کے لئے چلا جاؤں گا ۔" اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو بلا امتیاز
ہر شخص سے وعدہ کرلیتے اور ایفائے وعدہ کو اپنا فرض سمجھتے ۔ بیمار ہوں ، موسم خراب ہو ،
کوئی اور جائے یا نہ جائے ڈاکٹر صاحب جائیں گے ، وعدہ جو کر لیا ہے ۔ ایسے ایک دو نہیں
کئی منظر میری نظر سے گذرے ہیں ۔ ایک صاحب کے یہاں رات کا کھانا تھا ، بہت سے لوگ
مدعو تھے لیکن شام کے چھ بجے برق و باد کا طوفان شروع ہوا ۔ بارش کا تار نہ ٹوٹا ۔
راستے مخدوش ، کراچی جل تھل ہو گیا ۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ میں بیٹھے مضطرب ہو رہے تھے
کہ فلاں صاحب انتظار کر رہے ہوں گے کتنے پریشان ہوں گے ، سارا کھانا خراب ہو گا ۔

چلنا چاہئے۔ ڈرائیور کو بلایا اور کہا دیر تو ہوگئی لیکن کسی طرح چلو۔ دوسرے لوگ بھی تیار ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب بارہ میل کا سفر کرکے لت پٹ کپڑوں میں پہنچ گئے۔ اس خلافِ توقع آمد پر میزبان کی باچھیں کھل گئیں، دوسرے نہ پہنچ سکے لیکن ڈاکٹر صاحب کی موجودگی نے اس کا سارا غم دور کردیا۔

یہ باتیں بہت معمولی اور چھوٹی ہیں لیکن بقول کشفی صاحب یہی تو بڑوں کی نشانیاں ہیں۔ انھیں سے تو کسی کی عظمتِ کردار کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے یہاں آج کل عظیم و عظمت کے الفاظ اتنے عام ہوگئے ہیں کہ ان کی معنویت اور اہمیت کچھ یوں ہی سی رہ گئی ہے، لوگ جہاں اور جس کے نام کے ساتھ چاہتے ہیں ان الفاظ کو بے تکلف استعمال کردیتے ہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میری نگاہ میں عظمت کا معیار ہمیشہ شخصیت و کردار کے حوالے سے ابھرتا ہے۔ ایک آدمی اپنی غیر معمولی ذہانت، محنت اور مطالعہ کی بنا پر، عظیم منتظم، عظیم مورّخ، عظیم مصور، عظیم سائنس داں، عظیم محقق عظیم مفکر اور عظیم سیاست داں تو ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک عظیم شخصیت و کردار کا مالک بھی ہو۔ ڈاکٹر محمود حسین میں دوسری خوبیاں بھی تھیں لیکن یہ ان کا وصفِ خاص تھا اور اسی کے سبب وہ اپنے ہم رتبہ ہمعصروں میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے۔

ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں مغرب کی چکا چوند سے خیرہ ہوگئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے کیسے کیسے نادر ذخیرہ ورثے میں چھوڑے ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ اسلام دنیا میں لبنا اور اس سے متمتع ہونا سکھاتا ہے۔ وہ سنیاسی و راہب بن کر دنیا کو تیاگنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام جہد و عمل کا مذہب ہے۔ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں سے جائز تمتع اسلام کا مسلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ و بو کی اس حسین دنیا کو مسلمانوں نے نہ صرف حسین تر بنایا بلکہ اس کو دنیاوی جنت میں تبدیل کردیا مسلمانوں کی کشادہ دلی، رواداری، حسن مذاق۔ اعلیٰ ثقافت ان کے فنونِ لطیفہ میں بھی موجود ہے اور اس کو دوسروں سے ممیز و ممتاز بناتی ہے۔

محمود حسین

نصر اللہ خاں

ایک روایت ایک عہد

اگر ہم ڈاکٹر محمود حسین خان کو شہید تعلیم کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ جامعہ کراچی کے انتشار اور بگڑے ہوئے حالات کے سنوارنے میں اپنی جان سے گذر گئے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ ہم ڈاکٹر محمود حسین خان سے وہ کام نہ لے سکے جس کام کیلئے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور ہمیں انکی شخصیت سے نوازا تھا۔

میں نہیں چاہتا کہ یہاں یہ بتاؤں کہ ڈاکٹر محمود حسین خان کو کونسا دکھ کھا گیا کس کے لئے اور کس طرح وہ اپنی جان پر کھیل گئے۔

اپنے برادر گرامی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی جدائی کی خبر سن کر ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ بھی اسی جان لیوا مرض میں گرفتار ہو گئے۔ موت کی گھنٹی بج چکی تھی۔ ان کے دوستوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ وائس چانسلری کا عہدہ چھوڑ دیں۔ اس عہدے سے انکی عزت نہیں تھی البتہ اس عہدے کی آبرو میں ان کی شخصیت کی وجہ سے اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر محمود حسین خان کی جدائی کے غم میں آج سارے ملک کے علمی و ادبی حلقے سوگوار ہیں جامعہ کراچی کا سہاگ لٹ گیا۔

جب ڈاکٹر صاحب رو بصحت ہو کر علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگے تو شام ہمدرد کی ایک محفل میں میں نے ان سے کہا کہ انہیں ریٹائر ہو جانا چاہیئے انکی تمام زندگی ایک مرد کی طرح قوم کی علمی خدمت کرتے ہوئے گذر گئی تھی۔ قوم نے ان کی قدر نہیں کی۔ تاریخ کے شعبہ میں انہیں بھی بہت کچھ کرنا ہے کئی تحقیقی کام جو انہوں نے شروع کئے تھے نامکمل پڑے ہیں پھر ہماری جامعات کو جو سیاست گری کا اڈہ بن چکی ہیں۔ جہاں طلبا سطحی سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں جہاں پارٹیوں اور نعروں کی سیاست چلتی ہے وہاں کسی عالم کا کیا کام، اپنی آبرو کھوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اتفاق کیا۔ وہ مسکرائے اور انہوں نے کہا یہ درست ہے لیکن میں مجبور ہوں، مروت اور وضعداری سے ـــــ یونیورسٹی میں پُر امن ماحول اور خالص علمی ماحول قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس کا میری زندگی میں آغاز ہو گیا۔ تو یہ بڑا کام ہو گا اور پھر اپنی عادت کے مطابق سر کو جھٹکا دے کر فرمایا۔ آخر کسی کو تو یہ کام کرنا ہے بُرے حالات ہی کو سنوارنا تو بڑا کام ہوتا ہے اور پھر ایک مرتبہ یہ سنا کہ جامعہ میں کچھ ہنگامہ مچانے والے طالب علموں نے اور کچھ نعرہ بازوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حد تک پریشان کیا کہ وہ مستعفی ہو گئے، لیکن بہت سے لوگوں نے درخواست کی کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں اور ڈاکٹر صاحب جن کی سب سے بڑی کمزوری انکی وضعداری اور مروت تھی مجبور ہو گئے جو لوگ جامعہ کو سیاسی اکھاڑہ اور اسے آلہ کار بنانا چاہتے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حد تک پریشان کیا کہ اس مرتبہ ان کے دل نے انکی مروت اور وضعداری کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے دماغ نے ان کے دل کا ساتھ چھوڑ دیا اور انکے تمام اعضائے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ اس دنیا سے اس ملک سے، اس قوم سے، اس قوم کے علمی طبقوں سے، جامعہ کراچی سے، جامعہ کراچی کے طلباء سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اب ملک کے بڑے سے بڑے سیاستدان، جامعہ کراچی کے تمام طلباء و طالبات ڈاکٹر محمود حسین خاں کو واپس نہ لا سکیں گے۔

وائس چانسلر بہت سے آئیں گے اور بہت سے جائیں گے لیکن ڈاکٹر محمود حسین خان نے جو جگہ خالی کی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو گی۔

ڈاکٹر محمود حسین خان بڑی من موہنی شخصیت کے مالک تھے، علم کے جس شعبے سے ان کا تعلق تھا اس میں انہوں نے بڑا کام کیا۔ تعلیمی شعبے میں ان کے تعلیمی تجربے اور انکی خدمات کی کم از کم اس ملک میں کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ وہ قومی کاموں میں دن رات مصروف رہتے اور ان کاموں کو اپنا کام سمجھتے وہ جاہ طلب نہ تھے وہ گھڑی کی چوتھائی میں دولت کے انبار نہیں کمانا چاہتے تھے ان کی دولت ان کا علم تھا اور وہ علم پھیلانے کے کاموں میں مرتے دم تک مصروف رہے۔

ان کی تقریر و تحریر میں جہاں انکی من موہنی شخصیت کی جھلکیاں ان کے خاندان کے علمی پس منظر کی پرچھائیاں تھیں۔ وہاں ان تقریروں اور تحریروں میں خطابت کے علاوہ مغز بھی ہوتا۔

اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ اچھے معنوں میں ہمہ خاندان آفتاب است کسے کہتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر محمود حسین کے خاندان کو، ڈاکٹر محمود حسین خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خان برصغیر کے نامی گرامی ماہر تعلیم تھے وارڈھا اسکیم کے بانی تھے انہوں نے لارڈ میکالے کی اس بنیاد کو گرادیا جو اس نے برصغیر کے باشندوں کو ذہنی طور پر تاج برطانیہ کے محکوم بنانے کے لیے برصغیر کی سرزمین میں اٹھائی تھی۔ اس منصوبے کا جواب ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے مسلمانوں کے لیے جامعہ ملیہ قائم کرکے دیا جو مسلمانوں کی پہلی عظیم علمی تحریک تھی اور جس کے موسس و بانی مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان جس کے روح رواں تھے جب ملک تقسیم ہوا تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی منصوبے بھارت میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کا مسلک بھی مختلف تھا اس لیے وہ پاکستان نہیں آئے البتہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو اپنے محترم بھائی کے سیاسی مسلک سے ہمیشہ اختلاف رہا وہ تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے شدت سے حامی تھے اور ان کا نام بزرگوں کی فہرست میں شامل ہے جو حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی صفِ اول میں شریک تھے چنانچہ جب پاکستان بنا تو ڈاکٹر محمود حسین خان پاکستان چلے آئے ڈاکٹر محمود حسین خان یوں تو مسلم لیگ میں شریک تھے لیکن ان کے پیشِ نظر مسلم لیگ سے زیادہ پاکستان کے تعمیری کام رہے ڈاکٹر صاحب نے کسی سازش یا جوڑ توڑ میں حصہ نہیں لیا۔ وہ متنازعہ شخصیت نہیں تھے ان کا دامن بڑی بڑی کشمکش میں بھی بے داغ رہا۔

میں نے مرکزی اسمبلی میں ڈاکٹر صاحب کی تقریریں سنیں حزبِ اختلاف سردار شوکت حیات اور میاں افتخار الدین مرحوم تھے جب کسی مسئلہ پر حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف میں چوٹیں ہوتیں تو ڈاکٹر محمود حسین خاں بڑے مزے مزے کی چوٹیں کرتے لیکن اپنے حریف پر ذاتی حملہ نہ کرتے۔ یوں لگتا کہ جیسے وہ پارلیمانی آداب سے خوب واقف ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم ایک عرصہ تک مرکزی وزیر تعلیم رہے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس

چانسلر بھی رہے اور وہاں تقسیم کے بعد جو انتشار پیدا ہوا تھا اسے دور کرنے میں کامیاب ہوئے انہوں نے اس تعلیمی ادارے کے تقدس کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا۔

ڈاکٹر محمود حسین خان نے کراچی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی انکی یہ خواہش تھی کہ یہ تعلیمی ادارہ پاکستان میں ایک مثالی ادارہ بنے اسے زندگی کا سرچشمہ بنایا جائے جس کی بنیاد عمل کے اصول پر رکھی جائے اس ادارے سے مستعدی سے چل کر کام کرنے والے شریف اور محب وطن اور اپنے کاموں میں اپنی ذات کو فنا کرنے والے افراد پیدا کئے جائیں۔ یہ ادارہ بتدریج ترقی کرتا رہا اس کا مستقبل شروع شروع میں کافی امید افزا تھا ڈاکٹر صاحب نے فیس بہت معمولی رکھی تھی ذریعہ تعلیم قومی زبان مقرر کی ایسی صورت میں بغیر مالی امداد کے اس ادارے کا چلنا مشکل تھا پاکستان پر ان لوگوں کا غلبہ تھا جو فرنگی ذہن رکھتے تھے فرنگی کی زبان اور فرنگی معاشرے پر مٹے ہوئے تھے، لہٰذا ایسی صورت میں دولتمند افراد اور حکومت کی مالی امداد کے بغیر ڈاکٹر محمود حسین خان کا یہ تجربہ کیونکر کامیاب ہوتا پہلی حکومتوں کو ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں کا احساس تھا جب تک وہ حکومتیں رہیں اس ادارے کو مالی امداد اس کی ضرورت کے مطابق ملتی رہی اور یہ ادارہ ملک کے دولتمندوں کے تعاون کے بغیر بھی ترقی کرتا رہا۔ اور جب خالص سیاستدانوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو مالی امداد بند ہو گئی اور ڈاکٹر محمود حسین خان کی یہ کھیتی سوکھ گئی اور پھر نئی حکومت نے اس ادارے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ویسے بھی اس ملک میں تعلیمی تجربہ کرنے کے امکانات نہیں ہیں کیونکہ اس ملک میں ماہرین تعلیم سیاستدان یا تو ہوتے ہیں اور یا سرکاری افسر۔ اگر ملک میں دو چار ڈاکٹر محمود حسین خان قسم کے دیوانے موجود رہتے ہیں تو انہیں ملازمتیں دے دی جاتی ہیں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے۔

مجھے یہاں ایک بات یاد آئی۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کراچی تشریف لائے تھے (جب وہ ہندوستان کے صدر نہیں تھے) جامعہ میں ایک جلسہ تھا جلسے کے بعد عصر کی نماز کے وقت ان کے قریبی دوست احباب ان سے ملاقات کر رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کراچی کے سلسلے میں وہ ایک دوست سے کہہ رہے تھے آغاز تو بہت اچھا ہے لیکن اچھے انجام کے لئے دعا کیجئے ایک تجربہ ہے اور تجربے کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ یا تو حکومت اس ادارے کی سرپرستی کرے یا عوام

اس سے تعاون کریں۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ محمود حسین خان کا مسلک وہ نہیں تھا جو ذاکر حسین خان کا تھا۔ پھر ان میں وہ شدت بھی نہیں تھی صلح کن آدمی تھے یہ ادارہ کسی نئے انقلاب کا علمبردار بھی نہیں تھا اور پھر عوام بھی انقلاب کے نام سے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے وہ حصولِ پاکستان کو اپنی منزل سمجھ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اکیلے ڈاکٹر محمود حسین کیا کر لیتے چنانچہ یہ ادارہ بھی ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں گھل مل گیا۔ اور اس کی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی۔

ڈاکٹر محمود حسین خان کا مطالعہ بہت وسیع تھا انہوں نے تاریخ پر بہت کام کیا ہے جس کا دوسرے ملکوں میں اعتراف ہوا۔ کتب خانوں کی تحریک میں ڈاکٹر صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انکی خواہش تھی کہ ملک کے کونے کونے میں کتب خانے کھولے جائیں اور لوگوں میں مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے؛ یہ تحریک چل چکی ہے اللہ تعالیٰ اسے کامیاب کرے۔

ڈاکٹر صاحب نے اساتذہ کی تربیت کے لئے ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی ہمارے ملک میں اساتذہ کے تربیتی ادارے در اصل درسی ادارے ہیں جہاں اساتذہ کو بے جان کتابیں رٹائی جاتی ہیں ڈاکٹر صاحب یہ چاہتے تھے کہ اساتذہ کے دلوں میں وسعت پیدا کی جائے اور انہیں خود غرضی کے چکر سے نکال کر مخلصانہ خدمت کی راہ دکھائی جائے۔

ڈاکٹر محمود حسین خان بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے وہ مرکزی وزیر تعلیم بھی رہے قومی اسمبلی کے رکن بھی ڈھاکہ اور کراچی کی جامعات کے وائس چانسلر بھی، لیکن یہ عہدے انکی شخصیت پر غالب نہ آسکے، وہ ہر جگہ ڈاکٹر محمود حسین خان ہی رہے، کوئی عہدہ چھوڑتے سے انکی شخصیت میں کمی نہیں آئی بلکہ اور اضافہ ہوا۔ انہیں دیکھ کر نظروں میں تراوٹ آتی انکی باتیں سن کر دل کا کنول کھل جاتا۔ خوش لباس، خوش مذاق، خوش گو، خوش صفات ایک مثالی استاد، روحِ انسانی کا صنعت گر۔ ایک خاموش پر خلوص قومی کارکن ڈاکٹر محمود حسین خان کے ساتھ ایک روایت نے دم توڑ دیا اور ایک پورا عہد قبر میں اتر گیا۔

ڈاکٹر انیس خورشید

حیات لیکے چلو، کائنات لیکے چلو

مخدوم محی الدین کا ایک مشہور شعر ہے۔ ؎

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

ڈاکٹر صاحب کی زندگی بھی اس شعر کے عین مطابق تھی۔ ماضی کے مختلف ادوار پر نظر کیجیے تو ایسی جانی پہچانی شخصیتیں نظر آتی ہیں، جو زندہ رہیں تو حیات، کائنات اور سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلتی رہیں اور جب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں تو ایسے چراغ روشن چھوڑ گئیں جن کی روشنی آج بھی ان راہوں کی نشاندہی کرتی ہے، جن پر چل کر ان کی ہم کابی میں علم و دانش نے فروغ حاصل کیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب ایسی ہی ایک شخصیت، ولیم ایورٹ، کے روپ میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں داخل ہوئی تو ۱۸۵۰ء کا عوامی کتب خانوں کا قانون پاس ہوا، چند سال پہلے جب امریکہ میں اسی طرح کے ایک شخص، جارج ٹکنر، نے ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تو اسے جامعہ گاٹنجن کے کتب خانے میں دیکھے ہوئے اپنے خوابوں کی تعبیر وہاں کے عوامی کتب خانوں کی تحریک میں جھلکتی نظر آئی، اسی لیے اس نے اس کے فروغ میں والہانہ ذوق و شوق سے حصہ لیا، اور شہرۂ آفاق مساچوسیٹ قانون کتب خانہ پر عمل درآمد کا بھی باعث بنا۔ یہ وہی قانون تھا جس کے خدوخال آج ہمارے جدید عوامی کتب خانوں کی انداز فکر کا اساس بن چکے ہیں، دور کیوں جائیے، جب ہم اپنے ہی ملک میں ۱۹۱۵ء کے فوراً بعد اس وقت کے تعلیمی پس منظر پر نظر کرتے ہیں تو یہاں بھی ایک انگریز مستشرق پروفیسر اے۔ سی۔ اولنر، اس وقت کے قلمروئے تاج برطانیہ میں قائم کئے ہوئے واحد جامعیاتی لائبریری کورس کو نہ صرف علمی و ادبی سطح پر لانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ مخطوطات کو یکجا اور محفوظ کرنے کی کوششوں میں اس وقت تیزی بھی ان ہی کے مساعی جمیلہ کا نتیجہ نظر آتی ہے، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۸ء کے دہلی میں خود سر مارس گائیر کی شخصیت میں سر

جان سرجنٹ کی تجویز پر تیار کئے ہوئے ایس۔ آر۔ رنگا ناتھن کے منصوبہ کتب خانہ جات کو سہارا بھی حاصل ہوا، اور انہی کی سرپرستی میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے، جو اس وقت دہلوی یونیورسٹی کے ڈین تھے، ایشیا کے اولین لائبریری سائنس کے ایم۔ اے کورس کی بنیاد بھی رکھی۔

ڈاکٹر محمود حسین کی شخصیت پاکستان میں جب اُبھرتی ہے تو ان کی پارلیمنٹ کی رُکنیت اور قلمدان وزارت کے دور میں اس وقت کی لیاقت میموریل لائبریری کی نہ صرف بنیاد انہی کی کوششوں سے پڑتی ہے بلکہ اس وقت کے تنہا بیرونی تعلیم یافتہ لائبریرین کا جو تلاش معاش میں کتب خانوں کو بند پاکر معاشیات اور فرانسیسی پڑھانے پر مجبور ہو چکے تھے، اس لائبریری کے لائبریرین کے عہدے پر تقرر بھی آپ ہی کا رہینِ منت تھا۔ یوں آپ ہی کی کوشش سے ایک تعلیم یافتہ لائبریرین کو پاکستان میں لائبریری کے پیشے کے نوک پلک دُرست کرنے کا موقع ملا، ورنہ کیا عجب تھا کہ خلیفہ خان بہادر اسد اللہ خاں مرحوم جیسے مشہور لائبریرین کی طرح ان پر بھی اپنے ہی پیدائشی شہر لاہور میں ہندوستان سے گھر واپسی کے بعد اس وقت کی حکومت کی عدم توجہی کی وجہ سے پیدا شدہ پُرآشوب حالات میں کتب خانوں کو سسکیاں لیتے ہوئے دیکھ کر، یہ عقدہ پاکستان ہی میں کھلتا کہ کتب خانوں کا یہ پیشہ ان کے لئے نہیں ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کراچی یونیورسٹی میں کلیہ فنون کے سربراہ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تو آپ پاکستان میں کتابوں کی سرگرمیوں اور اس رشتے سے کتب خانوں سے اور زیادہ قریب ہو گئے، تبھی آپ علم و دانش کو پاکستان میں رینگتے ہوئے دیکھ کر تڑپ اُٹھے تھے، لیکن ان کے اس درد و کرب میں نوحہ خوانی کا عنصر غالب نہیں تھا، بلکہ آپ ان عوامل کی نشاندہی میں سرگرداں رہے جن سے پاکستان میں اُبھرتے ہوئے ذہنی رجحانات کو خطرہ لاحق تھا۔ لہٰذا ۱۹۷۵ء میں آپ نے اپنے ایک مضمون میں ان خطرات کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان سے نبٹنے کے لئے ایک منصوبہ بھی پیش کیا۔ آپ نے اسی مضمون میں برمحل اقبال کے یہ اشعار بھی قلم بند کئے تھے،

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی   ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی — نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

(خطاب بہ نوجوان اسلام)

یہ مضمون خاصا پُراثر تھا اس لئے خصوصی توجہ کا باعث بنا، انگریزی ڈان، میں چھپنے کے بعد اردو رسالوں نے بھی اسے شائع کیا، شریف المجاہد کا چونکا دینے والا مضمون —— بزبان شکوہ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں اس درد و کرب کو شکایت کے رنگ میں بدلنے نہیں دیا تھا، انہوں نے تو صرف 'دل کے سیپارا' ہونے کی بات کر کے اپنی شکایت کا رُخ ان ناہمواریوں کی طرف موڑ دیا تھا جن کے پاکستان میں دور ہو جانے ہی میں، ان کی نظر میں، علم و دانش کی بقا تھی، جب ہمارے دانشور کتاب خانوں کی بے سروسامانی سے اتنے دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ کتب خانے ان کی نظر میں کتابوں کے قبرستان بن چکے تھے' اور قبرستان میں یوں بھی لوگ عام طور پر جانا پسند نہیں کرتے،

ایک سال پہلے ۱۹۵۶ء میں آپ کی سرگرمی میں اس ملک کے پہلے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس کا آغاز کراچی یونیورسٹی میں ہوا تھا، اور جب آپ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اس وقت کے لائبریرین کی تجویز پر بیچلر آف لائبریری سائنس کے کورس کے افتتاح کی منظوری بھی سنڈیکیٹ سے آپ ہی نے دلوائی تھی، یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے جب کراچی یونیورسٹی میں اسی طرح کے یک سالہ کورس کو ایم۔اے کے درجہ پر شروع کرنے کی کوشش جاری تھی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی خصوصی توجہ کا باعث بنی ہوئی تھی، اگر ڈھاکہ میں بیچلر کی ڈگری کی تعلیم شروع ہو جاتی تو لائبریری سائنس میں ایم۔اے کی ڈگری کے حصول کے لئے ———— بی۔اے کے بعد تین سال درکار ہوتے۔ جب آپ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لئے لاہور تشریف لائے تو کانفرنس میں اس مسئلہ کو بھی پیش کیا گیا پہلے تو آپ یہی کہتے رہے کہ ڈھاکہ میں خود ایسی کوئی تجویز نہیں اور سنڈیکیٹ کی منظوری کے بعد اب تو منظور شدہ نصاب میں ترمیم بھی مشکل ہو جائے گی لیکن جب مسئلہ کی نوعیت کا اندازہ پوری طرح سے

آپ کو ہو گیا تو آپ نے خود ہی سنڈیکیٹ میں ترمیم بھی تجویز کی اور مدلل دلائل اپنی ہی طرف سے پیش کر کے بالآخر اسے منظور بھی کروا لیا۔

عوامی کتب خانوں کی بات جب چلی تو ڈاکٹر صاحب ہی تھے جنہوں نے اس طرح کے کتب خانوں کے قیام کی تحریک کی بھی بڑی گرمجوشی سے رہنمائی کی اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج کراچی میں تین عوامی کتب خانے ایسے بھی مل جاتے ہیں جہاں کتابیں بلا کسی معاوضہ یا فیس کے مستعار دی جاتی ہیں۔

یہ المیہ زیادہ کتاب ہی کا ہے جس کے فروغ کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف زندگی بھر کوشاں رہے، ڈاکٹر صاحب نے کتابوں اور کتب خانوں کی بات آگے بھی بڑھائی تھی تو کراچی جیسے عروس البلاد میں، جو اپنا سہاگ کھو جانے کے بعد اب بھی ایک شہر آ بجوبہ و بے نظیر ہے یہاں اب تک قہوہ خانوں میں قیامتیں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اس شہر کی شام طرب اب بھی نت نئی سحر جگاتی ہے۔ گلشن کا کاروبار بھی یہاں چل نکلا ہے، یہیں فلک شگاف عمارتیں بھی ایشیا کا فسوں توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور اسی شہر کی راہوں پر دنیا کی سب سے زیادہ گندگی بھی نظر آتی ہے۔ غرض یہاں کیا کچھ نہیں ہے، بس ایک کتاب ہی ایسی شے ہے، جو اول تو ناپید ہے اور بقول ڈاکٹر صاحب مرحوم اس تک رسائی بھی خاصی دشوار طلب ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبات میں اکثر اس نارسائی کا رونا رویا تھا اور بار بار توجہ دلانے کی کوشش کی تھی کہ کتاب کا صرف موجود ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کے بہتر استعمال اور حصول مقصد کے لئے ایک کتب خانہ، کشادہ اور دلکش، کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی کارکردگی ایسے عملے کے سپرد ہو جو استاد کی طرح تعلیم یافتہ، زیرک اور ہم رتبہ ہو۔

کراچی کی محدود ثقافتی سرگرمیوں میں بھی اب ذکر کتاب چل نکلا ہے۔ اور اس انداز سے کہ بات کتب خانوں سے بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ ان دونوں مسائل پر مشکل ہی سے اہل علم اور دانشوروں کی رائیوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن کتب خانے کے لئے جس اٹوٹ تثلیث کا ڈاکٹر صاحب نے اکثر ذکر کیا ہے ان کے بیان ہی سے مرزا ظفر الحسن کی شگفتہ مزاجی بھی پہلو بدلتی نظر آتی ہے اور تو اور انشاجی بھی زیر لب کہہ اٹھتے ہیں ؎

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

بھلا نصراللہ خاں کیوں چوکتے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی ایسی باتوں کو ان کے کتاب پینے سے تعبیر کیا تھا، لیکن ان کی پرکشش شخصیت کا عرق کتب خانوں کے رشتہ سے کشید کرتے کہتے خود نصراللہ خاں یوں رقمطراز ہوئے "اب کہاں ہیں ایسے لوگ، انھیں بھی اب ہماری قوم ہو کلاسیکس میں داخل کر چکی ہے" ایسا تو نہیں کہ ان کی نظر ڈاکٹر صاحب کو لگ گئی ہو کیونکہ انھوں نے ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انشا کا یہ شعر بھی دہرایا تھا سہ

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اب تو وہ غنیمت صورت بھی خاک میں پنہاں ہوگئی، اب کتاب کا کیا بنے گا؟ اسے شاید کیڑے ہی ہی چاٹ چاٹ کر دانشور بن جائیں۔ یہی تو مختار زمن نے کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد غالب کا یہ شعر بار بار زباں پر آتا ہے، جیسے مرحوم کی روح خود سوال پوچھ رہی ہو، سہ

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

کتاب کا یہ المیہ کتب خانوں تک پہنچے پہنچے اور بھی تکلیف دہ بن جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے کتب خانوں کی تحریک کی اس وقت قیادت کی تھی جب لوگ اُجڑے اور شکستہ حال کتب خانوں کے قریب سے گزرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے کتب خانوں سے والہانہ تعلق خاطر پر کچھ لوگ اپنی عقیدتمندی میں پریشان بھی نظر آئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۳ء تک (بہ استثناء ان چند سالوں کے جب وہ ملک سے باہر رہے) پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی پورے جوش و خروش سے قیادت فرماتے رہے اور تادم حیات کبھی بھی اپنے کتب خانوں کے موقف سے سرمو بھی تفاوت نہیں کیا۔ ۱۹۷۳ء کے نومبر میں جب پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے صدر دفتر کی لاہور منتقلی ہوئی تو مرحوم نے ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک پیغام میں کہا تھا۔

"میں ایک تاریخ داں اور استاد، دونوں حیثیتوں سے، اپنی زندگی میں کتاب اور کتب خانوں سے بہت قریب رہا ہوں، (لیکن) ان سالوں میں جن کے دوران میری وابستگی

آپ کی ایسوسی ایشن اور آپ سے رہی ہے میں لائبریری کے مرکزی کردار کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگا ہوں اسی لئے آج مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ آپ کی آرزوئیں، خواب اور کتاب کے بارے میں آپکے وہ خوف بھی میرے اپنے ہی ہیں جو آپ نے نئی ٹیکنکی دریافتوں کے اثرات کے نتیجہ میں کتاب کے زندہ فرائض منصبی پر ضرب لگتے ہوئے محسوس کئے ہیں"

یہ وہ الفاظ تھے جو ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۳ء کے آخری دنوں میں کہتے تھے، ایک سال سے کچھ عرصہ بعد اب الفاظ کی بازگشت ہی سنائی دیتی ہے۔ اس تحریک کو سنبھالا دینے والا اپنے خالق باری سے جا ملا ہے۔ اب کتاب کا کیا بنے گا، اور کتب خانوں کی اور واماندگی کو دور کرنے کون آگے بڑھے گا؟ ایک چراغ البتہ اب بھی روشن ہے اور یہ برابر جلتا رہے گا اس کی ہی روشنی کتاب کو اس ملک میں بھی چلا دیتی رہے گی۔ اور ان سے پھیلتی ہوئی روشنی کی کرنیں کتب خانوں کے لئے بھی طمانیت بخش ثابت ہوتی رہیں گی۔ اسی طرح جس طرح ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں خود ان کی ذات سے اس تحریک کو طمانیت اور سہارا ملتا رہا تھا۔

لیکن کتابوں کے لئے اس درد و کرب کو اہل نظر برسوں روتے رہیں گے جس کی تڑپ ہی نے ڈاکٹر صاحب کی دلنواز شخصیت میں کتابوں اور کتب خانوں کے لئے بھی ایک نمایاں درجہ پا لیا تھا، ڈاکٹر صاحب زندگی بھر حیات اور کائنات کو اس انداز دلبری کے ساتھ لے کر چلتے رہے جس کے نتیجے ہی میں کتاب کو بھی اس ملک میں ایک باوقار اور بامقصد مقام ملتا رہا، ڈاکٹر صاحب کی بھی کوششوں سے کتاب کے بہرصورت قائم رہنے کے امکانات تو پیدا ہو چکے ہیں اور اسی کتاب کے رشتے سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بے شمار باتیں بھی یاد آتی رہیں گی، شاید یہی یادیں، ہمارے کتاب ہی کے سفر کی، نشانِ منزل بن جائیں، اور یوں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو چراغ روشن کیا تھا وہ ہمارے لئے کتاب کے سفر کی بامقصد تکمیل کا وسیلہ بن جائے۔

محمد عادل عثمانی

کتب خانوں کا محسن و معمار

ڈاکٹر محمود حسین تاریخ کے پروفیسر، تاریخ داں، اور مورخ تھے۔ لیکن کتب خانوں کے سلسلے میں انہیں تاریخ ساز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے بانی صدر کی حیثیت سے انہیں وہ مقام حاصل ہے کہ دوسرا اس کی تمنا تو کر سکتا ہے لیکن اس پر فائز نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کا جادو تھا کہ اس ایسوسی ایشن کی پہلی کانفرنس کا جنوری ۱۹۵۸ء میں صدر مملکت کے ہاتھوں افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی اور سرکردگی میں لائبریری کی تحریک نے جنم لیا اور انہیں کی سرپرستی میں آگے بڑھی اور اسے ملک گیر تحریک کا درجہ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے لائبریری ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں اپنی صدارتی خطبات میں کتب خانوں کے فروغ کے لیے جن اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرائی حکومت نے انہیں عملی جامہ پہنانے پر مائل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نکلی ہوئی بات ایک وزن رکھتی تھی اور ان کے بیش بہا خیالات کو ہر طبقۂ خیال میں قدر کی جاتی تھی۔ اور لائبریری کے وہ مسائل جنہیں اس سے پہلے ملکی مسائل میں شامل نہ کیا جاتا تھا ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے توجہ کا مرکز بن گئے اور اس طرح اس تحریک کی ایک تاریخ مرتب ہونا شروع ہو گئی۔

انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات (SPIL) کے بانی ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں یہ ایسے شہریوں کی ایک فعال جماعت ہے جنہیں ملک میں کتب خانوں کے قیام سے اس لیے دلچسپی ہے کہ وہ سماج کی اصلاح کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اچھے کتب خانے کے ذریعہ سماج کی بہت سی برائیوں کا سدباب کیا جا سکتا ہے اور ایک ستھرا معاشرہ پیدا کرنے اور افرادی قوت کی ترقی میں اچھی کتابیں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس انجمن کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن کی حیثیت سے نمایاں

حصہ لیا اور کتب خانوں کے مختلف شعبوں میں ترقی کے لیئے کوشاں رہے اور اس انجمن کو ہر موقع پر انکی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی لیکن اس میں ڈاکٹر صاحب کے مفید مشوروں اور بزرگانہ رہنمائی کو خاصا دخل رہا ہے ۔

محمود حسین صاحب ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں ۔ ملک میں لائبریری سائنس جیسے ضروری شعبے کا موجود نہ ہونا انہیں کیسے برداشت ہوتا ۔ جامعہ کراچی کے ابتدائی مراحل ہی میں جبکہ موصوف ڈین فیکلٹی آف آرٹس تھے اس طرف توجہ فرمائی اور ۱۹۵۵ء میں اس کی کوشش شروع کر دی کہ لائبریری سائنس کے شعبے کا قیام عمل میں لایا جائے اور انہیں کی کوشش کے نتیجہ میں جامعہ کراچی میں تعلیمی سال ۵۶-۱۹۵۵ء میں ڈپلوما کورس کا انعقاد ہوگیا ۔ جو اپنی نوعیت کا ملک میں پہلا کورس تھا اور اس شعبے کے قیام کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے ۔ اسی شعبے کے قیام کی بدولت ملک کے اکثر کتب خانے تربیت یافتہ لائبریرین کی خدمات حاصل کر سکے اور اس طرح کتب خانوں کی حالت بہتر ہونے لگی ۔ لائبریری سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا دوسرا کارنامہ مشرقی پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا درجہ ڈپلوما سے بڑھا کر ایم ۔ اے ڈگری میں تبدیل کرنا ہے ۔ ۱۹۶۲ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ مشرقی پاکستان کے لیئے یہ پہلا اور تنہا ڈگری پروگرام تھا ۔ اس شعبے میں فارغ التحصیل طلبا نے ملک کے کتب خانوں کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ۔ لائبریری سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا تیسرا اہم کارنامہ جامعہ کراچی میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی پروگرام شروع کرنے میں مدد کرنا تھا ۔ ۱۹۶۷ء میں بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اور اکیڈمک کونسل میں جب یہ تجویز اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے پیش کی تو کچھ ممبران نے اس کی مخالفت میں آواز اٹھائی ۔ لیکن ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے تجویز کی پر زور تائید کی ۔ ان کی تائید کے بعد یہ تجویز منظور کر لی گئی اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی پروگرام بھی شروع ہوگیا ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی علم دوستی اور لائبریری سائنس اور کتب خانوں کی ترقی سے گہری دلچسپی کی مثال ہے ۔

ڈاکٹر صاحب ایک مصنف اور محقق کا درجہ بھی رکھتے ہیں وہ محقق کی حیثیت جانتے تھے کہ تحقیق کا کام بغیر اچھے کتب خانوں کے نہیں ہو سکتا اسی لیئے ڈاکٹر صاحب نے کتب خانوں کی

ترقی پر پوری توجہ صرف کی۔ وہ جامعہ ملّیہ کا کتب خانہ ہو یا جامعہ کراچی کا۔ یا ملک کے عوامی کتب خانے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ اور وہ ہر کتب خانے کی ترقی کے لیے یکساں کوشاں رہے ہیں۔ تحقیق کے سلسلے میں کتابوں، مخطوطات اور رسائل کی کمی اور کتب خانوں کی زبوں حالی اور محققین کی مشکلات پر ڈاکٹر صاحب نے سنہ ۱۹۵۳ء کے اخبار ڈان میں ایک نہایت دقیع مضمون لکھا تھا۔

جامعہ کراچی اور اس کا کتب خانہ پاکستان کے خوش قسمت اداروں میں سے ہیں کہ اسے ملک کے دو نامور شخصیتوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین یہ دونوں حضرات کتب خانہ کو ترقی دینے کے سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اور اپنی گہری دلچسپی کے باعث کتب خانے کے مسائل کو خاص اہمیت دیتے رہے۔ کتب خانے کی عمارت۔ اس کے ساتھ مناسب فنڈ۔ عملے کی تعلیم و تربیت اور انہیں صحیح مقام دلانا۔ غرض کہ ہر شعبے کی طرف انہوں نے بھرپور توجہ کی ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے ڈین فیکلٹی آف آرٹس۔ لائبریری کمیٹی کے چیرمین اور وائس چانسلر کی حیثیت سے، ہر مرحلے پر کتب خانوں کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں اور تحریروں میں ذمہ دار حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہے ہیں۔ کتب خانہ بہتر بنانے کے سلسلے میں ان کی ذاتی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ وہ لائبریری میں بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے۔ لائبریری کے لیے کتب و رسائل کا انتخاب خود کیا کرتے تھے جس کے لیے مختلف کتب خانوں کے کیٹلاگوں۔ ناشروں و کتب فروشوں کی فہرستوں اور دوسری کتابیات اُن کے زیرِ مطالعہ ہوا کرتی تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ہر اچھی کتاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہو۔ وہ صرف تاریخ ہی کے موضوع پر نہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات۔ سیاست۔ اور دوسرے موضوع پر دلچسپی سے کتابیں منتخب کیا کرتے تھے۔ جامعہ کراچی کا کتب خانہ اگرچہ عام طور پر مالی مشکلات کا شکار رہا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی انتخاب کردہ ساری کتب کا حصول مشکل ہوتا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو لائبریری کمیٹی میں یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اگر دوسرے شعبے کتب کے انتخاب میں دلچسپی نہیں رکھتے تو ان کے حصے کی رقم کو تاریخ کی کتب خریدنے میں استعمال کی جائے تاکہ بچی ہوئی رقم کا صحیح مصرف ہو سکے۔ یہ

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ لائبریری میں تاریخ کا شعبہ دوسرے شعبوں سے نسبتاً زیادہ بہتر ہوگیا اور کتابوں کی تعداد ملک کے دوسرے پرانے کتب خانوں سے بھی زیادہ ہوگئی جس پر کراچی یونیورسٹی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

علاوہ کتب و رسائل کے ڈاکٹر صاحب نے لائبریری کے لیے مائکروفلم حاصل کرنے کے لیے خصوصی توجہ کی اور بڑی محنت و دلچسپی سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے کیٹلاگ کھنگالے اور ضروری کتب و مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کرکے ان کے مائکروفلم حاصل کرنے میں کتب خانہ کی مدد کی اور انہیں پڑھنے کے لیے دو مائکروفلم ریڈر بھی خریدنے کی سفارش کی۔ مائکروفلم کا یہ ذخیرہ جس کا کیٹلاگ لائبریری نے شائع کردیا ہے ڈاکٹر صاحب کی کوشش کا مرہون منت ہے۔

جامعہ کا کتب خانہ اپنے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے مخطوطات اور دوسرے نوادرات جمع کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کرسکا۔ دراصل درسی کتب کی فراہمی کتب خانہ کا بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ نئے شعبوں کا اضافہ۔ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور طلباء میں کتاب نہ خریدنے کا رجحان' یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ کتب خانہ کو اپنے وسائل کی صرف کرنی پڑتی تھی اور اس لیے محققین کی ضرورت کی طرف پوری طرح توجہ کرنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی ڈاکٹر صاحب کی نظر ایسی نادر کتب یا مخطوطات پر پڑتی جو جامعہ کے تعلیمی۔ تدریسی اور تحقیقی کاموں کے لیے ضروری تھیں تو انہوں نے پوری کوشش کی کسی نہ کسی طرح سے وہ کتابیں حاصل کرلی جائیں اور اس طرح جامعہ کے کتب خانہ میں کچھ مخطوطات اور کچھ نوادرات جمع کیے جاسکے۔ ان کے کیٹلاگ بھی الگ الگ شائع ہوچکے ہیں۔ ان نوادرات کے جمع کرنے کا سہرا بھی زیادہ تر ڈاکٹر صاحب کے سر ہے۔ جب یہ کیٹلاگ میں ان کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا تو انہوں نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اگست ۱۹۶۱ء میں جب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کا چارج لیا تو یونیورسٹی کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کے فوراً بعد دسمبر میں ملک ایک بڑے

بحران سے دوچار ہوا، ہر شعبۂ زندگی پر اس کا اثر پڑا اور جامعہ کراچی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جامعہ کا کتب خانہ بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس کے تمام وسائل مسدود ہو گئے۔ خریداری کتب بھی اثر انداز ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اس صورت حال کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور اپنی تقریروں میں لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہے ۱۹۷۰-۷۱ء سے لیکر ۱۹۷۲-۷۳ء تک کتب خانہ کو انتہائی مالی بحران کا سامنا رہا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب جہاں سے بھی ہو سکا کتب خانہ کی مدد کرتے رہے چونکہ وسائل کے لیئے بہت بڑی رقم درکار ہوتی تھی اس لیئے اس کا انتظام تو نہ ہو سکا۔ البتہ تھوڑی بہت کتب کی خریداری صرف ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کے نتیجہ میں ہوتی رہی۔ اس دوران وہ اپنی پوری کوشش میں لگے رہے کہ کتب خانہ کو اس بحران سے کسی طرح نجات دلائی جائے اور بالآخر ۱۹۷۲-۷۳ء میں کچھ کامیابی ہوئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال میں جب جامعہ کو ترقیاتی فنڈ ملا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا پچاس فیصد لائبریری کے لیئے مختص کر دیا۔ جامعہ کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ اس کی مجموعی ترقیاتی فنڈ کا پچاس فیصد صرف کتب خانہ کے لیئے مختص کیا گیا ہو۔ اس دوران مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کو برابر خطوط لکھے جاتے رہے اور ڈاکٹر صاحب نے جب بھی موقع ملا وزراء تعلیم کی توجہ لائبریری کی زبوں حالی کی طرف دلائی جس کے نتیجہ میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۳ لاکھ کی رقم اور حکومت سندھ نے ایک لاکھ اسی ہزار رقم گرانٹ کے طور پر جامعہ کے کتب خانے کو دی۔

اتنی بڑی رقم اس سے قبل ایک سال میں کتب خانہ کے حصہ میں کبھی بھی نہ آئی تھی۔

جب ۱۹۷۴-۷۵ء کا بجٹ پاس ہوا تو کتب خانہ کے لیئے ۵ لاکھ روپے کی رقم منظور کی گئی۔ اتنی بڑی رقم اس سے قبل کتب خانہ کے بجٹ میں کبھی بھی نہ مختص کی گئی تھی اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ جامعہ اور کتب خانہ کی تاریخ میں پہلی بار سالانہ بجٹ میں یہ رقم کتب خانہ کے لیئے رکھی گئی تھی۔ اس سے قبل کتب خانہ کی کتب و رسائل کی ضروریات پر ترقیاتی فنڈ سے پوری کی جاتی رہی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں کوئی باضابطہ خریداری کا پروگرام بنانا مشکل تھا کیونکہ جامعہ کو اس کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ترقیاتی فنڈ کتنا ملے گا اور کب مل سکیگا

یہ سب ایسی باتیں ہیں جس سے ڈاکٹر صاحب کی کتب خانہ کے معاملات میں گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتب خانہ میں کتب، رسائل اور دیگر مطالعاتی مواد کے علاوہ بہت سی دوسری سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً پڑھنے والوں کے لیے اچھی عمارت مناسب فرنیچر ہوا۔ روشنی۔ پینے کا ٹھنڈا پانی وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سب باتوں کی طرف توجہ فرمائی۔ لائبریری کی عمارت میں پنکھوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کے لیے خاص طور سے رقم فراہم کر کے ریڈنگ روم میں پنکھوں کا انتظام کیا۔ واٹر کولر اسی زمانے میں لگا۔ پڑھنے والوں کی ضرورت کے پیش نظر لائبریری کی عمارت میں اندرونی ردّ و بدل کے بعد تقریباً دو سو پڑھنے والوں کے لیے مزید انتظام کیا گیا اور ان کے لیے فرنیچر بھی مہیا کیا گیا۔ یہ سب اس دور میں ہوا جب کہ جامعہ کی مالی حالت ابتر تھی۔

کتب و رسائل کی کمی کی وجہ سے طلباء کو جس پریشانی کا سامنا تھا ڈاکٹر صاحب اس سے بہت فکر مند تھے اور جب ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ اگر ایک فوٹو کاپی کی مشین کا انتظام ہو جائے جس سے ہر شعبے کے ضرورت مند طلباء کو کتب و رسائل کے صفحات نقل کر کے دیئے جا سکیں تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری کوشش اس کے حصول کے لیے کی۔ اس میں شک نہیں کہ طلباء یونین کے عہدیداروں کی کوشش کو بھی اس کے حصول میں دخل رہا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کی وجہ سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک لاکھ پچاس ہزار کی رقم بطور خاص عطا کی جسے ڈاکٹر صاحب نے الگ اکاؤنٹ میں رکھوا دیا۔ مشین کی خریداری کے سارے انتظامات ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ہو چکے تھے اور وہ اس سے بہت خوش تھے کہ سادے کاغذ پر بہت سستے داموں طلباء کو کتابوں کی نقول اب دستیاب ہو سکیں گی۔ یہ اور بات ہے کہ مشین کا افتتاح ان کی زندگی میں نہ ہو سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی روح کتب خانے میں پڑھنے والوں کو مزید ایک اور سہولت مہیا ہونے پر بہت خوش ہو گی۔

کتب خانے کا عملہ خدمات مہیا کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ اس کا احساس رہا کہ ایک اچھا تربیت یافتہ عملہ جامعہ کے کتب خانہ کی خدمات

کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے وہ اس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے کہ عملے کو درپیش
مشکلات حل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ چنانچہ جب تنخواہوں کے نئے اسکیل بننے کے
وقت لائبریری کے تربیت یافتہ عملے کو تدریسی عملے سے الگ کر کے کم درجہ دیا گیا تو ڈاکٹر صاحب
نے باضابطہ اور پرزور طور پر حکومت کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرائی اور
جامعہ کے سنڈیکیٹ سے یہ تجویز منظور کرائی کہ لائبریری کا ٹیکنیکل عملہ اساتذہ کے برابر تنخواہ
لینے کا حقدار ہے۔

جامعہ کے کتب خانہ سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کی ایک غیر معمولی مثال یہ ہے کہ اس
شدید بحران کے دور میں جب کہ وہ خود انتہائی فکرمند تھے اپریل ۷۴ء میں انہوں نے جامعہ
کے تمام فیکلٹیز کے ڈین اور صدور شعبہ جات و تنظیم اتحاد طلباء کے صدر اور مشیر کی
ایک میٹنگ کتب خانہ میں بلائی تاکہ کتب خانہ کے مسائل پر سب مل کر غور و خوض کر سکیں
اور اس کے حل کے لیے مفید مشورے دے سکیں۔ اس موقع پر انہوں نے کتب خانہ
کی اہمیت پر زور طور پر بیان کی اور تمام حضرات سے تعاون کی اپیل کی۔ اس قسم کی
میٹنگ کی مثال جامعہ کراچی کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں ملتی۔ اسی کے ساتھ ایک قابلِ
ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کر کے بہت سے ذاتی کتب خانے
جامعہ کے کتب خانے کو دلوانے میں کامیاب ہوئے۔

جامعہ کراچی کے سنڈیکیٹ نے ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد اپنی ایک میٹنگ
میں یہ فیصلہ کیا کہ جامعہ کے کتب خانے کا نام ڈاکٹر محمود حسین کتب خانہ رکھ دیا جائے یہ ایک
مستحسن فیصلہ ہے۔ کاش ہم جامعہ کراچی کے کتب خانے کو ایک بڑا کتب خانہ بنا سکیں۔
اس کے معیار کو بلند اور اس کی کارکردگی کو بہتر بنا سکیں۔ تاکہ اس سے علم و آگہی کے
چشمے پھوٹیں، تحقیق کے لیے نئی راہیں پیدا ہوں اور ڈاکٹر صاحب کی روح خوش ہو

مختار زمن

کتاب صاحبِ کتاب اور کتُب خانے[1]

ایک خوشگوار صبح کو کراچی یونیورسٹی لائبریری کے اَمین خورشید صاحب نے مجھے فون کیا اور فرمایا کہ لائبریریوں کے متعلق جناب محترم ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی کتاب شائع ہوگئی ہے، میں خوش ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر دلکش بھی ہوتی ہے اور فائدہ مند بھی، پھر خورشید صاحب بولے کہ "کتاب کی رونمائی کی رسم پاکستان نیشنل سنٹر کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تم بھی شرکت کرو"۔ میں اور بھی خوش ہوا اس لئے کہ نیشنل سینٹر کی تقریبات بڑی صاف ستھری ہوتی ہیں۔ گو یہاں "ہوٹنگ" کا رواج نہیں اور آغاز جلسہ کے لئے بقولِ غالب انتظارِ ساغر کھینچنا پڑتا ہے لیکن اختتام جلسہ پر ساغر سے نہیں، چاء کی پیالی ۔ مع لوازمات ۔ ملتی ہے اور کسر پوری ہو جاتی ہے۔

اصل دھماکہ اس بیش لفظ قسم کی گفتگو کے بعد ہوا۔ خورشید صاحب بولے کہ "تمہیں اس کتاب کے بارے میں ایک مضمون پڑھنا ہے ۔ بہانہ کوئی نہیں چلے گا"۔ لیجئے دیکھتے ہی دیکھتے خورشید سوا نیزے پر آگیا!

بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب ایک عالمِ متبحر ہیں، عمل و علم کا پیکر ہیں۔ ان کی تقریریں دلچسپ اور تحریریں پُر مغز ہوتی ہیں۔ وہ تاریخ داں بھی ہیں اور تاریخ ساز بھی۔ اُن کی کتاب کے بارے میں مجھ جیسے شخص کا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن نہ کہنا موجب خطرات ہو سکتا ہے اس لئے میں نے حامی بھرلی۔

دو چار دن بعد مجھے ایک چھوڑ، دو، دو دعوت نامے بھیجے گئے اور قاصد پیغام زبانی بھی لایا کہ چاہو تو ایک آدھ دوست کو بھی ساتھ لے آؤ ـــــ اس وقت مجھے یہ قصہ یاد آیا کہ زمانۂ

---

[1] یہ مضمون ڈاکٹر محمود حسین کی کتاب "لائبریری اور لائبریریز" کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا۔

قدیم میں جب تیسرے درجے کے پھیکے مرثیہ گو کسی محفل میں جاتے تھے تو اپنے ساتھ چند بسُور یے بھی لے جاتے تھے تاکہ اگر کہیں سامعین سخن شناس ہوئے اور ان پر کلام کا اثر نہ ہوا تو کم از کم بسُوریے تو رو لیں ـــــ مجھے خورشید صاحب کی دُور اندیشی کا لوہا ماننا پڑا۔ شاید انھوں نے سوچا ہو گا کہ اگر کہیں مقررین کی فہرست میں میرا نام دیکھ کر کچھ لوگ بدک گئے اور شرکت سے معذوری کا بہانہ کر کے کھسک گئے تو کم از دو ایک وفادار حاضرین تو میں اپنے ساتھ لگا تا ہی لاؤں گا۔

عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب لائق فائق بزرگ ہیں، ان کا پورا خاندان عالموں اور ہنر پروروں کا خاندان وہ کتابیں پڑھاتے ہیں۔ کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور پارکھ بھی ـــــ لیکن نہایت معصوم اور بھولے بھالے آدمی ہیں، اُن کی گفتگو سُن کر اور ان کے شاندار چہرے پر معصوم بچوں کا سا بھولپن کا تبسّم دیکھ کر یہ شبہ تو مجھے ہمیشہ سے رہا ہے کہ وہ سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن جب زیر نظر کتاب "لائبریری اور لائبریرین" پڑھی تو میرا شبہ یقین سے بدل گیا ـــــ بلکہ اندیشہ ہوا کہ کوئی حریف شرارت پر آمادہ نہ ہو جائے کہ اس گروہ کا یہ پرانا وطیرہ رہا ہے، اس لئے مجھے یہ شعر یاد آیا ہے

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے یہ جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یعنی ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، اور لائبریریوں کے قیام کی کوشش کرتے ہیں یعنی اس دور میں بھی موصوف نے کسی فائدہ مند، نفع بخش، چٹپٹی مزیدار پارٹی کی صدارت نہیں کی بلکہ لائبریری ایسوسی ایشن جیسے پھیکے سیٹھے ادارے کے صدر رہے ـــ ہائے کیا سادگی ہے۔ کیسا انکسار ہے قوم کی یہ حالت کہ اس کا بس چلے تو ہر اسکول، کالج کے سامنے ایک ایک سینما کھلوا دے لائبریریوں کو "بوتیک" اور ہوسٹلوں کو رقص گاہوں میں تبدیل کر دے گر ہمارے ڈاکٹر صاحب کے قسم کے لوگ اُلٹی گنگا بہانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں خالقدینا ہال لائبریری کے لئے کراچی میونسپل کارپوریشن نے ڈیڑھ سو روپے منظور کئے اور ۲۵ روپے سالانہ ترقی کے لئے مقرر کئے، حالانکہ چپراسیوں تک کے لئے ۶۰۰ روپے سالانہ منظور کیے گئے تھے،

اگر غور کیا جائے تو کراچی میونسپل کارپوریشن نے کیا بُرا کیا کارپوریشن کی عمارت پر بہت بڑا گنبد ضرور ہے مگر وہ خود بسم اللہ کے گنبد میں نہیں رہتی۔ وہ عوام کی حاجت سے واقف ہے، اُسے نالیوں اور کوڑے کرکٹ کا قرب حاصل ہے، اس لئے اس عوامی ضروریات کے واقف کار ادارے کو معلوم تھا کہ عوام کیا چاہتے ہیں۔ ڈیڑھ سو رُوپے بھی کچھ کم نہیں، ۱۹۵۱ء کا زمانہ تو سستا زمانہ تھا، آج بھی آپ کی دعا سے تو ڈیڑھ سو روپے میں "مس ہپّی"، "تہاڈی عزت دا سوال"، "منجھی کتھے ڈانواں" "پیا سے نین"، "نمک حرام"، اور "بدمعاش پُتر" وغیرہ قسم کے معرکتہ الارا، کھڑکی توڑ فلموں کے گانوں کی کئی کئی جلدیں اس رقم سے خریدی جا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ ڈائجسٹوں، جاسوسی ناولوں اور سفلی عمل و جنسیات جیسے اہم موضوعات پر بھی عام فہم اور دلچسپ تصانیف حاصل ہو سکتی ہیں۔ کیا خالقدینا لائبریری اس خالص عوامی اُدب سے اپنے کو زینت نہیں دے سکتی تھی؟

—— اور پھر لائبریری جیسی بے جان چیز کی گرانٹ کا مقابلہ چپراسی جیسے سماج کے اہم کارکن سے کرنا بھی مناسب نہیں، چپراسی کو آپ کم نہ سمجھئے، وہ ہمارے نوکر شاہی نظام کا بنیادی پتھر ہے، وہ صرف ڈیڑھ روپے میں آپ کو بڑے سے بڑے حاکم سے ملوا سکتا ہے، وہ اسٹول پر بیٹھ کر دن بھر میں چار کی چند پیالیوں پر گزارہ کرتا ہے مگر اس کے بغیر نہ بیگم کی شاپنگ ہو سکتی ہے نہ بیبی کو اسکول بھیجا جا سکتا ہے، میں نے ایسے صاحب بہادر دیکھے ہیں کہ فرسٹ کلاس کی کھڑکی پر ریل کا ٹکٹ لینے جائیں تو ٹکٹ بابو انھیں دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ "بابوجی تھرڈ کی کھڑکی اُس طرف ہے۔ یہ منہ اور مسُور کی دال" البتہ باوردی چپراسی کی تنخواہ ۶۰۰ روپے سالانہ بھی کم تھی، اب دیکھئے کہ چوگنی کرنا پڑی۔

میں ڈاکٹر صاحب کی علم پروری، دردمندی اور دلسوزی کا منکر نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے ہمیں لائبریریاں بھی چاہئیں، اور کتابیں بھی ضروری ہیں، لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ہم فرزندانِ توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہیں۔ اور سمندر ہر شے کو بہالے جاتا ہے خواہ کتاب ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کتابوں کے کیڑے نہیں بلکہ کیڑوں کو کتابیں کھلانے والے سخی داتا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تو مورّخ ہیں۔ انھیں مجھ سے زیادہ معلومات حاصل ہیں، کہیں ایسا تو نہیں

ہے کہ ہمیں لائبریریاں راس نہیں آتیں، ایک اندلس میں بنائی تو پادریوں نے آگ لگادی تین دن تک سلگتی رہی، بغداد کی کتابیں دجلہ میں غرق ہوئیں، ہمایوں بادشاہ اچھا بھلا تھا، بڑے ذوق وشوق سے لائبریری بنوائی۔ اسی کی سیڑھی پر سے گر کر جاں بحق ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں وہ باتیں پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں کام آتی ہوں گی جب اہل اسلام کو "اطلب العلم" والی بات یاد تھی، اب ہم نہ کتاب خواں، نہ صاحب کتاب، بس "ہذا من فضل ربی" کا مزہ لوٹنے والے مسلمان ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں کسی آئندہ دور کے لئے ہوں گی جب لوگ فلم دیکھنے کے بجائے کتابیں دیکھا کریں گے، یہ دور دوسرے ڈھنگ کا ہے۔ یہ سطحیت کا دور ہے جب مجھ جیسا ہیچمدان صحافی ڈاکٹر صاحب جیسے عالم کے بارے میں بات کرتا ہے۔ یہ دور ترقی کا دور ہے۔ اب ہم کتابیں لکھنے پڑھنے میں وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ نعرے لکھنا عوامی ادب ہے یعنی ہم سیاسیات ومعاشیات کے سمندر کو نعرے کے کوزے میں بند کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نعروں کے لئے لائبریری کی ضرورت نہیں، غیر کی دیوار کافی ہے، اور اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ ادب کی ترویج واشاعت ضروری ہے تو قوم ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کرتی ہے کہ جناب کا فرمانا درست ہے چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن جناب والا یہ تو تسلیم کریں گے کہ خواہ کتنی ہی لائبریریاں ہوں۔ ان سے صرف محدود کرم کتابی قسم کا طبقہ ہی فائدہ اٹھائے گا۔ قوم نے ادبی ترویج واشاعت کے لئے دوسرا طریقہ ایجاد کرلیا ہے۔ ہم اپنے عوامی ادب کو بسوں، ٹیکسیوں، رکشاؤں کی پشت پر رقم کر رہے ہیں۔ کاغذ پر لکھے ہوئے مخطوطوں کا دور ختم ہوا، جو لائبریریوں کی زینت اور لائبریرینوں کی زحمت کا باعث تھے، ہمارے اس جدید ادب میں رکشا اور بس کے ہر جھٹکے کے ساتھ عوام کا دل دھڑکتا ہے برجستہ فقرے، انوکھے القاب، نثری اشعار ان گاڑیوں کی پشت پر محفوظ ہو چکے ہیں، کسی شعر میں اگر وزن نہیں یا مصرعہ گرتا ہے تو کیا ہوا۔ سڑک خراب ہے تو جھٹکا ضرور لگے گا اور آپ بھی گر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پچھلے چند برسوں کی ثقافتی وعلمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ لائبریریوں کی ضرورت پر زور دیا، عام لوگوں کی لاپرواہی کا مرثیہ پڑھا۔ مرض کے علاج بھی تجویز کئے۔

مثلاً یہ کہ تربیت یافتہ لائبریرین ضروری ہیں، رقم کی فراہمی لازمی ہے۔ ملک میں لائبریریوں کا جال بچھانا چاہیئے، تحقیق و تدقیق کی آسانیاں پیدا کی جائیں، لیاقت میموریل لائبریری پہلے قومی لائبریری تھی، اس سے یہ درجہ چھین لیا گیا۔ اُسے دوبارہ قومی لائبریری کا درجہ عطا کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ موجودہ تعلیمی پالیسی کے بعد صورتِ حال شاید بہتر ہوتی نظر آتی ہے ——— خدا کرے ایسا ہی ہو اور خدا کرے جن باتوں پر ڈاکٹر صاحب نے زور دیا ہے وہ پوری ہوں۔

——— میں نے جو باتیں پہلے عرض کی تھیں ان میں بھی ڈاکٹر صاحب ہی کا سخن بالا کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ پر "سخن فہمیٔ عالم بالا" کا فقرہ چسپاں نہیں ہو سکے گا اور آپ سارے اشارے کنائے سمجھ گئے ہوں گے۔

پہلا اور بہت اہم اعتراض یہ ہے کہ اُردو کو اگر قومی زبان بنایا گیا تو مقامی زبانوں کی حق تلفی ہوگی اور رفتہ رفتہ اُردو' ان ہی کی جگہ لے بیٹھے گی۔ اُردو کو سرکاری یا قومی زبان کا مرتبہ دینا مقامی زبانوں کو پھانسی لگانے کے مترادف ہے۔

یہ اعتراض یا تو محض لاعلمی اور غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا یہ کہ پاکستان میں اب بھی ایسے عناصر موجود ہیں جو پاکستان کی وحدت کو دھکا لگانا چاہتے ہیں اور وہ ہماری یک جہتی کو کبھی صوبہ داریت کے دیوتا پر بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں، تو کبھی زبان کا شوشہ چھوڑ کر قوم میں بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اُردو کے سرکاری زبان ہونے سے صوبائی زبانوں کی حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ——— صوبائی زبانیں اسی طرح قائم رہیں گی۔ جس طرح آج قائم ہیں۔ صوبائی زبانیں ہماری زبانیں ہیں۔ وہ پاکستانی زبانیں ہیں۔ اور ہم کو اسی طرح عزیز ہیں جس طرح ہر پاکستانی چیز۔ ان کا تحفظ۔ ان کی بقا، ان کی ترقی ہماری فرض ہے۔ ہم نے پہلے بھی ان بوٹوں کی آبیاری کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

محمود حسین

ریاض صدیقی

مدتوں رویا کرینگے جام و پیمانہ تمہیں

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم برصغیر کی مسلم قومیت کی نشاۃ ثانیہ کے آخری چراغوں میں تھے۔ کچھ چراغ پہلے بجھ چکے تھے جو باقی ہیں بجھنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ عمر کے آخری منازل میں سبھی مرحوم کو آرام کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

لیکن انھوں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا، آخر دم تک کام کرتے رہے، ہاتھ میں قلم لئے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی زندگی ابتداء سے لے کر آخری لمحوں تک جدوجہد کی زندگی تھی۔ ذہنی اور اعصابی تکالیف میں شدت کے باوجود وہ "سندھ صدیوں کے آئینے میں" جیسے اہم جشن کی تنظیم و آرائش اور کامیابی کے لئے راتوں کی نیند حرام کرتے رہے اور اسی کے اجلاس ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئے تاہم علما و فضلاء، اہلِ سیاست اور دُنیا کے دوسرے علاقوں سے آنے والے مہمان سب نے مرحوم کی کاوشوں اور کوششوں کو خراج پیش کیا۔ یوں تو قیام پاکستان کے بعد مرحوم یہاں کے ثقافتی، علمی اور تعلیمی جلسوں میں شمعِ محفل کی حیثیت سے نمایاں رہے لیکن سندھ صدیوں کے آئینے میں ان کا انداز سب سے زیادہ دلاویز تھا اور وہ جلال و جمال کا مرقع نظر آرہے تھے۔ مرحوم نظریہ پاکستان کے امینوں اور قومی و ثقافتی یکجہتی کے نقیبوں میں تھے اور حال کے سماجی ثقافتی و علمی بحران کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کر رہے تھے قومیتوں اور علاقائی امتیازات کے انتہاپسندانہ رویئے سے انہیں اختلاف تھا اس اختلاف کے باوجود "سندھ صدیوں کے آئینے میں" عملاً انہوں نے یہ ثابت کیا کہ پاکستان کے سارے علاقوں کی ثقافت اور یہاں کے ادبی و لسانی سرمایے سے انھیں لگاؤ ہے، پاکستان میں مسلم قومیت۔ قومی ثقافت اور جدید صنعتی و سائنسی شعور کے امتزاج سے عبارت قومی طرزِ تعلیم کا ایک فعال منصوبہ مرحوم کے ذہن میں تھا چنانچہ ۱۹۵۲ء میں سیاست کے خارزار کو خیر باد کہہ کر وہ اپنے منصوبوں کی ترویج و اشاعت کی جدوجہد میں منہمک ہو گئے ——

—— یہ جدوجہد آخری دم تک مختلف طریقوں سے جاری رہی۔ جامعہ ملیہ جیسے

ہمہ گیر تعلیمی اداروں کا قیام مرحوم کی جد و جہد کا تاریخی کارنامہ ہے۔ معیار اور نصابی معنویت کے اعتبار سے ایک ایسا دور بھی آیا جب جامعہ ملیہ کے علمی اداروں کو پاکستان اور عالم اسلام میں نمایاں شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی اور طلبا ملک اور اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے جامعہ کی اقامت گاہوں میں بغرض تعلیم قیام کرنے لگے۔ اس علمی ادارے کی یہ ہمہ گیر حیثیت قومیائے جانے تک قائم تھی۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے میں ان اداروں کے تحت متعدد قابل ذکر علمی و ثقافتی سیمینار منعقد ہوئے اور یہاں سے اعلیٰ پائے علمی و درسی کتب شائع ہوئیں اس کے علاوہ معیار اور موضوعات کے اعتبار سے اس ادارے کا سہ ماہی رسالہ ملک کے بہترین رسالوں میں تھا۔ کتب خانے کے اعتبار سے بھی جامعہ ملیہ کالج پاکستان کے ان چند اداروں میں سے جن کے کتب خانے قابل ذکر ہیں[2]۔ مجموعی اعتبار سے یہ ساری منصوبہ بندی مرحوم ہی کی جد و جہد کا حاصل ہے۔ مرحوم کو زندہ رکھنے کے لئے یہ کارنامہ ہی کم نہیں ہے۔

---

[1] قومیائے جانے کے بعد اگرچہ اس ادارے کی لائبریری کو تباہ ہونے سے بچا لیا گیا ہے لیکن مرحوم کا قائم کردہ مکتبہ تعلیم ملی اور مرحوم کی نگرانی میں شائع ہونے والا انگریزی سہ ماہی دونوں ہی معطل ہو چکے ہیں۔ سہ ماہی انگریزی رسالہ کی تاریخ اجرا جنوری ۱۹۶۰ء تھی اور یہ جولائی ۱۹۷۲ء تک بغیر کسی تعطل کے شائع ہوتا رہا۔ ان رسالوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے کل چودہ مقالے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر مرحوم کی معاونت کرنے والوں میں سب سے زیادہ قابل توجہ کردار ڈاکٹر اسمٰعیل سعد کا ہے وہ بہت مختصر مدت تک کالج کے پرنسپل بھی رہے اور قومیائے جانے کے بعد انہیں کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا کہ اپریل ۷۳ء میں وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو کر نیپا کے تربیتی کورس میں شریک ہوگئے۔"

[2] قومیائے جانے کے بعد جامعہ ملیہ کالج انتظامی اعتبار سے تباہی کا شکار ہوگیا اور کتب خانے کا نظام بھی درہم برہم ہوگیا۔ ۱۰ نومبر ۷۳ء کے بعد راقم اس کتب خانہ کی نگرانی پر معمور کیا گیا۔ ان دنوں میں درسی کتب کے شعبے کی از سر نو تنظیم کی گئی اور اب یہ شعبہ ہر طرح مکمل اور خود کفیل ہوگیا ہے۔ ان دو سالوں میں جدید ادب۔ شاعری۔ تنقید و تحقیق اور افسانہ و ناول پر بہترین کتابیں خرید کی گئی ہیں۔ اس طرح سروے کے مطابق اب اس لائبریری میں کم از کم

ماہرِ تعلیم کی حیثیت ان کی شخصیت بڑی اہم ہے اس موضوع پر ان کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے بصیرت افروز خطبات بڑی مقدار میں موجود ہیں ان خطبات کو سن اور موضوعات کے اعتبار سے اگر سمیٹ کر یکجا کر لیا جائے تو ان کا منظم و مربوط فلسفہ تعلیم ہمارے سامنے آتا ہے مرحوم نے ہر موقع پر اور ہر اسٹیج پر اپنے تعلیمی نظریات کی تبلیغ کی ہے گزشتہ دہائی خطرناک سیاسی۔ ثقافتی۔ اخلاقی اور علمی بحران اور بکھراؤ کی دہائی تھی مرحوم اس بکھراؤ کو سنبھالا دینے کی خاطر آخری سانس تک ان علمی قوتوں کو مجتمع کرنے کی سعی کرتے رہے جو ان کے پاکستانی تعلیمی افکار کی تنظیم و نمو پذیری کو اجتماعی تحریک کا رنگ دے سکیں۔ آج نئی نسل جس بکھراؤ اور ذہنی دیوالیہ پن سے دوچار ہے اس کی اطلاع مرحوم نے ۱۹۶۰ء کے ایک سیمینار لکچر میں دی تھی اور ارباب اختیار کو یہ مفید مشورہ دیا تھا کہ علم و آگہی اور ثقافت کے معاملات میں فیصلوں کی لغزش سے جو خطرناک مابعد اثرات پیدا ہوں گے ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ وہ دور تھا جب قومیتوں اور علاقائی امتیازات کا ہلکا ہلکا شعور ابھر رہا تھا۔ ماہرین تعلیم کے ایک اہم جلسے میں مرحوم نے کہا

"کسی ملک کا تعلیمی نظام ریلوے نیٹ ورک نہیں ہو سکتا دوسروں سے سیکھنا اچھی علامت ہے بشرطیکہ اس کا مقصد مفید اجزا کو جذب کرنے کی حد سے تجاوز نہ کرے لیکن پاکستان میں انجذاب کی روش اختیار کرنے کے بجائے تقلید اور نقل (Imitation) کا راستہ اپنایا گیا"

سائنسی حقیقت پسندی صنعتی علوم۔ جدید ترین نیوکلیر اور خلائی علوم اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو نظریہ پاکستان کے شعور سے ہم رشتہ کرنے کے عمل کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے علمی سائنسی۔ ثقافتی اور تنظیمی کارناموں سے پاکستان کی نئی نسل کو آگہی فراہم کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا انداز تبلیغ ماضی پرستی کے رجحان سے علاقہ نہیں رکھتا تھا وہ نئی نسل کو سلانے کے بجائے جگانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے قومی ورثے اور روایات سے رس حاصل کر کے عصر جدید کے تقاضوں کو بہتر سے بہتر طور پر پورا

چالیس ہزار کتابیں ہیں۔ گزشتہ سال سے کتب خانے ایسے تمام ادبی جراید باقاعدگی سے خریدے جا رہے ہیں جن کو ملک میں نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ ان کاموں کے علاوہ ان نادر کتابوں اور مخطوطوں کی فہرستیں بھی تیار کر لی گئی ہیں جو اس سے پہلے تیار نہیں کی گئی تھیں۔ جدید انگریزی شاعری اور تنقید پر بھی مستند کتابیں خرید کی جا چکی ہیں۔

کر سکے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قدیم مر چکا ہے مستقبل ان کا ہے جو جدید دنیا کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں"

ڈاکٹر محمود حسین کی فکر کا کینوس کیا تھا اس کے لئے چند سطریں دیکھئے

"اس حقیقت سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا عہد جمہور کا عہد ہے اور جمہوری نظام میں لوگوں کو بہترین تعلیم درکار ہوتی ہے تاکہ سماجی طور پر آزادی کے مفاہیم کو سمجھا جا سکے جس نظام تعلیم سے آزادی کا جمہوری شعور پیدا نہ ہو سکے وہ قوم کی تعمیر و تشکیل کے لئے زہر ہوتی ہے آزادی کا تعلق ضابطے سے ہے آزادی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم افراد کو کچی مٹی سے بنائے جانیوالے برتنوں کی مانند جس طرح چاہیں سانچوں میں ڈھال لیں۔ آزادی تعلیم بھی ضابطہ حیات کی پابند ہے تعلیم کا مقصد آزادی مطلق کے نیم وحشی اور غیر متمدن فلسفے کی تبلیغ نہیں ہے بلکہ جبلتوں اور فکر و احساس میں نظم و ضبط پیدا کر کے افراد کو فطرت سے قریب کر دینا ہے۔ پاکستانی تعلیم کے فلسفے پر جو اس قسم کی افکار و آرا مرحوم کے یہاں ملتی ہیں اُن سے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کا خاکہ بنتا ہے۔

۱۔ آزاد جمہوری سماج میں جینے کا قرینہ سکھلانا

۲۔ تعلیمی اور ثقافتی اداروں اور مشغلوں کا احترام پیدا کرنا

۳۔ علمی، ثقافتی اور اُدبی اداروں اور مشغلوں کو آزاد و خود مختار ماحول فراہم کرنا

۴۔ قومی ذہن اور شخصیت کی تشکیل کو ممکن بنا دینا

۵۔ سماجی فلاح کا شعور پیدا کر دینا

۶۔ پاکستانی قوم میں اسلامی مزاج کو عام کر دینا

اپنے لکچرز میں مرحوم نے پاکستانی تعلیم کے طریقہ کار کی بنیادی کمزوریوں کی اکثر نشاندہی کی ہے انہوں اس حقیقت کو بھی طشت از بام کیا کہ علمی و ثقافتی دنیا میں تازہ اور نئے ذہنوں کو کام کرنے کے زیادہ مواقع ملنا چاہئیں اور قدما کو نئی نسل کے لئے جگہ خالی کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیئے تاکہ علم و شعور کی دنیا میں عملی تیزی (Speed) اور اُڑنے والی قوت (Dynamism) پیدا ہو سکے۔ وہ روایت سے مکمل بغاوت کے قائل نہیں تھے بلکہ اس نظریئے کے مبلغ تھے کہ روایات و اقدار کو عصر حاضر کے تقاضوں میں ضم ہو کر ایک نئے ترقی یافتہ شکل میں متشکل ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر محمود حسین

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

جامعہ تعلیم ملّیہ کے اولین سائنسی اجلاس منعقدہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خطاب

غیر مطبوعہ

برادرانِ جامعہ!

آج ہم ایک نہایت ہی نیک مقصد کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جن حالات سے، پاکستان کو عالم وجود میں آنے کے فوراً بعد دوچار ہونا پڑا

ان کا آپ کو علم ہے۔ پاکستان میں نہ صرف ایک نئی حکومت بنی تھی بلکہ ایک نئی مملکت وجود میں آئی تھی، ایک ایسا علاقہ جو عرصے سے سرکاری انتظام کے اعتبار سے ایک سمجھا جاتا تھا دو حصوں میں تقسیم ہوا تھا ہر نئی مملکت کو شروع میں طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پاکستان کو نئے سرے سے حکومت ہی کی تشکیل نہ کرنی تھی، نیا دارالسلطنت بھی بنانا تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں کو پھر سے ترتیب دینا تھا۔ ہماری نئی مملکت کی دقتیں اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں تھیں کہ اس کے دو سب سے بڑے صوبے بھی جہاں پر پاکستان کی تقریباً اسّی فیصدی آبادی بستی تھی، تقسیم ہوئے تھے، بنگال اور پنجاب تقسیم ہو کر پاکستان میں آئے تھے۔ یہ مسائل بجائے خود ایسے تھے کہ ان کا حل تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن دقتوں میں زیادہ اضافہ، مہاجرین کے سیلاب کی وجہ سے ہوا جتنی بڑی تعداد انسانوں کی برباد و بے خانماں ہو کر پاکستان آئی، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اور آج بھی کوئی ملک ایسا نہیں جہاں پر آبادی کا اتنا بڑا عنصر مہاجرین پر مشتمل ہو۔

ان غیر معمولی حالات نے ہمارے مختلف اداروں پر اثرات ڈالے خاص طور پر تعلیم کے اداروں پر۔ چنانچہ کراچی جہاں کی تمام تر تعلیم ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی بغیر تعلیمی درسگاہوں کے رہ گیا۔ ادھر آبادی میں دوگنا اضافہ ہوا۔ مدارس کی عمارتوں میں مہاجرین بس گئے، جن

میں مہاجرین نہ تھے وہاں سے استاد، کتابیں، لیبورٹریز کے مختلف آلات نہ تھے حکومت کے لئے ان حالات کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ دفاع کا مسئلہ الگ تھا۔ ہمارا ساٹھ فی صد بجٹ دفاع کی نذر ہو جاتا ہے اور اس سے مفر نہیں ہے اس لئے کہ آزادی نہ ہوئی تو تعلیم کس کام کی۔ نتیجۃً تعلیمی، معاشرتی، اور صحت کے اداروں کو خاطر خواہ روپیہ نہ مل سکا۔ پچھلے سال پہلی مرتبہ بجٹ کی ایسی حالت تھی کہ اس میں سے علاوہ ان اخراجات کے جو حسبِ معمول ہو رہے تھے۔ اٹھارہ کرور روپیہ ان مدوں کے لئے علٰحدہ کیا گیا جو مختلف صوبوں اور کراچی کے درمیان تقسیم ہوا۔

ادھر نظریاتی اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہماری تعلیم اسلامی اصولوں کا آئینہ ہو۔ پھر بھی جس پیمانے پر تعلیمی ترقی ہونی چاہیئے وہ نہیں ہو رہی۔ کیا باعتبارِ ماہیت اور کیا باعتبارِ کمیت، تعلیمی کانفرنسوں میں اس پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ ہمیں فرسودہ تعلیمی نظام کو بدلنا چاہیئے، جو نظام انگریز نے خاص اپنے مقاصد کے لئے جاری کیا تھا وہ نہ تو ایک اسلامی مملکت کی ضرورت کے لئے کافی ہو سکتا ہے اور نہ اس کے شایانِ شان ہے۔ چنانچہ تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے ایسا انقلاب، جو کیرکٹر کی تربیت کر سکے۔ حکومت نے اس سلسلے میں فیصلے کئے ہیں اب یہ کام تعلیمی اداروں، اساتذہ اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کا ہے کہ اسے عملی جامہ پہنائیں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ تعلیم کمیاب اور مہنگی ہے۔ اچھے مدرسے نہیں ہیں لوگوں نے اسکولوں کو منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہے چنانچہ اسکول کرائے پر اٹھائے جاتے ہیں اور بیچے جاتے ہیں۔

ہم لوگ جو یہاں جمع ہوتے ہیں، جامعہ ملیہ دہلی سے کسی نہ کسی طرح منسلک رہے ہیں، دل میں گدگدی سی ہوتی ہے کہ ہم بھی شاید، پاکستان کی کچھ خدمت اس سلسلے میں کر سکیں جامعہ نے اپنے لئے، مسلمانوں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا بعض تعلیمی تجربے کئے تھے۔ طلبہ اور اساتذہ کے لئے زندگی کا ایک خاص انداز پیدا کیا تھا۔ کیوں نہ ہم، اسی انداز پر، یہاں پاکستان میں تعلیمی خدمت انجام دیں۔ ۲۹؍ اکتوبر آج ہی کے دن جبکہ شیخ الہند کے ہاتھوں جامعہ ملیہ دہلی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، ہم بھی اپنے مدرسے کی بنا ڈالیں۔

اس سلسلے میں ہمارے پیشِ نظر جو فوری مقاصد ہیں وہ یہ ہیں ——— ایک اقامتی ابتدائی مدرسہ، جو سات آٹھ مہینے میں ہائی اسکول بن سکے اور جس کے ساتھ چند ذیلی ادارے مثلاً

کتب خانہ جس سے عام لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں، بالغوں کے لئے تعلیمی مرکز، تاکہ چراغ تلے اندھیرا کی مثل صادق نہ آئے بلکہ ہم جہاں پڑھیں اور پڑھائیں اس بستی میں جہالت کو دُور کرنے ہی کی تدبیر کریں۔ اور ایک بچوں کا رسالہ۔

دوسرے مقاصد مستقبل قریب سے تعلق رکھتے ہیں، ایک جامعہ کا قیام اور اپنے اسکولوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دینا اور اس طرح پاکستان کے تعلیمی نظام میں ضروری تبدیلیاں پیدا کرنا، خاص طور پر کیرکٹر کی تعمیر، اس لئے کہ آج ہم اپنی زندگی میں جدھر نظر اٹھاتے ہیں یہی چیز عنقا ہے۔

ابتدا ہم ایک چھوٹے سے ادارے سے کر رہے ہیں مگر خدا کے فضل سے حوصلہ بڑا رکھتے ہیں خدا کرے یہ چھوٹا سا ادارہ جس کی آج ہم بنا ڈال رہے ہیں پاکستان کے نظام تعلیم میں خوش آیند تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

آئی خبرِ ماتمِ محمود حسین
رنجیدہ ہے ہر محرمِ محمود حسین
اِس درد کا درماں ہے فقط صبرِ جمیل
ہے حکمِ الٰہی غمِ محمود حسین

۱۳۹۵ھ

(راغب مرادآبادی)

میجر آفتاب حسن

عالمِ خوش خصال

مئی کی ۱۴ تاریخ کو بعد نماز مغرب سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی ۱۶ویں سالانہ سائنس کانفرنس کا مشہور ان سیٹ لیکچر شروع ہوا مضمون تھا "پاکستان کا آثاری ورثہ" مقرر تھے ڈاکٹر فضل احمد خان اور صدارت تھی ڈاکٹر محمود حسین خان کی۔ لیکچر نہایت دلچسپ معلوماتی اور مصور تھا اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ تجربہ کار اور قابل ماہر اثریات تقریر کر رہے تھے۔ لیکن سائنٹفک سوسائٹی نے یہ مضمون بے وجہ نہیں چنا تھا۔ دیکھنے میں یہ آ رہا تھا کہ ان مٹی کے کھلونوں اور خاک کے تودوں کی بعض علاقوں میں پوجا شروع ہو گئی تھی اور مخالفینِ پاکستان ان ہی کو مقصدِ حیات اور تخلیقِ کائنات کا بدل قرار دے رہے تھے۔ اور اس تخریب کو وطن پرستی کا نام دیا جا رہا تھا ضرورت اس بات کی تھی کہ صاحبانِ علم و دانش کی مجلس، ان معاملات پر غور فرمائے اور ملک کو آنیوالے خطرات سے آگاہ کرے۔

ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب کی صدارتی تقریر نے یہی کام کیا۔ صاحب موصوف نے اپنے میٹھے اور سلجھے ہوئے دلکش انداز میں واضح طور پر بتایا کہ آثارِ قدیمہ کا مقام تاریخِ اقوام عالم میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔ دریائے سندھ کی تہذیب کسی خاص صوبے یا کسی خاص علاقے کی تہذیب نہیں ہے یہ دریا سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اس لئے وادیٔ سندھ کی تہذیب سارے پاکستان کی تہذیب ہے، اور اس کے آثار قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساری اقوام اس میں برابر کی شریک ہیں۔

یہ خوبصورت تقریر ڈاکٹر محمود حسین خان کی آخری تقریر سائنٹفک سوسائٹی پاکستان میں تھی اور غالباً آخری اردو تقریر تھی۔ نہیں معلوم تھا کہ یہ ملاقات بھی آخری ہے۔

ڈاکٹر صاحب سائنس دان نہیں تھے تاریخ اور سیاسات کے ماہر تھے لیکن سائنسدانوں

سے زیادہ سائنٹفک سوسائٹی کی ضروریات، اہمیت اور اس کے مقصد اور مدعا کو سمجھتے تھے یہ اس منزل سے آگے نکل گئے تھے جہاں علوم کو محدود دائرے میں رکھا اور دیکھا جاتا ہے یہ ان علوم کی آفاقی اور عمومی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جب یہ انجمن قائم ہوئی مرتے دم تک یہ اس کے سرگرم کارکن، مشیر اور سرپرست رہے۔ اور اس کی علمی اور عملی کاوشوں میں مسلسل حصہ لیتے رہے۔

چھٹی سالانہ سائنس کانفرنس میں آپ نے اس کے شعبۂ تعلیم کی صدارت قبول فرمائی۔ پھر ۱۹۷۲ء میں یعنی ۱۳ویں سالانہ سائنس کانفرنس کے موقعہ پر جب یہ کراچی یونیورسٹی میں منعقد ہوئی، آپ نے صدر مجلسِ استقبالیہ کی حیثیت سے خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔ علاوہ ازیں جہاں جہاں سوسائٹی کو ضرورت پڑی اس کے لئے سینہ سپر ہو گئے حال میں جب اربابِ حل وعقد میں سے ایک ناواقف، لیکن اہم شخصیت نے اس سوسائٹی پر کچھ شک وشبہ کا اظہار کرنا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے واضح طور پر کہہ دیا۔

"اس سوسائٹی کی بنیاد اس یونیورسٹی میں پڑی ہے، ہم سب لوگ اس میں شریک اور اس کے غرض وغایت اور طریقہ کار سے متفق ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ قومی زبان ذریعۂ تعلیم وتفہیم ہو۔ اور سائنسی علوم اس زبان کے ذریعہ پڑھیں اور مقبول ہوں۔"

صرف اتنا ہی نہیں آپ نے خبردار کیا کہ سائنٹفک سوسائٹی ایک مقامی یا صوبائی نہیں بلکہ قومی ادارہ ہے اس کے خلاف کوئی کارروائی بُرے نتائج پیدا کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ اس صاف گوئی کے بعد معترض کی کیا ہمت ہو سکتی ہے کہ اس مضمون کو آگے بڑھائے۔ جی حضوریوں کے اس دور میں بلاتردد اور بلاخوفِ نتائج صاف بیانی سے کام لینا ڈاکٹر صاحب ہی کا حصہ تھا۔

لائلپور کی کانفرنس میں جس کا ذکر ابھی اوپر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات ہوئی پہلی ملاقات آج ۲۷ سال پہلے کراچی ہی میں ہوئی تھی۔ وہ اس طرح کہ راقم الحروف ایک دوست کے ساتھ اس ہوسٹل میں گیا۔ جو حکومتِ پاکستان نے ارکان مجلس دستور پاکستان کے لئے صدر میں قائم کر رکھا تھا۔ اس وقت یاد نہیں ہے کہ کون کون صاحب

ہمارے ساتھ تھے اور کس سے ملنا تھا۔ لیکن ہم عمارت کے اندر داخل ہوئے تو ایک کمرے سے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آواز آرہی تھی، میری ان سے حیدرآباد میں راہ و رسم تھی۔ چند ہی دن ہوئے تھے کہ میں حیدرآباد دکن سے آیا تھا اور یہ آخری ہوائی جہاز تھا جو آزاد حیدرآباد سے نکلا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے حیدرآباد نہیں چھوڑا۔ پھر یہ کراچی کس طرح پہنچ گئے؟ بے تکلفی تو تھی ہی میں بیدھڑک کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ یہاں ڈاکٹر یوسف حسین خان تو نہیں تھے لیکن بولنے والے گورے چٹے ایک اور صاحب تھے جو چند احباب کے ساتھ بحث میں مشغول تھے آواز تو خیر ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تھی ہی۔ چہرے کی مشابہت بھی قریبی تعلق کا پتہ دے رہی تھی۔

میں نے کہا "حضرات میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آواز سن کر یہاں آیا ہوں"

ہم شبیہ صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "آیئے تشریف لایئے! میں ان کا چھوٹا بھائی محمود حسین ہوں — اور آپ؟"

میں نے اپنا تعارف کرایا کہ حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہاں شعبۂ تعلیمات سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب سے نیازمندی تھی۔ اور انہی کی وجہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب سے بھی تھوڑی سی واقفیت ہوگئی تھی۔

یہ میری پہلی ملاقات ڈاکٹر محمود حسین خان سے تھی۔ اس کے بعد ۲۲ سال ہم دونوں ذہنی اور عملی طور پر نہایت قریب رہے میری نیازمندی بڑھتی گئی، ان کی مہربانیوں اور قدردانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہم دونوں میں دو چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں، ایک پاکستان کی محبت، دوسرے اس کی قومی زبان "اردو" سے الفت، پاکستان کے نام لیوا تو بہت تھے لیکن اردو کے متعلق بولنے والے اور پاکستان کی شیرازہ بندی اور سالمیت میں اس کی اہمیت کو سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ پاکستان بننے سے پہلے تو اردو کی قسمیں کھائی جاتی تھیں

لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ بہتوں کے دلوں میں کھٹکنے لگی تھی ہم نے اس وقت بھی پیمانہ بنایا تھا اور آج بھی وہ پیمانہ موجود ہے کہ اردو کی مخالفت کرنے والا در اصل پاکستان کی مخالفت کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا بولنا، اب تو خیر آسان ہے، اس وقت مشکل تھا۔ ہاں پاکستان کے دوسرے ستون یعنی اردو کی مخالفت کی جاسکتی تھی۔ اسے اگر گرانے میں کامیابی ہو جائے تو پاکستان کی تباہی کا آغاز ہو سکتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ قائد اعظم کو ایک چھوٹے جہاز پر سفر کرنے کا خطرہ مول لیکر ڈھاکہ جانا پڑا۔ اور اردو کے لئے وہ تاریخی اعلان کرنا پڑا جو اب پاکستان کی کہانی کا ایک جز ہے۔ لیکن قائد اعظم اور ان کے جانشینوں میں وہی فرق تھا جو ہمالیہ کی چوٹی اور ایک پہاڑی ٹیلے میں ہوتا ہے گنتی کے چند لوگ ہی تھے جو پاکستان کی سلامتی کے اس لئے ضروری کو سمجھتے تھے اور اس سے بھی کم وہ لوگ تھے جو اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی قوت رکھتے تھے میرے نزدیک ڈاکٹر محمود حسین خاں ان چند لوگوں میں تھے جن میں یہ دونوں صفات موجود تھیں اور یہی سبب تھا کہ پاکستان کے دوسرے لوگوں کے برخلاف، جن کا مقصد زندگی اپنی حالت کو سنوارنے اور ترقی کی بلند سے بلند تر کرسیوں تک پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف دن کے ۲۴ گھنٹے قوم کی فلاح و بہبود کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

وہ ماہر تعلیم تھے، ہر ماہر تعلیم کی طرح تعلیم ہی کو ملک کی سب سے بڑی ضرورت اور پڑھے لکھے لوگوں کو سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تعلیم کا تعلق دل سے ہوتا ہے عارف رومی کے اس خیال سے متفق تھے کہ

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

تو علم دل تک پہنچے کس طرح؟ وہ طریقہ سابق یعنی اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم کو ایک لغو کوشش اور لادینی تعلیم کو ملک و ملت کے لئے سم قاتل تصور

کرتے تھے ۔۔۔ اس کا علاج ضروری تھا اور یہی خیال محرک ہوا جامعہ تعلیم ملی کے قیام کا اور یہی مرکز بن گیا ان کی ساری کوششوں کا ۔

کم لوگ اندازہ کرسکتے تھے کہ اس ادارے کو چلانے، سنبھالنے اور فلاح و بہبود کی منزل پر گامزن رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے کیا کیا نہیں کیا۔ کون کون سی ذلتیں برداشت نہیں کیں اور کن کن لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا چندوں اور عطیوں کے لئے کن کن لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے ۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض ادنیٰ قسم کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ انکی کوششوں کو نہیں سراہا بلکہ ان کو دھکا دینے کی کوشش بھی کی۔ مثال کے طور پر ہاؤسنگ سوسائٹی یونین کے دفتر کے سامنے کی بلند زمین کو انھوں نے جامعہ کے زنانہ کالج کے لئے پسند کیا کہ شہر میں ایک معیاری زنانہ کالج ہو۔ اس کے لئے پہلی قسط بھی دیدی تھی، جو ایک بہت کافی بڑی رقم تھی ۔ اس کے بعد آپ کے پاس اطلاع پہنچی کہ یہ زمین آپ سے واپس لے لی گئی ہے، ڈاکٹر صاحب، ماسٹر عبدالحی صاحب اور راقم الحروف کے ساتھ یونین کے دفتر پہنچے اور یہاں جاکر چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد کا تماشہ دیکھا۔ جگہ عمدہ تھی اس کے مانگنے والے، چاہنے والے بہت تھے۔ یونین کے ارباب نے خاموشی سے اس کا دوسروں سے سودا کیا اور نہایت اطمینان بلکہ بدتمیزی سے فرمانے لگے کہ چونکہ آپ نے وقت پر دوسری قسط نہیں دی، اس لئے ہم نے دوسروں کو دے دی ۔ لاکھ ہم نے سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے اور انداز ایسا کہ جیسے کسی معمولی آدمی سے بات کر رہے ہیں؛ میں نے کہا " ڈاکٹر صاحب اس آسانی سے اس شخص کو جانے نہ دیجئے یہ کوئی بڑی ہستی نہیں ہے اس سے اوپر بھی لوگ موجود ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک شکایت سے یہ عہدہ دار صاحب نکال دیئے جاتے لیکن انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس زمین ہی سے دست بردار ہو گئے ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ جامعہ ملیہ کا تعلق ماحول اور علمی معیار

تمام ملک میں سب سے بلند ہو۔ اس کا کتب خانہ اعلیٰ کتابوں کا مخزن ہو۔ اس
مقصد کے حصول کے لئے جس کاوش شدید اور مسلسل محنت کی ضرورت تھی ڈاکٹر صاحب
اس سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ذات کے ساتھ انھوں نے جامعہ کو ایسا چسپاں
کر لیا تھا کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں پر ختم ہوتے ہیں اور جامعہ کہاں سے
شروع ہوئی ہے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف ترجمہ کی چھپی ہوئی کتاب جب بھی راقم الحروف
نے پیش کی تو فرماتے تھے "بھائی مجھے یاد رکھا اور جامعہ کو بھول گئے وہاں بھی تو بھیجئے"
اس کے بعد ہم نے مستقل ہدایت دے دی تھی کہ کتاب شائع ہوتے ہی پہلے جامعہ ملیہ
کو بھیجی جائے پھر ڈاکٹر صاحب کو۔

جب جامعہ ملیہ کے اسکول والوں نے طلبہ کے لئے ستارہ نامی رسالہ نکالا۔ تو
میری طلبی ہوئی انہیں معلوم نہیں کس نے بتایا تھا کہ میں جامعہ ملیہ دہلی کے بچوں کے رسالے
پیام تعلیم میں لکھا کرتا تھا ملاقات ہوئی تو فرمایا "بھئی ستارہ کے لئے آپ کو لکھنا ہے
اب مشغولیت کے بہانے نہ کیجئے" لیکن بہانہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔

ان کا فرمانا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بہانہ کر سکے، یا انکی بات ٹال سکے۔ کبھی دیر
ہو جاتی تو جناب عبدالواحد سندھی صاحب تشریف لاتے ہوئے نظر آتے "میجر صاحب
رسالہ پریس میں جا رہا ہے صرف آپ کے مضمون کی دیر ہے"

کبھی خود ڈاکٹر صاحب فرماتے "بھئی آفتاب صاحب رسالہ رکا ہوا ہے"۔ حیرت ہوتی
تھی کہ اتنا مشغول اور اتنا بڑا آدمی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس طرح یاد رکھتا ہے

ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی کی خدمت میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی
اس کے بنانے اور اس کو وجود میں لانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا اس یونیورسٹی کے
اولین ایکٹ کو، جسے بہترین ایکٹ تصور کیا جاتا تھا ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر
محمود حسین نے مل کر بنایا تھا۔

ویسے تو وزیر تعلیم کی حیثیت سے آپ یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہی تھے جولائی
۱۹۵۳ سے باضابطہ طور پر یونیورسٹی کے اساتذہ کی جماعت میں شریک ہو گئے

اور پھر تمام رگ شرافت، نفاست، متانت، انتہا درجے کی نرم گفتاری اور فرشِ اخلاق کا مجسمہ بنے رہے۔

یہ نہیں کہ انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ لیکن شدید غصہ میں بھی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے:

مجھے بعض واقعات بطور خاص یاد ہیں۔ ایک تھا قصہ جمعہ کی تعطیل کا۔ جب یہ تجویز اکیڈمک کونسل میں پیش ہوئی تو مشن کالجوں والے اور انکی رفاقت میں بعض سرکاری کالجوں کے پرنسپلوں خصوصاً زنانہ کالج والوں نے شور مچایا کہ الاماں اور الحفیظ جمعہ کی تعطیل اس زمانے میں؟ حیرت کی بات۔

اسلام میں جمعہ کی تعطیل فرض کہاں ہے۔ کیوں اس پر اصرار کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب سنتے رہے، پھر اٹھے اور فرمایا: "کہ اس دورِ جدید میں اسلام اور اس کے نام اور اس کے شعائر کا نام لینا ذرا مشکل کام ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ کچھ دیوانے اب بھی موجود ہیں جو ان اقدار کو عزیز سمجھتے ہیں"۔

دوسری بار ان کے حقیقی غصے کا اظہار کراچی یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل میں اس وقت ہوا جب یونیورسٹی نے یہ طے کیا کہ ۱۹۶۲ء سے یونیورسٹی اُردو کو ذریعہ تعلیم بنائے گی۔ اور منزل بہ منزل سات سالوں میں تمام تدریس مکمل طور پر اردو میں ہوگی تو اس پر اکیڈمک کونسل کے ایک رکن کو اعتراض تھا لیکن جب تجویز ابتدا میں پیش ہوئی تو اس پر بحث مباحثہ ہوتا رہا تو رکن صاحب خاموشی سے سنتے رہے ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہ فرمایا لیکن یہ اسکیم جب یونیورسٹی سنڈیکیٹ سے گزر کر قانون بن گئی تو جناب تلمیذ سے جل گئے اور ایک اخباری بیان دے ڈالا۔ اس لئے دوسرے اجلاس میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا کسی رکن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جہاں بولنا چاہیئے، وہاں تو خاموش رہے لیکن فیصلہ ہو جائے تو اخبارات میں جا کر دل کے پھپھولے پھوڑے اور یونیورسٹی کے فیصلوں کے خلاف پروپیگنڈا کرے۔ زبردست بحث ہوئی، سخت کلامی کی نوبت آگئی اخبار میں بیان دینے والے حضرت موجود تھے لن ترانی شروع کی کہ مجھے اخبار میں جانے کا حق ہے اردو

والے مخلص نہیں ہیں - پھر آگے بڑھ کر ذاتیات پر اُتر آئے -

جناب ڈاکٹر صاحب کا پٹھانی غصہ بس دیکھنے کے لائق تھا - فرمایا "اس کو کیا کیا جائے کہ اپنی روایات کی قدر کرنے والے، اپنی زبان سے محبت رکھنے والے اب بھی موجود ہیں، یہ اپنی ثقافت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اس کو سلامت رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اس کی حفاظت کرنا جانتے ہیں - اس کے برخلاف یہ ملک ان لوگوں سے خالی نہیں ہے جو ان باتوں کو ضروری نہیں سمجھتے اس لئے خود کچھ کرنا تو کجا دوسروں کے کئے ہوئے پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں - تو ہمیں نہ انکی ضرورت ہے اور نہ پرواہ - ہم اپنا کام کرتے رہیں گے کسی کو بُرا لگے یا بھلا - - - "

کم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو اتنے غصے میں دیکھا تھا - مضمون نگار صاحب کو اس کی توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر صاحب جیسا مرنجاں مرنج انسان انکی اس طرح خبر لے گا

ڈاکٹر صاحب کی ذات جامعہ ملیہ اور کراچی یونیورسٹی دونوں سے وابستہ تھی لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان کے قلب کا مرکز اور محور جامعہ تھا اور کیوں نہ ہوتا - جامعہ کا وجود انکی شخصیت اور مقبولیت کا مرہونِ منت تھا - ملازمت سے جو وقت بھی بچتا - وہ جامعہ کے لئے مخصوص رکھتے تھے جامعہ کو اور جامعہ والوں کو جو کچھ ملا انکے سبب ملا، لیکن ڈاکٹر صاحب کو جامعہ ملیہ اور جامعہ ملیہ والوں نے کیا دیا اس پر دو رائیں ہو سکتی ہیں - میں ابتداً ہی سے جامعہ کے قریب رہا ہوں - میرے بچوں نے ابتدائی تعلیم اس ادارے میں پائی ہے - ڈاکٹر صاحب نے از راہِ کرم یونیورسٹی سے اصرار کر کے راقم کو یونیورسٹی کی طرف سے اس کی مجلس منتظمہ میں رکھوایا تھا - اس لئے میں جو کچھ کہوں گا وہ سنی سنائی بات نہیں ہوگی -

مجھے یہ کہنے میں باکل باک نہیں ہے کہ جامعہ ان کے لئے پھولوں کی سیج نہیں مسائل کا کانٹستارہ بن گئی تھی ـــــــــــ اور مسائل پیدا کرنے میں اکثر وہ لوگ تھے جن کی ڈاکٹر صاحب نے طرح طرح سے مدد کی تھی - انکو پڑھایا تھا چڑھایا تھا - اور بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے ادارے میں لائے تھے ـــــــــــ جس سکون کی انھیں تلاش تھی

وہ جامعہ ملیہ مہیا نہیں کر سکی۔

جس قومی اور ملی راستے پر وہ اس کو چلانا چاہتے تھے، اس میں رکاوٹ ڈالنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ ان کو اس کا احساس اور شدید احساس تھا لیکن ان کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوئی۔ وہ مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔

اپنے کام کو ہمیشہ انھوں نے اپنی صحت پر مقدم رکھا اور نہ خون کا دباؤ اس قدر بلند، قلب اس قدر شدید طور پر متاثر کہ دوسرا ہوتا تو گھر بیٹھ جاتا، لیکن ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ کوئی چیز نہیں تھی۔ انھوں نے بیماری کو کوئی اہمیت نہیں دی اپنی خوش مزاجی اور تفنن طبع سے اسے دبائے رکھا۔

امریکہ کے سفر میں انہوں نے ہسپتال میں اپنی مکمل جانچ کروائی۔ اور ڈاکٹر سے گفتگو کے دوران آپ نے دریافت کیا کہ

"میری بیماری خطرے سے کس قدر قریب ہے"

"بس بال برابر فرق ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں اس فرق کو قائم رکھنا چاہتا ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں"

ڈاکٹر یہ سن کر ہنسا، کہنے لگا "یہ بہت صحت مند انداز فکر ہے کہ آپ نے اسے قائم رکھا تو یہ فرق بہت دنوں تک قائم رہے گا۔ بلکہ بہتری کی طرف جائے گا۔

ایک دن صبح کی سیر اور ٹہلنے کی بات نکلی کہنے لگے "نہیں بھائی میں گھر سے زیادہ دور نہیں جاتا میں نہیں چاہتا کہ سڑک پر میرا جسم پڑا رہے اور کوئی پہچانے بھی نہیں نہیں صاحب گھر کے قریب ہی ٹھیک ہے۔ ——"

ڈاکٹر صاحب نہ کم ہنساتے زیادہ تھے کوئی فقرہ چست کر کے بالکل خاموش اور سنجیدہ بن جاتے تھے پھر جب لوگ ان کے جملے کو سمجھ کر ہنسنا شروع کر دیتے تھے تو یہ اس ہنسی میں شریک ہوتے تھے پہلے نہیں۔

ایک دن اکیڈمک کونسل میں کوئی مسئلہ چھڑا اس سلسلے میں انتظامیہ کے ایک عہدہ دار جو طویل بیانی اور ژولیدہ زبانی کے لئے مشہور تھے دیر تک تقریر کرتے رہے جب

ختم کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے نہایت متانت سے حاضرین سے کہا "اگر آپ لوگ اس تقریر سے کچھ سمجھ سکے ہوں تو رائے دیجئے" کونسل میں ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب اس طرح متین اور سنجیدہ بنے بیٹھے رہے۔ عجب طرح کے خوش خصال و خوش مقال تھے۔

دوسری بات جس کی طرف جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی وہ یہ تھی کہ جابرانہ اور مطلق العنان حکومتوں کی بجائے مسلمان ملکوں میں ایسی حکومتیں قائم ہوں جن میں انفرادی آزادی ہو اور حکمرانوں کو بے حد و حساب طاقت حاصل نہ ہو بلکہ وہ قوم کے سامنے جوابدہ ہوں۔ اس بات کو وہ کس قدر اہمیت دیتے تھے کہ استبداد ختم ہو۔ ان کے ایک ایسے خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے وفات سے کچھ ہی قبل اپنی نظربندی کے زمانہ میں قسطنطنیہ سے اپنے ایک ایرانی دوست کو لکھا تھا۔ اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس خط کو ایرانیوں تک پہنچا دیں۔ کہتے ہیں۔ "تم نے کہ ایران کی بیداری کے لیے کمر ہمت کس لی تھی۔ قید و بند اور غارت گری سے نہ ڈرنا" ایرانی جہالت سے خستہ نہ ہونا۔ سلاطین کی حرکات مذبوحی سے نہ گھبرانا" نہایت سرعت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش اور نہایت مستعدی کے ساتھ کوشش کیے جاؤ فطرت تمہارے ساتھ ہے اور خالق فطرت تمہارا مددگار تجدد کا سیل تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف رواں ہے۔ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے تمہیں چاہیئے کہ مطلق العنان حکومت کی بنیادی خرابیوں کی اصلاح کرو۔ (محمود حسین)

ڈاکٹر اسماعیل سعد

حیات افروز لمحے

ڈاکٹر صاحب ہم سے چھن گئے۔ موت اپنی آپ دلیل ہے۔ ایسی نہ ٹلنے والی حقیقت جس کے سامنے انسان کی تمام عملی سرگرمیاں، ساری کی ساری ذہنی قوتیں، تمام جذباتی سرمایہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہاں وقتی طور پر غم کو انگیز نے کے وسیلے ممکن ہیں۔ ان میں ایک وسیلہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کو خود فریبی میں مبتلا کرلے۔ میں نے بھی سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا، لیکن جانتے بوجھتے یہ یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی ختم ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں جی یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے کو بہت دیر اسی دھوکے میں مبتلا رکھوں، ایسا کچھ تو اس لئے کہ پورے طور پر اس سانحہ کو برداشت کرنے کے لئے دل میں ہمت کی کمی ہے لیکن اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب میں زندگی کی جو ہماہمی اور تازگی تھی اس نے موت کو بے اعتبار بنادیا تھا۔ ان سے زندگی کی ساکھ تھی اور زندگی کا اعتبار قائم تھا۔ میں نے اُن کو کبھی پژمردہ نہیں دیکھا، کبھی مایوس نہیں پایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ زندگی کو اپنی تمام تر رعنائی اور دلکشی کے ساتھ اپنے جلو میں سمیٹے رہتے تھے۔ طبیعت کی بشاشت ہر کسی کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور ان سے ملنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی شگفتوں میں یک گونہ کمی آگئی ہے۔ جب زندگی کی تڑپ اور روانی کا یہ عالم ہو تو یقین کیسے آئے، ذہن لاکھ سمجھائے لیکن دل کیسے ماننے پر تیار ہو کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔ دل کو راہ پر لانے کے لئے وقت درکار ہوگا۔ چوٹ ابھی تازہ ہے، وقت گزرے گا تو درد کی شدت میں اضافہ ہوگا —— کسک بڑھتی جائے گی ؎

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

میرا جی تو نہیں چاہتا کہ اس وقت ان کو یاد کرتے ہوئے، ان کی باتیں کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو بہت زیادہ شامل کروں اور جابجا اپنی ذات کے حوالے دوں لیکن اس کا کیا کیا جائے

کہ ان کی محبت اور انداز کچھ ایسا تھا کہ کوئی ایک مرتبہ بھی ان سے مل لے تو اس کو یہی احساس ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کی ساری توجہ اسی پر ہے اور ان کا اس سے ایک گہرا نجی اور ذاتی تعلق ہے، جس سے ایک مرتبہ نسبت ہو جاتی تو پھر اپنے تعلق کو سو سو انداز سے نبھاتے تھے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا خیال رکھتے۔ سن چھپن ستاون کی بات ہے میں امریکہ کے ایک گمنام گوشہ میں طالب علمانہ زندگی گزار رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو امریکہ آنے کا اتفاق ہوا تو خاص طور سے اپنا پروگرام اس طرح بنوایا کہ میرا شہر اس میں شامل ہو۔ ایرپورٹ پر اُترے۔ ان کی گرمجوشی بھلائے نہیں بھولتی۔ میں نے سامان اٹھانے میں کچھ مدد کرنے کی کوشش کی تو مسکرائے اور جھپٹ کر میرے ہاتھ سے بھاری صندوق لے لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا دوسرا ہلکا سامان میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے عمرانیات کے اپنے ایک امریکی پروفیسر سے یہ طے کیا تھا کہ وہ ان کو شہر دکھائیں گے۔ دوسرے دن وہ اپنی موٹر لے کر ہوٹل آئے۔ تعارف ہوا۔ روانگی سے پہلے انھوں نے زبانی اور کچھ تحریری شہر کے نقشہ اور تفصیلات کو سمجھانے کی کوشش کی، ڈاکٹر صاحب سنتے رہے اور ہاں میں ہاں ملاتے رہے لیکن جوں ہی انھیں موقع ملا مجھے الگ لے گئے اور کہنے لگے اسماعیل تم نے دیکھا بڑے میاں کو۔ میرا اور تمہارا دونوں کا یہی حشر ہوگا۔ اُستاد کہیں بھی، کسی حال میں بھی ہو بغیر پڑھائے نہیں رہ سکتا۔

دوسرے دن ہوٹل پر اپنے ساتھ کھانا کھلا رہے تھے۔ میرے حصہ میں اتفاق سے گوشت کا سخت ٹکڑا آگیا۔ مجھے جب اُنھوں نے اس پر محنت کرتے دیکھا تو فوراً پلیٹ میرے سامنے سے لے لی اور یہ کہتے ہوئے کہ لاؤ میں اپنی چھری سے کاٹ کر دیکھوں گوشت خود کاٹ کر پلیٹ میرے سامنے بڑھادی۔ کھلانے پلانے کے بارے میں تو ان کی شفقت اتنی بڑھی ہوئی رہتی تھی کہ کبھی کبھی جبر کا احساس ہونے لگتا۔

۱۹۶۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب ڈھاکہ میں وائس چانسلر تھے تو ایک مرتبہ یہاں سے ہم کچھ لوگ مشرقی پاکستان گئے جن میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر انوار خلیل بھی شامل تھے۔ انوار خلیل کھانے پینے کے شوقین لوگوں میں ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کے سامنے ان کی ہمت بھی جواب دے چکی تھی اور ہم دونوں کا احساس یہی تھا کہ سخت آزمائش سے گذر

رہے ہیں۔ ابھی چند مہینوں کی بات ہے کہ یونیورسٹی سے ایک دن مجھے ٹیلیفون کیا اور کہنے لگے انگلش
مشہور فلم DR. ZHIVAGO آئی ہوئی ہے تم نے دیکھی تو نہیں۔ میں نے کہا نہیں آپ
کہئے تو ٹکٹ منگواؤں۔ کہنے لگے نہیں ٹکٹوں کا بندوبست میں نے کر لیا ہے، دو اور دوستوں
کے نام لئے اور کہا کہ تم لوگ دوسرے دن مجھے گھر سے لے لینا۔ ڈاکٹر صاحب سینما بہت کم دیکھتے
تھے لیکن ہمارے اصرار پر راضی ہو جاتے تھے۔ دوسرے دن فلم دیکھنے گئے۔ فلم کے بعد بہ اصرار
بندو خاں کے یہاں لے گئے اور پراٹھے اور کباب کھلوائے۔ پھر آخر میں اس بات پر بھی مصر
کہ حلوہ بھی آئے گا۔ ———————— میں نے کہا ڈاکٹر صاحب حلوہ
بالکل نہیں تو مجھ سے تقریباً خفا ہو گئے۔ اور پھر یہ خیال محض کھلانے پلانے تک نہ تھا۔ ان سے
کچھ بھی کہا جاتا تو وہ بس بھر اسے ضرور کرتے۔ ایک مرتبہ جاپان جا رہے تھے۔ میرے پاس
ایک چھوٹا سفری چیک پڑا ہوا تھا۔ میں نے جاتے وقت انھیں دے دیا کہ اسے کسی بینک سے
بھنوا لیجئے گا۔ کہنے لگے کہ کیا لاؤں۔ میں نے کہا میری بچی کے لئے ایک سوئیٹر لیتے آئیے گا۔ واپسی
پر ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ تمھارا چیک رکھا ہی رہ گیا۔ بینک
جانے کا وقت ہی نہ ملا۔ ہاں سوئیٹر میں لیتا آیا ہوں، دیکھو تمہیں پسند آتا ہے یا نہیں۔

اور پھر یہ خصوصیت صرف مجھی سے نہ تھی۔ وہ ہر کسی کا خیال رکھتے تھے۔ کوئی بات یا مسئلہ
ان کے سامنے رکھا جاتا تو جس کی بات ہوتی خود اس سے زیادہ مسئلہ کی تفصیلات پر ان کی نظر ہوتی۔
ہاں اگر کوئی چیز قاعدہ یا ضابطہ کے خلاف ہوتی تو وہ اس کے لئے مجبوری کا اظہار کر دیتے
لیکن اگر اس قسم کی کوئی دشواری نہ ہو تو کسی بات کے لئے نہیں کہنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ کوئی
بھی بلائے کہیں بھی بلائے وہ ضرور جاتے اکثر شوق سے جاتے لیکن اگر اپنے اوپر جبر بھی کرنا
ہو تب بھی جاتے۔ پچھلے دنوں بخار کی حالت میں بھی اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ ایک
دن کچھ کہہ رہے تھے کہ شام کو کہیں جانا ہے میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آجکل تو آرام کر لیجیئے۔
کہنے لگے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہاں نہ جاؤں۔ خود مجھ سے پوچھ کر تو انھوں نے اپنی بیٹی کی
شادی کی تاریخ رکھی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ ضرور جاتے
کسی کی فرمائش اور تقاضہ کو ٹالنا ان کی طبیعت میں تھا ہی نہیں۔

طبیعت بے حد سادہ تھی۔ شفاف پانی کی طرح جس میں ہر چیز صاف صاف نظر آتی ہے۔ خفا ہوتے اور اکثر ایک جلالی شان کے ساتھ لیکن غصہ کی چمک بجلی کی طرح لہرا کر غائب ہو جاتی کبھی دل میں کوئی بات رکھتے نہیں تھے۔ مزاج کی سادگی ان کی ساری زندگی پر غالب تھی۔ رہن سہن، پوشاک، بات چیت، برتاؤ سب میں انتہائی سادگی اور ویسے اُن کی بڑائی پر سادگی جتنا سجتی تھی میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ بڑی دردمندی تھی ان کے دل میں، اپنے کرب کو چھپا ضرور لیتے تھے لیکن واقعات وکوائف کا گہرا اثر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ سیرت کے ایک جلسہ میں انھیں میں نے دیکھا۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ مسلسل روتے رہے۔ لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا کہ وہ دلی تاثرات کو آنکھوں سے چھلکنے کی اجازت دیتے۔ بس جو کچھ بھی ہو اپنے دل پر قسم کرتے رہتے۔ ہم سب کے لئے تو ان کی ذات بڑا سہارا تھی۔ گھنے درخت کی طرح جس کے نیچے بس چھاؤں ہی چھاؤں ہوتی ہے۔ ہم اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل ان کے سامنے رکھتے تو وہ محض مشورہ ہی نہیں دیتے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ ادھر دو ایک بار میں نے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اُستادی کے پیشہ سے دست بردار ہو جاؤں۔ لیکن ہر مرتبہ انھوں نے مجھے سختی سے ٹوکا اور یہی کہا کہ میں تمھاری طبیعت کو سمجھتا ہوں۔ اگر اس قسم کا کوئی فیصلہ کرو گے تو تم اپنے مزاج اور طبیعت پر ظلم کرو گے۔ اور ان کی اپنائیت اور انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کی بات کے آگے نہیں کہنا ممکن ہی نہ تھا۔ ہم سب یہاں جامعہ ملیہ میں اپنے کو ان سے بہت قریب محسوس کرتے تھے اور ان کی صحبت میں ماحول بڑا بے تکلف ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم سب محبت اور احترام کا ایک فصل محسوس کرتے تھے۔ یہی وہ فصل تھا جس کی بنیاد پر ان کی کسی بات کو ٹالنا ممکن نہ تھا اور یہ محض ان لوگوں کی بات نہ تھی میں نے دوسرے لوگوں کو بھی کبھی ان کی بات کا انکار کرتے نہ دیکھا

رواداری، خلوص، سادگی اور طبعی نیک نفسی کے باوجود ڈاکٹر صاحب اعلیٰ درجے کی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنی ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ انتظامی ذمہ داریوں کو جس خوبصورتی سے نباہتے تھے وہ معمولی بات نہ تھی۔ انتظامی ذمہ داریوں کی ماہیت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ہر کسی کو خوش نہیں رکھا جا سکتا لیکن ان ذمہ داریوں کے باوجود ان کی ہر دل عزیزی میں کبھی کمی نہیں آئی۔ طالب علم، اُستاد، ساتھی سب ان کو بے حد

عزیز اور محترم رکھتے تھے۔ عملی طور پر وہ جو کام بھی اپنے ذمہ لیتے تھے اسے بڑے مؤثر طریقے سے انجام دیتے تھے۔

ان کی انتظامی صلاحیتوں کا ایک پہلو تو وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں تھیں جو خدا نے انھیں ارزانی کی تھیں۔ اس کے باوجود کہ انھیں علمی کاموں خصوصاً یکسوئی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی مہلت کم نصیب تھی لیکن ان کی افتادِ مزاج بنیادی طور پر عالمانہ تھی۔ وہ اکثر تعلیمی معاملات میں خصوصاً تعلیم کے نظری پہلوؤں کے سلسلہ میں مجھ سے بات چیت کرتے۔ اور بسا اوقات انداز ایسا ہوتا کہ جیسے میری رائے کو اہم سمجھتے ہوں لیکن ہر بات چیت کے بعد میں خود ان کی علمی دلچسپی، تبحر اور وسعت کا اور زیادہ قائل ہو جاتا۔ فکر کا انداز بہت سلجھا ہوا ہوتا اور ذہن تفصیلات کی طرف بہت مائل رہتا۔ حافظہ غضب کا تھا اور مسئلہ علمی ہو یا عملی ذہن بہت جلد پوری طرح اسے گرفت میں لے لیتا۔

ان کا دوسرا وصف لوگوں کو سمجھنے اور ان سے کام لینے کا تھا۔ مختلف آدمیوں کو سمجھنے اور برتنے میں ان کا تجربہ بہت وسیع تھا اور اس بات کی خصوصی ذکاوت تھی کہ کسی کے اندر کیا خوبی ہے اور وہ کس کام کا اہل ہے۔ وہ ہر ایک سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیتے تھے اور دوسروں کو ان کا کام کرتے خوشی محسوس ہوتی تھی۔

ایک اور خوبی قوتِ فیصلہ تھی۔ ہر مسئلہ اور صورتِ حال کے بارے میں ان کی اپنی رائے ہوتی تھی اور کسی قسم کا فیصلہ کرنا ہو تو وہ اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ کبھی کبھی لوگوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد اور فوری فیصلہ کی ضرورت کی بنا پر لغزش کا امکان بھی رہتا لیکن وہ فیصلہ کی ذمہ داری سے دامن نہ چھڑاتے اور جب ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتے اور خصوصاً ایسا فیصلہ جس پر خود انھیں یقین ہو تو پھر انھیں بدلنا ممکن نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اور میرے ایک عزیز دوست اور محسن نے جنھیں وہ خود بھی بہت عزیز رکھتے تھے پوری کوشش کی کہ وہ اپنے ایک فیصلہ پر نظرِ ثانی کریں لیکن انہوں نے ہماری بات بالکل نہ مانی۔ ان کو سیرت کی وہ یکسوئی حاصل تھی جو ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد شخصیت کو حالات کے تھپیڑوں سے بالکل محفوظ و مامون کر دیتی ہے۔

لیکن ان کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف عمل کی وہ بے پناہ قوت تھی جو اپنے کو کسی بڑے مقصد کے تابع کر لیتی ہے اور تن من دھن سے اس کی آب یاری میں لگ جاتی ہے۔ کام ان کے لئے عبادت تھا۔ وہ دوسروں سے کام لیتے تھے اور خود بھی کام کرتے تھے۔ ذمہ داری، ہاتھ میں لینے سے پہلے ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے لیکن جب ایک مرتبہ کوئی کام ہاتھ میں لے لیتے تو پھر اسے پورے انہماک اور سلیقہ سے کرتے۔ خود جامعہ کراچی کے سلسلہ میں یہی ہوا۔ شیخ الجامعہ بننے سے پہلے ان میں ہچکچاہٹ تھی اور اس کا اظہار انہوں نے خود مجھ سے بھی کیا تھا لیکن جب ایک مرتبہ انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا تو پھر تندہی سے وہ اس میں لگ گئے۔ ابھی دو ایک دن ہوئے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کہہ رہے تھے کہ کام کی مشقیں سہنے کا ڈاکٹر صاحب کا انداز ایسا ہی تھا۔ جیسے کوئی اپنی صحت کو روند رہا ہو۔ اور یہ بات حرف بحرف صحیح ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی صحت کا خیال نہیں کیا۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد کچھ دن کے لئے رفتار دھیمی پڑی تھی لیکن بس کچھ دن کے لئے۔ کھانے پینے کی احتیاط تھی کسی نہ کسی حد تک قائم رہی لیکن کام کے سلسلے میں ان کو اپنی طبیعت پر بالکل اختیار نہ تھا، اور آخر وقت تک اُن کی مشقت نوجوانوں کے لئے بھی باعثِ رشک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اپنی مصروفیات میں توجہ کو بٹانے اور کسی حد تک تفریح کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ کھیل بڑا اچھا اور ماہرانہ تھا۔ ہم کچھ لوگ ان کے برج کے ساتھی تھے اور زیادہ تر اس خیال سے پابندی برتنے کی کوشش کرتے کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے تفریح کا تھوڑا بہت سامان بہم رہے۔ لیکن ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنے کسی کام پر اپنے شوق کو فوقیت دی ہو۔ پہلے وہ کام کرتے تھے اور پھر کھیل کی طرف توجہ دیتے۔ بعض اوقات اگر کچھ کام ضروری آجاتا تو بیچ سے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو ایسا نہیں دیکھا جسے کھیل میں اتنا انہماک ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنے اُوپر اتنا قابو ہو کہ وہ اسے اپنے معمولات میں حارج نہ ہونے دے۔

لیکن ایک بڑا مقصد اور ایک بڑا کام جس سے انھیں سب سے زیادہ دلچسپی اور شفقت تھا وہ تھا ملیر کا یہ ادارہ جسے ہم سب جامعہ ملیہ کہتے ہیں۔ وہ خود پرانی جامعہ ملیہ کے طالب علم تھے اور علی گڑھ اور دہلی دونوں میں اس ادارے سے وابستہ رہے تھے۔ یہ وابستگی محض اس وجہ سے نہ تھی

کہ اس کی آبیاری ان کے چہیتے بھائی کی اَنتھک کوششوں کی رہینِ منت تھی بلکہ اس لئے بھی کہ تحریک
خلافت نے خدمتِ قومی کا جو ایک مخصوص مزاج مسلمانوں میں پیدا کیا تھا وہ پوری طرح اس کے
آئینہ دار تھے۔ مذہب کی سچی لگن اور دردمندی بھی ان کی متاعِ حیات تھے اور وہ خلوص دل سے
یہ یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے اس نئے ملک کی صحیح اور سچی خدمت صرف تعلیم سے وابستہ ہے۔
پاکستان کی تشکیل کے اوّلین دنوں میں انہیں سیاسی خدمت کا موقع بھی ملا تھا، ان میں سیاسی
توازن اور بصیرت بہت تھی اور سیاست میں بھی نیک نامی ان کی رفیق رہی لیکن ان کے مزاج
کی اُفتاد سیاست کے اُتار چڑھاؤ سے پوری طرح مناسبت نہ رکھتی تھی۔ ان کو اگر لگن تھی تو تعلیم
کی۔ ۱۹۵۳ء میں بے سروسامانی لیکن عزم کے ساتھ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ وسائل کی فراخی
تو آخر زمانہ تک نہ حاصل ہوئی لیکن کام تیزی سے پھیلا۔ استادِ محترم عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی رفاقت
نے ڈاکٹر صاحب کی اُمنگوں کو استقامت دی۔ میرا خیال ہے کہ کراچی میں شاید ہی کوئی ایسا دوسرا تعلیمی
ادارہ موجود وسائل کی تنگی کے باوجود اتنا پھیل سکا ہو۔ آج ملیر اور نواحی علاقہ میں اگر کچھ تعلیم یافتہ
نوجوان لڑکے یا لڑکیاں نظر آتے ہیں تو اس میں جامعہ ملیہ کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ ہر سال
توسیع کا کوئی نہ کوئی منصوبہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں رہتا۔ بعض اوقات تو خیال گزرنے لگتا کہ کام
کے پھیلاؤ ہی کی طرف ان کی توجہ رہتی ہے۔ کام کو سمیٹ کر کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتے لیکن
شاید یہ اس لئے تھا کہ ان کو یقین رہتا تھا کہ اچھا کام اگر ایک مرتبہ شروع ہو جائے اور کام
کرنے والے اچھے ہوں تو پھر کام چلتا رہتا ہے۔ خود بخود اسباب نکلتے رہتے ہیں اور وسائل
پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بس عزم اور لگے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات ان میں پورے
طور پر موجود تھی۔ وہ کام میں لگے رہنا جانتے تھے۔ جامعہ سے ان کا لگاؤ شدت اور مدت دونوں
کا حاصلِ ضرب تھا۔ اپنی محنت اور خلوص سے انھوں نے مالی کی طرح اس پودے کو سیراب کیا
اور روزانہ نگہداشت کی۔ یہاں کے لوگوں کو خاندان کی طرح پالا پوسا اور ہم سب پر یہی اثر
ڈالنے کی کوشش کی کہ یہ ادارہ نہیں گھر ہے کام نہیں زندگی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب میں تعلیم ختم کر
کے کراچی آیا تو مجھ سے صرف یہ کہا کہ تم کو 'جامعہ' میں لگا لیا ہے۔ تم بھائیوں میں سے ایک کو ہمارے
ساتھ کام کرنا ہے اور اب یکسوئی سے اس کام میں لگ جاؤ اور اس طرح میں بھی ان کے بسائے

ہوئے خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ آخر وقت تک وہ یہاں آتے رہے ان کے لگاؤ اور انہماک میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ یہ ضرور ہے کہ حالات کی تبدیلی کے بعد بعض باتوں اور کچھ اندرونی کشاکش کی وجہ سے ان کے دل کو ملال بھی پہنچا لیکن اپنی بددلی کا اظہار وہ نہیں کرتے تھے۔ گھر بنانے والے پر گھر کی ذرا بھی بربادی بہت شاق گزرتی ہے۔ وہ خوب سمجھتے تھے ؎

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

لیکن آخر وقت تک وہ مایوس نہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا یہی تھی کہ یہ ادارہ پھولے پھلے۔ وہ چاہتے تھے کہ اب بھی بس بھر وہ اس ادارے کی خدمت کریں اور مجلس تعلیم ملی کے تحت کچھ نئے تعلیمی منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ چاہے وہ کہیں بھی ہوں اُن کا دل یہاں رہتا تھا۔ ان کو جامعہ آکر ہی سکون ملتا تھا۔ ایک دو مرتبہ میرے سامنے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ جامعہ میں وہ اپنی زندگی کے آخری دن گذارنا چاہتے تھے اور اب یہی ان کی آخری آرامگاہ ہے۔ کاش ہم جو ان کے ساتھی تھے۔ ہم جو ان کی محبت کی گرمی کو اب بھی اپنے چاروں طرف محسوس کرتے ہیں ہم ان کے کام کو جاری رکھ سکیں اور اس بستی کو ان کی شخصیت کا سزاوار بنا سکیں۔

مذہب کی طرف میری تساہل پسندی سے بخوبی واقف تھے۔ ابھی کچھ دن کی بات ہے کسی کی دعائے مغفرت کا موقعہ تھا۔ کہنے لگے اسماعیل دعائے مغفرت تو تم کو کیوں یاد ہوگی بس یہ کیا کرو کہ سورۂ فاتحہ اور قل ہو اللہ تین مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلد مجھے یہ سبق دہرانا ہوگا۔ جی بہت کچھ کہنے کو چاہتا ہے۔ پتہ نہیں کتنی باتیں یاد آتی ہیں لیکن بس کرتا ہوں۔

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں نگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ڈاکٹر انوار خلیل

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جس جامعہ ملیہ کی تعمیر اور توسیع انہوں نے اپنے خون جگر سے کی تھی اور جس کے لیے انہوں نے جیون برت رکھا تھا، آج اُسی کی حدود میں ڈاکٹر صاحب کی میت تدفین کے لیے لائی جارہی ہے۔ میت جس وقت جامعہ کے حدود میں داخل ہوئی مجمع فرطِ غم سے بے قابو ہوا جارہا تھا علم کے ہزاروں پروانے مشعلِ علم کے جنازے کو اپنے سروں پر سجائے چل رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر جو بات واضح ہو کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ جتنے لوگ تھے، ان میں ہر طبقے اور ہر مکتب خیال کے لوگ تھے، سب یکساں مغموم اور یکساں اُداس۔ اُن میں ایک بھی نہ تھا جسے دیکھ کر یہ گمان ہو کہ وہ خانہ پری کے لیے آگیا ہے۔ حکمرانی وہ نہیں جو پولیس، فوج اور اسلحہ کے زور پر کی جائے بلکہ سچی حکمرانی وہ ہے جو مردِ قلندر بے منت غیر اپنی ذاتی خوبیوں اور خدمات کی بدولت بے شمار لوگوں کے دلوں پر کرتا ہے ؎

جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ

موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تادمِ آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ سنا ہے ڈاکٹر صاحب جامعہ کراچی میں اپنے دفتر میں بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا اور اس کے چار روز بعد ہی علم کا مینار نور ممتاز ماہر تعلیم اور تہذیب و شرافت کا حسین و جمیل پیکر عظیم شخصیت کا مالک ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ یہ سچ ہے کہ انسان موت کو مسخر نہ کر سکا لیکن موت بھی انسان کے کارناموں کو نابود نہ کر سکی اور شاید قیامت تک موت یہ کام کر بھی نہ سکے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصی حیثیت اُن کی منصبی حیثیت اور کارناموں سے کہیں زیادہ بلند

اور محترم تھی ۔ اُن کے زمانے میں علمی اور تعلیمی اعتبار سے یونیورسٹی نے بڑی ترقی کی ۔ مختلف شعبوں میں اصلاح و توسیع ہوئی ۔ اس کے علاوہ اہم بات یہ تھی کہ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ یونیورسٹی کی نیّا ایک ایسے ناخدا کے سپرد ہے جو تہذیبِ نفس، وسعتِ نظر اور رفعتِ خیال کا پیکر ہے، تعلیمی معاملات کو تعلیمی نظر سے دیکھتا ہے اور اہلِ علم کے ساتھ اہلِ علم کا سا برتاؤ کرتا ہے ۔ انہوں نے یونیورسٹی میں اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی بلکہ حتی المقدور یونیورسٹی کو ایک علمی ادارے کی شان کے ساتھ اور انصاف سے چلانے کی کوشش کی اور اپنے دشوار فرائض کو انجام دیتے رہے اور اس دشوار گذار راستے میں انہوں نے اپنی راحت و آسائش، صحت اور یہاں تک کہ اپنی جان تک قربان کر دی ۔

اس پُرآشوب
دور میں جبکہ نوجوان ہر روایت سے باغی اور ہر قدر سے نبرد آزما ہے اور ہر شخصیت کے اثر سے آزاد ہے، ڈاکٹر طاصاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور بے پناہ خلوص و محبت اس کو منظم کرنے میں نہ صرف کوشاں رہی بلکہ کامیاب بھی ۔

اچھے مقصد کی حمایت میں ڈاکٹر صاحب بڑے سے بڑے آدمی کے جبر و قہر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ اُن کے خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کا ہر شخص قائل تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیک نیتی اور بے نفسی سے کام کرتا ہے اور برسوں بغیر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے، اُسے کرتا رہتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کا اثر اور نقش قائم ہو کر رہتا ہے ۔ ممکن ہے کچھ عرصے تک لوگ اختلافِ رائے کی وجہ سے مخالفت کریں، لیکن ان میں سے اکثریت دیر یا سویر، صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور خلوص میں جو بے پناہ قوت اور کشش ہے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے ۔ تعلیم کی شمع روشن رکھنے اور شرافت کا بول بالا کرنے میں انہوں نے جو مسلسل اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں اُن میں اُن کا ثانی بہت مدت تک شاید پیدا نہ ہو ۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سایہ سے زیادہ دھوپ میں اپنی بہار دکھاتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب ایک ایسا ہی پیارا پھول تھے جسے موت کے ظالم ہاتھوں نے توڑ لیا ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم میں ذہانت، زندہ دلی، محنت و مستعدی کا عالم آخر دم تک قائم رہا۔ توانائی کا معلوم نہیں کیسا لازوال خزانہ ان میں ودیعت تھا۔ تھکنا، مایوس ہونا، ہار ماننا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے۔ فکر و نظر میں عزم و عمل میں ان سے ملکر انسان نہ صرف ان کی لیاقت و صلاحیت سے متاثر ہوتا بلکہ ان کی سراپا دلکش شخصیت سے مسحور ہو جاتا۔ ان کی ایک ہی ملاقات کا نقش اسقدر گہرا ہوتا کہ اس کا بھلانا ناممکن ہوتا۔ اس سراپا باغ و بہار، شاداب شخصیت کی کس کس بات کو کس کس ادا کو دہرایا جائے۔ ان کی گفتگو، حلقۂ درس ہو یا صحبتِ احباب سننے والوں کے لیے ایک نعمت ہوتی۔ ان کی شخصیت کا خلوص اور دلکشی، ان کی بے مثل ظرافت اور جوش و ولولہ جس میں آخری عمر تک شباب کی تازگی قائم رہی۔ وہ نوجوانوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ان کی ذات ہر محفل میں جانِ محفل ہوتی تھی۔

جس محفل میں پہنچ جاتے نسیم بہار کی طرح دلوں کو شگفتہ و سرشار کر دیتے۔ ان کے پاس لطیفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ جس کو وہ نہایت سلیقے کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ لطیفہ سنانے کا مخصوص انداز لطف کو دوبالا کر دیتا تھا۔ قہقہوں کی بے ساختگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ان کی زندگی بناوٹ سے کتنی پاک تھی اور اسی وجہ سے اُن کے چہرہ پر ایک چمک ایک نور رہتا تھا جو دل اور ضمیر کی صفائی سے حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم پابندی سے ہر اتوار کو جامعہ ملیہ تشریف لاتے۔ فرمایا کرتے تھے "نوکری میں جامعہ کراچی میں کرتا ہوں لیکن جامعہ ملیہ سے میرا تعلق قلبی ہے" اتوار کا دن ہمارے لیئے عید کا دن ہوتا۔ ہم سب ان کی آمد کے منتظر رہتے۔ اس دن ہمیں ان کی شگفتہ اور دلچسپ صحبت میسر آتی جو ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ ان کی ذات شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ جب کوئی صاحب ذوق یا اہل علم ان کی صحبت سے اٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کی فکر و نظر میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شخصیت کا فیض عام تھا۔ اُن کے دربار میں چھوٹے بڑے، امیر غریب سب کے ساتھ ایک برتاؤ ہوتا یہ بات قدح خوار کے ظرف پر منحصر تھی کہ کون ان سے کیا لے کر اٹھتا ہے۔

ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انہیں لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں ۔ ان کی روزمرہ کی زندگی میں ایک شان درویشی تھی ۔ جو مغربی تعلیم یافتہ لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے ۔ ہر موقع پر ان کی شخصیت میں ایک مخصوص سادگی وخلوص ، مقبولیت اور خود اعتمادی ، سچائی اور شرافت کا جلوہ نظر آتا تھا ۔

قدرت نے ان کو جس سانچے میں ڈھالا تھا اور جن ذہنی و اخلاقی صفات سے مالا مال کیا تھا وہ اپنی نظیر آپ تھے ۔ بہترین مقرر بلند پایہ مصنف ، ماہر تعلیم اور ممتاز تاریخ داں شفیق دوست اور راہبر و میر کارواں تھے اور ایسے کہ " نگہ بلند و سخن دلنواز و جاں پرسوز " ۔

مجھے یقین ہے کہ جب اللہ میاں روز حشر ان کے نامۂ اعمال کو ترازو میں تولے گا جس میں ذرہ برابر نیکی اور رتی برابر برائی بھی ظاہر ہو جائے گی تو ان کا شمار محسنین اور مشاہیر میں ہوگا ۔ ایک ایسے زمانے میں جب مصلحت پرستی کا دور دورہ ہو ۔ اور سچائی و جرأت کی کمی ۔ یہ کہیں بہتر ہے کہ ہر انسان سچائی کے راستے میں ثابت قدم رہے ۔ بجائے اس کے کہ ذاتی فائدے کی خاطر زمانے کی غلط روش پر چل نکلے اور سچ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے کیونکہ آخر میں سچ ہی کا بول بالا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کا ایک ہی مقام ہے اور وہ مقام ہے محبت رواداری کا ، شرافت کا اور انسانیت کا اور ان اخلاقی قدروں کے بچاؤ کے لئے جدوجہد کرنے کا جو زندگی کو شرف اور معنی بخشتی ہیں انہوں نے اپنے کو ان اعلیٰ قدروں کا خادم بنا کر ان قوتوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا جو ان کو شکست دینے کے درپے تھیں ۔

علامہ اقبال نے مردِ مومن کی جو شان بیان کی ہے اس کی تفسیر ڈاکٹر محمود حسین کے خدوخال میں ملتی ہے ۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش ، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاکباز

خواجہ معین الدین

مے خانہ خالی ہے

۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء کی تاریخ، اتوار کا دن اور شام کا وقت تھا ملیر میں واقع مجلس تعلیم ملی کے دفتر کے سامنے چبوترے پر چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ڈاکٹر محمود حسین اور دو تین افراد بیٹھے باتیں کر رہے تھے گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "اب ہم ہر اتوار کو یہاں نہیں آیا کریں گے" سننے والے یہ الفاظ سن کر چونک پڑے لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ ہاتف غیب کی آواز بن جائیں گے۔ برسوں کا معمول تھا کہ ڈاکٹر صاحب اتوار کے روز جامعہ ملیہ ضرور آتے۔ ناغہ اگر ہوتا تو صرف اس صورت میں جب ڈاکٹر صاحب کراچی میں موجود نہ ہوتے۔ اگلے اتوار کو ڈاکٹر ہسپتال کے ایک کمرے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ پھر ۱۰ اپریل کی گرم سہ پہر میں وہ جامعہ آئے، اس طرح آئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ بڑی شان سے، بڑی دھوم دھام سے، ہزاروں سوگواروں کے جلو میں آئے لیکن اپنے قہقہے بکھیرنے کے لیے، اپنی باتوں کی خوشبو پھیلانے کے لیے نہیں، اپنی دلنوازیوں اور مسکراہٹوں کا جادو جگانے کے لیے نہیں بلکہ مسجد باب الفضل کے زیر سایہ ابدی نیند سونے کے لیے آئے یہ وہ مسجد ہے جس کی تعمیر نہ جانے کتنے شوق اور کتنی محنت سے ڈاکٹر صاحب نے کرائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب پی، ای، سی، ایچ، ایس کے "گوشہ" سے قبر کے گوشہ میں منتقل کیے گئے اور ان کے ساتھ ہی شرافت و اخلاق کا ایثار و اخلاص کا اور علم و دانش کا آفتاب بھی قبر میں اتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی جو سب کے لیے اپنے اندر بے انتہا کشش اور جاذبیت رکھتی تھی۔ ان کے مزاج کی آفاقیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے مداحوں اور عقیدتمندوں کے حلقہ میں طلبہ، اساتذہ، صحافی، شاعر، ادیب، محقق اور ہر مکتب فکر کے سماجی و سیاسی

کارکن شامل۔ ان کی شخصیت میں ایسا جادو تھا جو کوئی ان سے ایک بار مل لیتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کے مزاج کی سادگی، انکسار، مروت، بے تعصبی، رواداری، بے نفسی اور علم پروری کے درخشاں نقوش کبھی مٹ نہیں سکتے لیکن جامعہ ملیہ کراچی کا قیام ڈاکٹر صاحب کا ایسا منفرد کارنامہ ہے جس کی اہمیت اور عظمت کا احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جائے گا۔ دراصل جامعہ ملیہ ڈاکٹر محمود حسین کا دوسرا نام ہے اور ان کی ان تھک محنت سخت جدوجہد اور ایثار و قربانی کا حاصل بھی۔

۱۹۵۲ میں اس ادارے کی ابتدا ایک چھوٹے سے پرائمری اسکول کی شکل میں ہوئی تھی جو ۱۹۷۲ تک بیس برس کے مختصر عرصے میں ترقی کر کے سات تعلیمی اداروں پر مشتمل ایک بہت بڑی درسگاہ کی حیثیت سے حکومت کی تحویل میں آگیا۔

ڈاکٹر محمود حسین اگرچہ خود زندگی بھر یونیورسٹی سے منسلک رہے لیکن ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور فنی تعلیم کے متعلق مخصوص اور ٹھوس نظریات رکھتے تھے جن کو وہ جامعہ ملیہ کے ذریعہ عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے اس اعتبار سے جامعہ ملیہ کراچی کو ڈاکٹر محمود حسین کے تعلیمی تصورات کی تجربہ گاہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ گو ڈاکٹر صاحب اپنے مشن کو بعض ایسے عوامل و اسباب کی بنا پر جو ان کے اختیار میں نہ تھے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تاہم جامعہ ملیہ کے ذریعہ انہوں نے قومی تعلیم کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم میں Pragmatism اور Idealism دونوں کو اس طرح سمونا چاہتے تھے کہ طالب علم کے اندر ایک طرف اسلامی قدروں، اعلیٰ اخلاقی مقاصد اور قومی نصب العین کا گہرا اور پختہ شعور اور ان کے ساتھ دلی وابستگی پیدا ہو تو دوسری طرف ہر لحہ بدلنے والے حالات سے مطابقت پیدا کرنے اور عملی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت بھی نشوونما پائے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی اپنی شخصیت بھی فی الواقع Pragmatism اور Idealism کا ایک حسین امتزاج تھی۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم پر خوشحال گھرانوں کی اجارہ داری ختم کر کے اسے عام آدمی تک پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے ہرگز قائل نہ تھے جو نئی نسل کو دو طبقات میں تقسیم کرتی ہے۔

ایک طبقہ ان امیر زادوں کا جو پبلک اسکولوں، مشنری اداروں کی بھاری فیس ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور دوسرا طبقہ ان بچوں کا جن کے سرپرست بھاری فیس ادا کرکے اچھی اور عمدہ تعلیم خریدنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کم سے کم خرچ میں اچھی سے اچھی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے یہ ایسا مقصد تھا جس کے حصول کے لیے ڈاکٹر صاحب نے زندگی بھر کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ۔ جامعہ ملیہ میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا اس طرح انتظام انہوں نے کیا کہ قومی تحویل میں لیے جانے سے قبل شاید ہی کوئی دوسرا نجی ادارہ ایسا تھا جہاں طالب علم کو معمولی فیس ادا کرنے پر اتنی زیادہ تعلیمی سہولتیں میسّر آتی تھیں جتنی جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر صاحب نے فراہم کر رکھی تھیں ۔

ڈاکٹر صاحب ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتے تھے ۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی ترقی اور اصلاح کے لیے جتنی اسکیمیں بنتی رہیں ان میں ثانوی تعلیم کو عموماً اور ابتدائی تعلیم کو خصوصاً نظر انداز کیا جاتا رہا ۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجیحات کی ترتیب کو بدل کر ابتدائی تعلیم کو سرفہرست رکھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں کئی گریجویٹ اساتذہ مقرر کیے جن کی تنخواہوں کا پورا بوجھ جامعہ کی انتظامیہ کو برداشت کرنا پڑتا تھا ۔ گورنمنٹ کی گرانٹ اس لیے نہ مل سکتی تھی کہ سرکاری قواعد کے مطابق پرائمری اسکولوں میں میٹرک پاس سے زیادہ قابلیت کے استاد نہیں رکھے جا سکتے تھے ۔ اسی طرح جامعہ کے مدارس ثانوی برائے طلبہ و طالبات میں بھی اعلیٰ علمی استعداد کے اساتذہ کے تقرر کو ڈاکٹر صاحب بڑی اہمیت دیتے تھے جامعہ کے ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے لیے تو ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل کی تھیں جن کا علمی مرتبہ و مقام محتاج بیان نہیں حالانکہ یہ ادارہ صرف پرائمری اور مڈل اسکولوں کے اساتذہ کی ترتیب کے لیے مخصوص تھا اور سرکاری قواعد کے مطابق ٹرینڈ گریجویٹ افراد یہاں استاد بننے کے اہل ہو سکتے تھے ۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کا مقصد ابتدائی اور ثانوی درجوں میں طلبہ و طالبات کی تعلیم و تربیت کا اچھے سے اچھا انتظام کرنا تھا ۔

ڈاکٹر محمود حسین نے جامعہ ملیہ کو اقامتی طرز کا ادارہ بنانے کی کوشش کی ایک ایسا اقامتی

ادارہ جس کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر کارکنوں کے درمیان ایسے تعلقات استوار ہوں جیسے ایک کنبہ اور ایک خاندان کے افراد کے درمیان ہوتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب نے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور دیگر کارکنوں کی رہائش کا انتظام بھی جامعہ ملیہ میں کیا تھا یہ ایک ایسا اقدام اور ایسی تعلیمی روایت تھی جس کی مثال کم سے کم کراچی جیسے شہر میں کہیں اور نہیں ملتی۔ پچھلے بیں بائیس برس میں طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی اور ثانوی مدارس سے فارغ ہو کر نکلی ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت میں جامعہ کے اقامتی نظام نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یہ طلبہ آج ملک اور بیرون ملک ایک کامیاب اور اچھی زندگی گذار رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب خود دوسروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اپنے سے بڑے اور برابر والوں ہی نہیں بلکہ اپنے سے چھوٹوں کی بھی وہ اتنی ہی عزت کرتے تھے کہ ہر چھوٹا اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ ہمارے طلبہ وطالبات میں بھی بڑوں کے احترام کی عادت پیدا ہو۔ جامعہ ملیہ سے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لیے ایک ماہانہ رسالہ "ستارہ" نکلتا تھا جو ادارے کے قومی تحویل میں جانیکے بعد بند ہو گیا۔ اس کے مدیر نے ڈاکٹر صاحب سے رسالہ کے لیے پیغام مانگا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک مشہور حدیث لکھ کر دی اور تاکید کی کہ ہر شمارہ میں اس کو نمایاں طور پر چھاپا جائے۔

"جو بڑوں کا احترام نہیں کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے وہ ہم سے نہیں"

جناب برکت علی صاحب جامعہ ملیہ کراچی کے مدرسہ ثانوی میں ریاضی کے استاد تھے جو جامعہ ملیہ دہلی میں بھی اس وقت پڑھایا کرتے تھے جب ڈاکٹر صاحب وہاں زیر تعلیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب انکی اتنی عزت کرتے تھے کہ جب بھی ملاقات کی ضرورت ہوتی خود چل کر ان کے گھر تک جاتے کبھی ان کو اپنے پاس نہیں بلایا جب ان کے انتقال کی خبر سنی تو ساری مصروفیت چھوڑ کر جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچے اور میت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبہ بھی وقت کی پابندی کریں۔ انہیں سب سے زیادہ پریشانی اور تکلیف اس وقت ہوتی جب کوئی کام وقت پر نہ ہوتا۔ کام وقت پر ہوتا تو خوش ہوتے اور اگر اس معاملہ میں کوتاہی ہوتی تو ناگواری

اور غصہ کا اظہار کرتے ۔

ڈاکٹر صاحب سویرے اٹھنے کے عادی تھے ۔ وہ عموماً پانچ ساڑھے پانچ بجے بیدار ہو جاتے جو لوگ ڈاکٹر صاحب کی اس عادت سے واقف تھے وہ جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے ان کی مصروفیات کے باعث ملاقات کا موقع نہ پاتے تو صبح پانچ بجے فون پر بات کر لیتے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا جب ڈاکٹر صاحب کی اپنے گھر پر موجودگی یقینی ہوتی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ طلبہ میں بھی سحر خیزی کی عادت پیدا ہو چنانچہ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کے مقیم طلبہ کے معمولات میں اب بھی صبح کی بیداری اور ورزش لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۵۹ء تک کالج کے ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کے لیئے بھی صبح کی بیداری اور ورزش لازمی تھی جس کی پوری طرح پابندی ہوتی تھی ۔

ڈاکٹر صاحب کو جامعہ ملیہ سے اتنی ہی محبت تھی جتنی ماں باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے یہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے جبکہ ملک میں مارشل لا کا دور دورہ تھا اور ایوب خاں کا عہد حکمرانی۔ جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریب ہونے والی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کے لیئے تو یہ گویا عید کا دن تھا خوش خوش اور مسرت کے ماحول میں ڈاکٹر صاحب اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ فون کی گھنٹی بجی اس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم حبیب الرحمن صاحب ڈاکٹر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ ایوب خاں آپ سے ملنا چاہتے ہیں فوراً چلے آیئے۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ کی تاسیس کی تقریب کو جس کے وہ خود میزبان تھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے مرکزی وزیر تعلیم کے اصرار کے باوجود اپنی معذوری ظاہر کر دی ۔ کوئی اور ہوتا تو شاید حکمران وقت کے دربار میں حاضری کے لیئے سر کے بل چلا جاتا ۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے روز ایوب خاں سے اور اس کے نتیجے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کرنا پڑی اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب نے جو عذر پیش کیا وہ یہی تھا کہ کہ جامعہ ملیہ کے کام کو آگے بڑھانے کے لیئے میں کراچی ہی میں رہنا چاہتا ہوں لیکن ایوب خاں نے یہ کہہ کر عذر رد کر دیا ۔ We are here to look after your institution ۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ یقین دہانی کسی کام کی نہ تھی اس لیئے وہ تقریباً ہر ماہ ڈھاکے سے کراچی آتے اور جامعہ ملیہ ہی میں ایک دو روز قیام

کرتے طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں سے ملتے۔ کام کا جائزہ لیتے۔ آئندہ کے منصوبوں کا خاکہ بناتے اور پھر چلے جاتے۔

ڈاکٹر صاحب کو ہماری قومی تاریخ کی جن شخصیتوں سے گہرا لگاؤ تھا ان میں سرسید، حسرت موہانی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، اور قائد اعظم سرِفہرست ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے ان مشاہیر کے افکار و کردار کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کی تھی۔ سرسید کا عالمانہ وقار حسرت کی شان استغناء، مولانا محمد علی کی عظمتِ کردار، علامہ اقبال کا سوز دروں اور قائد اعظم کی فراست ان سب کی پرچھائیں ڈاکٹر صاحب کی ذات میں نظر آتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر جامعہ ملیہ کے مختلف ادارے ان مشاہیر کی یاد میں بڑی پابندی سے تقریبات منعقد کرتے تھے۔ مدرسہ ابتدائی کی طرف سے ہر سال مولانا حسرت موہانی کی یاد میں جلسہ ہوا کرتا تھا اس موقع پر چھوٹے بچوں اور بچیوں کا نظم خوانی اور تقریری مقابلہ منعقد ہوتا اور جیتنے والی ٹیم کو مولانا حسرت موہانی کے نام سے ایک خوبصورت ٹرافی دی جاتی تھی مدرسہ ثانوی برائے طلبہ کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں بین المدارس جوہر ٹرافی مباحثہ کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جامعہ ملیہ کالج میں سرسید ٹرافی کا اجراء عمل میں آیا۔ کالج کی عمارت میں ڈاکٹر صاحب نے ایک وسیع ہال تعمیر کرایا جس کا نام قائد اعظم ہال رکھا۔ مدرسہ ثانوی کی عمارت کے ساتھ ۱۹۶۵ میں جو ہال تعمیر ہوا اس کا نام ڈاکٹر صاحب نے محمد علی ہال رکھا۔ علامہ اقبال کے اشعار تو جامعہ ملیہ کے تقریباً ہر ادارے میں آویزاں نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے تعلیم کے موضوع پر جامعہ ملیہ کی طرف سے مسلسل دس سال تک باقاعدگی کے ساتھ قومی سیمینار منعقد کیے ان میں ایک سیمینار Iqbal and Education کے موضوع پر منعقد ہوا اور اس میں پڑھے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ کی طرف سے چھپوایا۔ ان تمام کاموں سے اس دلی تعلق کا اظہار ہوتا ہے جو ڈاکٹر صاحب کو ان مشاہیر سے تھا۔ مولانا محمد علی جوہر سے ڈاکٹر صاحب کو اس درجہ عقیدت تھی کہ جس محفل میں مولانا کا ذکر ہوتا ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو جاتے اور اکثر مولانا کی یاد میں خود مولانا ہی کے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے ۵

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے ۔ کہ خُم کے خُم بھرے ہیں مئے سے اور میخانہ خالی ہے
تری محفل میں یہ ہے یوں ایک سے اک بڑھ کے فرزانہ ۔ مگر افسوس جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

آج یہی اشعار خود ڈاکٹر محمود حسین مرحوم پر صادق آتے ہیں۔ جس طرح مولانا محمد علی نے آخری دم تک آزادی کی جنگ لڑی اور اسی راہ میں جان دے دی ٹھیک اسی طرح ڈاکٹر محمود حسین نے آخری لمحہ تک تعلیم کے فروغ اور علم کی سربلندی کے لیے کام کیا اور کام کرتے کرتے جاں بحق ہو گئے۔
دونوں خطرناک امراض میں مبتلا تھے لیکن اپنی صحت تندرستی سے یکساں غافل اور بے پروا۔
کام کی لگن اور احساس فرض کا یہ عالم تھا کہ نہ مرض کی سنگینی کو خاطر میں لائے نہ طبیب کے مشورے کو اہمیت دی۔ چند سال پیشتر ڈاکٹر محمود حسین جب لندن میں تھے تو ماہر فزیشن نے ان کا طبی معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ There is a little margin between you health and serious illness".
یہ ایک سخت انتباہ تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس انتباہ کو کبھی لائق اعتنا نہ سمجھا۔ آخر وہی ہوا جو ناگزیر تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جس کے سرورق پر محبت کا عنوان لکھا ہوا تھا انہیں محبت تھی ان اعلیٰ اخلاقی اقدار سے جو قوموں کی بقا اور ارتقا کے لیے لازمۂ حیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہیں محبت تھی ان نونہالوں اور نوجوانوں سے جن کی صحیح تعلیم و تربیت سے قوم کا مستقبل وابستہ ہے انہیں محبت تھی اس معاشرے اور معاشرے کے افراد سے جنکی بھلائی اور بہتری کیلیے ان کا دل تڑپتا تھا۔ انہیں محبت تھی اس نظریہ سے جو پاکستان کی تخلیق کا باعث بنا۔ انہیں محبت تھی اس خطۂ زمین سے جس کا نام پاکستان ہے اور جس کے حصول کی جدوجہد میں وہ خود بھی شریک تھے۔ انہیں محبت تھی جامعہ ملیہ سے جسکی بنیاد انہوں نے کراچی میں رکھی اور جس کو پروان چڑھانے کے لیے اپنا خونِ جگر صرف کیا۔

ایسی بے پناہ محبت کرنیوالی شخصیت کسی بھی معاشرے کی عزیز ترین متاع ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ہم سے چھن گئی۔ یہ نقصان انفرادی نہیں اجتماعی ہے ذاتی نہیں قومی ہے۔ جو سب کا ہمدرد، جو سب کا غمخوار جو سب کا بہی خواہ تھا وہی دنیا سے اٹھ گیا جس کے دم سے ہر دل کو ڈھارس اور ہر محفل کی رونق تھی اسی کو ہماری آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں پر وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اسکی جگہ خالی ہے اور نہ جانے کب تک خالی رہے۔

علی عارف رضوی

انسان دوست

ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرحوم سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے ۱۹۵۶ء میں حاصل ہوا جب کہ میں شعبہ جغرافیہ میں ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، اور دیہہ ڈرگ کے ایک جائزے کے سلسلے میں ہم نے اپنے طلبہ کے ساتھ ایک ہفتہ تک جامعہ ملیہ میں قیام کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی یونیورسٹی کی تقریبات میں ڈاکٹر صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں شعبۂ جغرافیہ سے شعبہ تصنیف و تالیف میں آنے اور خاص طور پر مارچ ۱۹۷۲ء میں اس شعبے کے قائم مقام ناظم کے فرائض سنبھالنے کے بعد مرحوم سے ملنے کا موقع زیادہ ملا۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی سادگی و انسان دوستی تھی۔ انھوں نے حد درجہ سادہ و پاکیزہ زندگی بسر کی اور ہر قسم کے تصنع اور تکلف سے دور رہے ان کے مشفقانہ برتاؤ کے سبب کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی "بڑے آدمی" کے سامنے حاضری دے رہے ہیں :

ان کے اور بھی کارنامے ہیں لیکن جامعہ تعلیم ملیہ کراچی، ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی علم دوستی اور تعلیم کے فروغ سے دلچسپی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ملیر کے ایک غیر آباد علاقے میں معمولی سی عمارت میں قائم کیا گیا تھا، پھر ثانوی مدرسے سے کالج کے درجے قائم ہوگئے۔ آج اکی عمارت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسکول بھی ہے، فنون اور سائنس کے کالج بھی، اساتذہ کی تربیت کے ادارے بھی ہیں۔ طلبہ کے لئے اقامت گاہیں بھی۔ اور عملے کے لئے رہائشی مکانات بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۶ — ۱۷ سال کے مختصر عرصے میں اس شاندار ترقی میں دیگر

حضرات کی کاوشوں کو بھی دخل ہے، لیکن قوتِ محرکہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی ہی ذات تھی، ان کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں کے بغیر ترقی کی اس منزل پر پہنچنا اس ادارے کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے بھی ڈاکٹر صاحب کی وابستگی کسی نہ کسی شکل میں ابتدا ہی سے رہی۔ سنہ ۱۹۵۶-۱۹۵۷ء میں اس شعبے کے قیام کے سلسلے میں جو کمیٹی یونیورسٹی نے تشکیل دی تھی مرحوم اس کے ایک رکن تھے۔ پھر سنہ ۱۹۶۰ء میں جب یونیورسٹی اپنے نئے کیمپس پر منتقل ہوئی اور شعبے کی تنظیم نو عمل میں آئی تو ڈاکٹر صاحب بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔ وضع اصطلاحات کے سلسلے میں جو مجالس بنائی گئی تھیں ان میں سے ایک تاریخ و سیاسیات کی اصطلاحات کے لئے تھی اور اس کے صدر روزِ اول سے غالباً ڈاکٹر محمود حسین رہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں شیخ الجامعہ کی جگہ پر فائز رہنے کی مدت کو چھوڑ کر وہ پابندی کے ساتھ اس مجلس کی کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے۔

کراچی یونیورسٹی میں شیخ الجامعہ کے فرائض سنبھالنے کے بعد ان کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ مسائل کا ایک انبار تھا جن سے ان کو نبٹنا تھا اور ہر آنے والا دن اپنے ساتھ نت نئے مسئلے لے کر آتا تھا۔ اس کے باوجود جب کبھی میں نے شعبے کے کاموں کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہا انھوں نے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکال لیا۔ کبھی کبھی مختلف طباعتی امور کے سلسلے میں وہ خود مجھے طلب کر لیتے تھے لیکن گفتگو کا انداز حکم دینے کا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کہ اپنے کسی ساتھی سے کوئی کام انجام دینے کی فرمائش کی جائے۔ اور جب یہ کام عمدگی سے انجام پا جاتا تھا تو تعریف کرنے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ ان کے بعض فیصلوں سے میں نے اختلاف کیا۔ صرف بالمشافہ گفتگو میں نہیں بلکہ تحریری طور پر بھی اپنے اختلاف کا اظہار کر دیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے رویّے میں نہ کبھی ناراضگی کا شائبہ نظر آیا اور نہ ان کے التفات میں کمی ہوئی۔ یہ ان کے اعلیٰ ظرف، وسیع القلبی اور بزرگانہ شفقت کا ایک مظہر تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اتنے بلند عہدے پر فائز ہونے کے بعد اپنے احکام پر نکتہ چینی اور تنقید کو برداشت کر سکیں۔

شعبۂ تصنیف و تالیف نے ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی تین کتابیں شائع کیں ۔ دو اردو میں اور ایک انگریزی میں ۔ اردو کتابوں میں "معاہدہ عمرانی" اور "بادشاہ" بالترتیب روسو کی معرکۃ الآرا کتاب "کونترا سوسیال" اور میکیاولی کی "پرنس" کا ترجمہ ہیں ۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ دونوں کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کے سیر حاصل مقدمے اور حواشی ہیں ۔ شعبہ تصنیف و تالیف سے شائع ہونے سے قبل ان ترجموں کے ایڈیشن دوسرے اداروں سے چھپ چکے تھے ، اور اگر ڈاکٹر صاحب چاہتے تو کئی ناشر ان کو شائع کرنے کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہو جاتے لیکن انھوں نے شعبے سے ہی چھپوانا پسند فرمایا ۔ اور ہمیں بھی اس بات پر فخر ہے کہ طباعت وغیرہ کا جو معیار ان کے پیش نظر تھا یہ کتابیں اس معیار پر پوری اتریں ۔

تیسری کتاب OF LIBRARIES AND LIBRARIANS پاکستان میں کتب خانوں کے فروغ اور علم کتب خانہ (لائبریری سائنس) سے وابستہ حضرات کی حالت کو بہتر بنانے اور ان کو ان کا جائز مقام دیے جانے کے سلسلے میں ہے اور ڈاکٹر صاحب کی تقاریر، خطبات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب شعبہ علم کتب خانہ کے سابق صدر ڈاکٹر انیس خورشید کی تحریک اور فرمائش پر طباعت کے لئے منظور کی گئی ۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ کتاب شائع ہو جانے کے بعد جب شعبے کے قواعد کے مطابق مصنف کو رائلٹی کی مجموعی رقم کا نصف حصہ ادا کئے جانے کی اجازت طلب کی گئی تو انھوں نے یہ رقم خود لینے کے بجائے "۱۹۴۷ء کے کتابی ذخائر کا جائزہ" طبع کرنے کے لئے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ علم کتب خانہ کو بطور عطیہ دے دی ۔

یوں تو اس دنیا میں آنے والے ہر شخص کو کسی نہ کسی روز موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے گذر جانے سے بڑا خلا محسوس ہونے لگتا ہے ۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب ان ہی چند لوگوں میں سے تھے ۔

> تاریخ کے صفحات مسلمانوں کے زریں کارناموں سے بکھرے ہوئے ہیں مگر زمانے کے سینے میں یہ بیش بہا خزانے محفوظ ہیں ۔ آپ جہاں کہیں بھی نظر ڈالیں ۔ خواہ وہ عرب ہو کہ عجم ، ایران ہو کہ توران ، مشرق ہو کہ مغرب ، اندلس ہو کہ قرطبہ ، ہند ہو کہ پاکستان ، یورپ ہو کہ ایشیا ، ہر جگہ آپ کو اسلامی آرٹ کے شاہکار درخشندہ و تاباں نظر آئیں گے ۔ محمود حسین

صادق علی خاں

کتب خانہ جامعہ تعلیم ملی اور ڈاکٹر محمود حسین

ڈاکٹر محمود حسین تعلیمی اداروں کے قیام سے حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے مگر کتب خانوں کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کچھ اور بڑھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جامعہ ملیہ ملیر کے مرکزی کتب خانہ کے قیام کے سلسلے میں اپنی وہ ساری صلاحیتیں صرف کر دی تھیں جن سے قدرت نے انہیں نوازا تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کتب خانوں کے بغیر تعلیم کا کام مستحکم بنیادوں پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں جامعہ ملیہ کے افتتاح کے موقع پر مدرسہ ابتدائی کے ساتھ ساتھ کتب خانہ کی بھی داغ بیل ڈال دی تھی۔ جب ثانوی مدرسہ قائم کیا گیا تو ایک چھوٹا سا کمرہ کتب خانہ کو دیا گیا جو آجکل ثانوی مدرسہ کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا کتب خانہ ڈاکٹر اسمٰعیل سعد کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں جب ڈاکٹر اسمٰعیل سعد مزید تعلیم کے لیے امریکہ تشریف لے گئے تو ۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو چودھری محمد علی نے جو اُس وقت ثانوی مدرسہ کے نگراں تھے کتب خانہ کا انتظام راقم الحروف کے سپرد کر دیا۔ اس وقت کتب خانے کا ذخیرہ سب ملا کر مشکل سے دو سو کتابوں سے زیادہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر محمود حسین کے رفیق کار عبد الحیٔ نے جنہیں جامعی حضرات ماسٹر صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اپنے آپکو جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ موصوف اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ ایک پیسے سے دو پیسہ کا کام کس طرح لیا جائے۔ ماسٹر صاحب نے پروفیسر محمد عاقل کو میرے متعلق لکھا تھا کہ اگر صادق پاکستان آرہے ہیں تو ان سے کہیے کہ فوری طور پر ملیر میں ان سے ملاقات کریں۔ اس طرح ۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو میرا جامعہ ملیہ ملیر میں ورود ہوا۔ ڈاکٹر محمود حسین کو میں نے پہلی مرتبہ اپنی زندگی میں اس وقت دیکھا جب ماسٹر صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا "یہ ہیں صادق جن کے متعلق میں نے آپ سے کہا تھا" ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ ہماری یہ پالیسی ہے کہ اسٹاف میں خاص طور سے ایسے لوگوں کو رکھیں جن کا تعلق جامعہ ملیہ دہلی سے استاد یا شاگرد کی حیثیت سے رہا ہو مگر ایسے لوگ ملتے ہی نہیں۔ اگلے اتوار کو جب ڈاکٹر محمود حسین تشریف لائے تو انہوں نے مجھے یاد کیا۔ ادارہ میں میری شمولیت کے بعد ڈاکٹر صاحب کا

یہ دوسری قسط ایف آدری تھی جس میں کتابوں کی پہلی کھیپ جو مجھے موصول ہوئی وہ الائڈ بک کارپوریشن سے آئی تھی جسے موصوف نے خود ہی خریدا تھا اور خود ہی اسے اپنی کار میں جامعہ ملیہ لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ کتب خانہ کی مد میں ان کے پاس بیس ہزار کی رقم کا عطیہ موجود ہے جسے کراچی کے ایک مخیر شخص غنی دہلوی نے عطا کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے معلوم کیا کہ اس رقم کو کیسے خرچ کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس رقم سے ایک عمارت تعمیر کرائی جا سکتی ہے ڈاکٹر صاحب اس جملہ پر مذاق کے انداز میں مسکرائے اور ایک دم میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ کتب خانہ میں کتابیں ہی نہیں ہونگی تو کتب خانہ کی عمارت کا کیا ہوگا؟ اس پر میں نے انہیں بتایا کہ وہ عمارت کو سردست کسی دوسرے کام میں استعمال کر سکتے ہیں اور جیسے ہی کتابوں کا ذخیرہ بڑھ جائے گا تو کتب خانہ اپنی عمارت میں چلا جائے گا۔ اس واقعہ سے ذرا دیر پہلے ڈاکٹر صاحب اپنے رفقاء کار سے سائنس کالج کے قیام پر گفتگو کر رہے تھے چنانچہ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ہاں ایسا ہو سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ کتب خانہ کی تعمیر کے لیئے رضامند ہو گئے جسے ابتدا میں سائنس کالج کے طور پر اس وقت تک استعمال کیا جائے گا جب تک کہ کالج کی عمارت مکمل نہ ہو جائے ڈاکٹر صاحب جب اگلے اتوار کو تشریف لائے تو اور لوگوں کی طرح میں بھی ان کے انتظار میں ماسٹر صاحب کے کمرہ میں موجود تھا۔ کمرہ میں جیسے ہی داخل ہوئے انہوں نے سب کو سلام کیا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کچھ کتابیں دیں۔ اور کہا کہ چند منٹ میں آرکیٹیکٹ کتب خانہ کے نقشہ کے سلسلہ میں پہنچنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ جملہ مشکل ہی ختم کیا تھا کہ مبشر صاحب تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مبشر صاحب سے کہا کہ چلیئے آپ کو وہ جگہ دکھادیں جہاں کتب خانہ تعمیر ہوگا۔ ہم سب چل دیئے۔ کچھ ہدایات دینے کے بعد انہوں نے مبشر صاحب سے کہا نقشہ اگلے اتوار تک ہر صورت میں آجانا چاہیئے۔ چنانچہ اگلے اتوار کو ایسا ہی ہوا اور نقشہ پر غور کیا جانے لگا۔ اسی اثناء میں میں نے کہا کہ اگر کراچی یونیورسٹی کے سربراہ کتب خانہ عبدالمعید صاحب کو بھی نقشہ دکھا لیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو میری یہ بات کچھ پسند نہیں۔ اس لیئے کہ وہ سوچتے ہوں گے کہ اس طرح سے مزید تاخیر ہو جائے گی لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے معید صاحب کو اگلے اتوار کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کار سے اترتے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مبشر صاحب بھی تشریف لائے نقشہ منظور کر لیا گیا اور

تعمیری کام شروع ہوگیا ۔

اس عرصہ میں کتب خانہ اپنے چار ہزار ذخیرہ کتب کے ساتھ ثانوی مدرسہ کی ایک کلاس روم میں منتقل ہوگیا تھا ۔ کالج کی عمارت کی پہلی منزل مکمل ہوجانے کے بعد سائنس کالج کتب خانہ کی عمارت سے ۱۹۵۶ء میں اپنی عمارت میں منتقل ہوگیا ۔ چنانچہ کتب خانہ بھی اپنے سات ہزار ذخیرہ کتب کے ساتھ ثانوی مدرسہ سے نکل کر اپنی عمارت میں مستقل طور پر آباد ہوگیا ۔ پہلی منزل ذخیرہ کتب اور لائبریریوں کے دفتر پر مشتمل تھی اور دوسری منزل میں دارالمطالعہ کا قیام عمل میں آیا جس میں اخبارات و رسائل اور حوالہ جات کتب منتقل کی گئیں ۔

ڈاکٹر محمود حسین نے ۱۹۵۵ء میں ملکی اور بیرونی سائنسدانوں سے اس بات پر مشورہ کیا کہ ایک سائنس کالج کے لیے کتابوں کا ذخیرہ کس نوعیت کا ہونا چاہیئے ۔ میسیچیٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MASSACHUSETTS Institute of Technology) نے امریکہ کے جونیئر کالجوں کے لیئے سائنس کی کتابوں کی کتابیات تیار کی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتابیات کو مدنظر رکھتے ہوئے سائنس کی خرید کتب کے لیئے ایک فہرست تیار کرائی اور ایشیا فاؤنڈیشن کی حاصل کردہ پچیس ہزار روپیہ کی رقم کتابوں کی خرید پر صرف کی ۔ فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان پر بیس ہزار کی رقم خرچ کی گئی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو کتب خانہ سے گہری دلچسپی تھی جبکہ ان کے بہت سے رفقاء کار یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ کتب خانہ پر خرچ ہو رہا ہے وہ کہیں زیادہ ہے کیونکہ کراچی کے بیشتر کالج اور اسکول بغیر کتب خانوں کے اپنا کام دے رہے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں ان تمام موضوعات پر جو مدرسہ ابتدائی کی منزل سے لیکر کالج کی منزل تک پڑھائے جاتے ہیں کتابیں خریدی گئیں علاوہ ازیں دیگر علوم و فنون پر کتابوں کی خرید کا سلسلہ جاری رہا تاکہ اساتذہ اور طلبار کی ضروریات پوری کی جا سکیں ۔ ڈاکٹر صاحب کتب خانہ کے ذخیرے کو بہتر بنانے کے لیئے دو تین چیزیں ضروری سمجھتے تھے ۔ پہلی یہ کہ جامعی حضرات کی تصانیف حاصل کیجائیں ۔ یہی نہیں بلکہ ان پر جو دوسرے لوگوں نے لکھا ہے وہ بھی جمع کی جائیں ۔ دوسری یہ کہ جامعہ عثمانیہ، مکتبہ جامعہ دہلی، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی نولکشور پریس لکھنؤ، مطبع مجیدی کانپور اور مطبع مجتبائی دہلی کی کتب حاصل کی جائیں ۔ تیسرے یہ کہ کتب خانہ

ناول، افسانوں، ڈراموں کی صرف وہ کتابیں خریدے جن کا شمار کلاسیکی ادب میں ہوتا ہو۔ کیونکہ جامعہ ملیہ کا کتب خانہ تعلیمی کتب خانہ ہے عوامی کتب خانہ نہیں ہے مہتمم کتب خانہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود حسین نے مجھے مہتمم کتب خانہ کی حیثیت سے انگلستان مزید تعلیم کے لیے بھیجا۔ مارچ ۱۹۶۲ء تا جنوری ۱۹۶۳ء کے عرصہ میں جبکہ میں ملک سے باہر رہا ڈاکٹر صاحب نے درسی کتب کے ایک سیکشن کا کتب خانہ میں اضافہ کیا اور اس طرح پہلی مرتبہ پاکستان میں بک بینک کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کتب اور کتب خانہ کے دوسرے مواد کی حفاظت کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اتنی پر اثر اور جاذب نظر تھی کہ ان سے متاثر ہو کر بہت سے جلد سازوں نے کتب خانہ جامعہ کے لیے مفت جلد سازی کی یا بہت ہی کم نرخوں پر جلد سازی کر کے دی علاوہ ازیں کتب خانہ کے قواعد و ضوابط کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ انہوں نے جامعہ کے ایک استاد کو محض اس بات پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا تھا کہ اس نے کتب خانہ سے کتابیں جاری کرا کے اس بات سے انکار کر دیا کہ اس نے کتب خانہ سے کوئی کتاب لی ہے۔ اس فیصلہ پر مجلس انتظامیہ کے ایک دو رکن مخالف تھے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ معاملہ کتب خانہ کے عملہ کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور اپنے فیصلے پر جمے رہے۔

جیسا کہ سب کو علم ہے ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی تدریس کے پیشے میں گذری ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ تدریس کا کام اس وقت تک جاری نہیں رہ سکتا جب تک کہ اچھا کتب خانہ قائم نہ کیا جائے۔ اور یہی وہ غالباً اصل وجہ تھی جس کے تحت کتب خانہ کا ذخیرہ کافی ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مہتمم کتب خانہ سے کہا کہ وہ کتابیں جو اسکولوں اور دوسرے اداروں سے متعلق ہیں وہ وہاں بھیجدی جائیں اس طرح مرکزی کتب خانہ کی سرپرستی میں شعبہ جاتی کتب خانوں کا وجود عمل میں آیا۔ جب بھی جامعہ میں کوئی مہمان آتا تو ڈاکٹر صاحب غیر معمولی انہماک سے تمام کتب خانوں کو دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ پرنسپل جامعہ ملیہ کالج نے شکایت کی کہ ہر ادارہ میں ایک کتب خانہ ہے لیکن کالج میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

بتایا کہ مرکزی کتب خانہ دراصل کالج کا ہی کتب خانہ ہے جو کالج کے اساتذہ اور طلبار کی خدمت انجام دیتا ہے البتہ اس کا نام کالج کے کتب خانہ سے موسوم نہیں ہے۔ کالج کے شعبوں میں اساتذہ کو مزید سہولتیں بہم پہنچانے کی غرض سے شعبہ جاتی کتب خانہ قائم کیے گئے۔

مہتمم کتب خانہ کی حیثیت کالج کے اساتذہ کے مساوی تھی جبکہ ملک کے دوسرے اداروں اور خاص کر کالجوں میں مہتمم کتب خانہ کی حیثیت ایک محرر سے زیادہ تصور نہ کی جاتی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں جب ڈاکٹر صاحب تدریس کے سلسلہ میں جرمنی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ تشریف لے گئے تھے تو اس وقت ان کی عدم موجودگی میں کالج کی مجلس انتظامیہ نے کالج کے اساتذہ کے مشاہرہ کی شرح پر نظر ثانی کی مگر مہتمم کتب خانہ کے مشاہرہ پر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط میں ان حالات سے آگاہ کیا جس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو اپنے ساتھیوں کو مناسب فیصلہ کی طرف راغب کرتے میں اتنی دور سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس مجلس منتظمہ نے غلط فیصلہ کیا ہے وہ اس کی تصحیح بھی کر سکتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی واپسی پر کالج کی مجلس منتظمہ کے پہلے جلسہ میں مہتمم کتب خانہ کے مشاہرہ کی شرح بحال ہوگئی جو کالج کے اساتذہ کی مقرر ہوئی تھی۔

> بعض دوسرے لوگوں کے ذہن میں شاید یہ سوال اٹھتا ہو کہ اسلامی تہذیب کی اقدار عالیہ موجودہ دور کے تقاضوں سے کیسے ہم آہنگ ہو سکیں گی۔ تعلیم کو ان قدروں کا ترجمان بنانے کے بعد جو تعلیمی ماحول پیدا ہوگا وہ ٹیلی وژن، ہوائی جہاز، جوہری توانائی اور اقوام متحدہ کی اس بیسوی صدی کے ماحول سے کیسے مطابقت حاصل کر سکے گا۔ لیکن میرا جواب صرف یہ ہوگا کہ جن انسانی مسائل سے ہم بیسویں صدی میں نبرد آزما ہیں ان کی تاریخ اس صدی سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ ان مسائل کی شدت کو بیسویں صدی نے تیز ضرور کر دیا ہے، لیکن ان مسائل کو اس صدی نے پیدا نہیں کیا ہے۔ تعلیم کی نظریاتی بنیادوں میں بیسویں صدی کی تیز رفتاری نے کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا ہے اور بنیادی طور پر فلسفۂ تعلیم کے مسائل اب بھی وہی ہیں جو اس صدی سے پہلے تھے۔ — محمود حسین

ظہیر الحق

ساتھی

تھوڑا سا تو لیجیے۔ اچھا بنایا ہے۔ میٹھا بھی زیادہ نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں تو لیجیے
مگر زیادہ مت دیجیے گا۔ دورانِ گفتگو پلیٹ میں نکالتے وقت میزبان نے اپنی خواہش کا
خیال رکھتے ہوئے دوسرے کی مرضی کا بھی پورا خیال رکھا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں خوش رہے
اور الزام بھی کسی کے سر نہ گیا۔ میزبان صاحب ماسٹر عبدالحئی صاحب اور مہمان جناب
ڈاکٹر محمود حسین تھے۔

مزے کی بات یہ کہ دونوں شکر کے مریض تھے اور دونوں کے لیے مٹھائی منع تھی
مگر دوستی بزرگی اور مروت کا دونوں کو کتنا خیال تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے کسی
بات پر اختلاف نہیں کر سکتے تھے چاہے وہ مسئلہ انتظامی ہو، تفریحی ہو یا کھانے پینے کا!

جامعہ ملیہ ملیر ۱۹۵۲ء میں ایک پرائمری اسکول کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ کس کو
خیال تھا کہ یہ چھوٹا سا پودا اتنی جلدی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس کا
اندازہ پہلے سے لگانا مشکل تھا مگر جو لوگ ان دونوں کے ساتھ تھے انہوں نے اس کا
اندازہ لگا لیا تھا۔ وجہ یہ تھی۔ دونوں کا خلوص، دونوں کا جذبۂ خدمت اور دونوں کی
انتھک محنت، ان کے ساتھی جان چکے تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو نہ نام کی ضرورت
ہے اور نہ دام کی؛ ان کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے ملک اور قوم کی خدمت،
خدمت کا میدان انہوں نے تعلیم پسند کیا تھا۔ غریب اور ایماندار لوگ تھے۔ سوائے
تعلیمی کام کے اور کام کر بھی تو نہ سکتے تھے۔ اپنے بڑوں کو بھی یہی کچھ کرتے دیکھا تھا اور ان
ہی سے سیکھا ہوا سبق دہرانا چاہتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اگر ہمارے نوجوان تعلیم کے ساتھ
ساتھ تربیت میں بھی مکمل ہوں۔ تو وہ ملک اور قوم کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہو

ہو سکتے ہیں۔

آج سے پورے ۲۴ سال پہلے ۲۹ اکتوبر کو جامعہ ملیہ دہلی کے کچھ بڑے اساتذہ اور کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ جامعہ کی طرز پر کیوں نہ ایک قائم ادارہ کھولا جائے طے ہوتے ہی فوراً بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ جگہ کی تلاش میں کراچی کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر ملیر کا ایک ویرانہ پسند کیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت حکومت میں ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے آپ کی کوشش اور رسائی سے یہ کام آسان ہو گیا۔ اور جلدی ہی ملیر میں زمین کا ٹکڑا مجلس تعلیم ملی کے نام الاٹ ہو گیا۔

زمین پر قبضہ ملتے ہی ماسٹر صاحب نے کچھ پرانے ساتھیوں کو جمع کیا اور اس ویرانے میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اس وقت کی دقتوں اور پریشانیوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے ایک نیا کام شروع کرنا تھا اور وہ بھی تعلیمی کام۔ لوگوں نے مذاق اڑایا طرح طرح کی باتیں کیں۔ یہ تک کہا گیا کہ ان سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے یہاں اسکول کھولے تھے مگر اب ان میں ایک نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ یہی کر سکتے ہیں کہ جو تھوڑا بہت سامان ہے وہ یہ لوگ لے جائیں گے مگر ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کام کرنے والے آدمی نہیں جتی ہیں یہ بھاگنے والے نہیں بھگانے والے ہیں تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر ماسٹر صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام شروع کر چکے تھے تین کمرں پر مشتمل ایک خستہ عمارت تھی اور چاروں طرف سے گھنے جنگل اور کھیت۔

ریلوے لائن پار کر کے تقریباً ایک میل پیدل چلنے کے بعد اس جگہ پہنچا جا سکتا تھا۔ راستہ ویران اور خطرناک تھا دن کے وقت بھی ڈر محسوس ہوتا تھا۔ رات اس قدر بھیانک تھی جس کا تصور بھی مشکل ہے رات کے سناٹے میں گیدڑوں کا شور وحشت ناک منظر پیش کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب فیصلہ کر چکے تھے اور کام پورے زور و شور سے شروع ہو چکا تھا کام میں پیسے کی کمی حائل تھی اس کے لئے طے ہوا کہ چندے کی مہم شروع کی جائے رسید بک چھپوانے کا مسئلہ تھا ایک مہربان نے اس کام میں مدد کرنے کا وعدہ کیا اور

رسیدیں اپنے پریس میں چھپوادیں۔ بجائے اس کے کہ رسیدوں کی چھپوائی طلب کرتے پہلی رسید ساٹھ روپے کی خود انھوں نے اپنے نام سے کٹوائی۔ اب سوچیے تو کچھ کام نہیں کرتی اتنے بڑے کام کے لیے صرف ساٹھ روپے۔ بظاہر ناممکن تھا۔ مگر خلوص اور خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے یہ رقم لاکھوں کے برابر تھی چندہ کی مہم شروع ہوگئی اور کام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

پہلے چندے سے دو لالٹینیں، تین المونیم کی پتیلیاں اور چند دوسری ضروری چیزیں خریدی گئیں۔

اب دوسرا مسئلہ تھا۔ بچوں کو جمع کرنے کا۔ محنت دوڑ دھوپ اور خوشامد کے بعد قریب و جوار کے ۴۰ بچے جمع کرلیے گئے۔ ان میں دس طلبہ بورڈنگ کے لیے بھی تھے کلاسیں شروع کردی گئیں اور ایک بڑے کمرے میں بورڈنگ کے طلبا، اساتذہ اور ملازموں کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔ شروع کے چند دن بورڈنگ کے طلبہ دونوں وقت کھانے کے لیے ملیر بازار جاتے تھے۔ ناشتے کا انتظام اسکول میں ہی تھا۔

پڑھائی کے بعد باقی وقت بورڈنگ کے طلبا کے ساتھ اسکول کے احاطے کی صفائی اور آئندہ کے منصوبوں پر تبادلۂ خیال میں گزرتا۔

چندے کی مہم تیز کردی گئی تھی اور ہمدردانِ جامعہ کی فہرست روز بروز ترقی کررہی تھی۔ اندازہ یہ ہوا کہ کراچی میں ہمدرد لوگوں کی کمی نہیں تھی یہ دل والے لوگ تھے اور ایمانداری اور خلوص کے متلاشی تھے چندے کی رقم کو صحیح استعمال ہوتے دیکھ کر ان کی اور کارکنوں کی ہمت بڑھ گئی تھیں۔ بعض مخلص حضرات نے نقد دینے کی بجائے کرنے برتنے اور دوسری ضرورت کی چیزیں دینے کی پیش کش کی۔ ماسٹر صاحب کو ضرورت پیسے کی نہیں تھی بلکہ کام کو آگے بڑھانے کی تھی اور ظاہر ہے اس وقت ہر چیز ان کے لیے قیمتی تھی اس لیے مخلص کرجو کچھ بھی ملتا اسے قبول کرلیتے۔

اسکول نے اب باقاعدہ شکل اختیار کرلی اور کام کرنے والوں کو اپنی کامیابی کی امید ہوچلی تھی آئے دن اسکول میں کسی مہمان کی آمد کا انتظام ہوتا تھا۔ یہ مہمان اسکول دیکھنے

آتے اور کام کو دیکھ کر امداد دینے کا فیصلہ کرتے، مہمانوں کا انتخاب جناب ڈاکٹر صاحب کرتے اور ان کی آمد اور خاطر مدارات کا انتظام ماسٹر صاحب کے سپرد ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسکول میں کلاسیں پڑھانے کا کام بھی جاری تھا جلد ہی پرائمری کے ساتھ ہی ثانوی کی کلاسز بھی شروع کر دی گئیں۔

تعمیری کام کی بدولت آہستہ آہستہ عمارتیں زمین سے ابھر رہی تھیں آس پاس کے کھیت کٹنے شروع ہو گئے اور چند دن پہلے والی ویران جگہ اب خوبصورت آبادی میں تبدیل ہو رہی تھی ۱۹۵۶ء تک مدرسہ ثانوی۔ نرسری اور مدرسہ ابتدائی کی عمارتیں ایک ڈائننگ ہال سمیت مکمل ہو چکی تھیں۔ اب کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا مسئلہ زیر غور تھا اور ساتھ ہی لائبریری کے لئے ایک الگ عمارت ایک ہمدرد نے بنوانے کی حامی بھرلی۔ کھیل کے میدانوں کی کمی نہیں تھی۔ ساتھ ہی ایک نہانے کا تالاب بنانے کا خیال پیدا ہوا اور جلد ہی ایک ہمدرد اس کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ابتدا ہی سے لڑکیوں کا اسکول کھولنے کا منصوبہ تھا پہلے خیال تھا کہ یہ اسکول شہر میں کھولا جائے گا اس کے لئے زمین بھی لی جا چکی تھی مگر بعد کو فیصلہ یہ ہوا کہ یہ اسکول بھی ملیر میں ہی مناسب ہو گا۔ اس طرح سے سب ادارے ایک جگہ ہو جائیں گے اور کام کی نگرانی اور دیکھ بھال میں آسانی ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش بھی ایک کرم فرمانے پوری کر دی۔ اور گرلز اسکول کی عمارت بنوا دی۔ آخر میں ٹیکنیکل کی عمارت بھی حکومت کی امداد سے تیار تیار ہو گئی۔ اساتذہ کے لئے کوارٹرز پہلے ہی بن چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتے تھے تو پھر وہ کام یا منصوبہ مکمل دیکھنا چاہتے تھے اور اس کام کی تکمیل میں جب کسی قسم کی رکاوٹ یا پریشانی پیدا ہو گی تو وہ کبھی نہیں سوچتے تھے ان کا خیال تھا کہ ہمارا مقصد نیک ہے تو پھر کام نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور ہوتا بھی یہی تھا کام شروع کرا دیتے تھے پیسے یا دوسری ضروریات کے متعلق بعد میں سوچتے تھے اور پھر اس کے لئے دن رات ایک کر دیتے تھے

ماسٹر صاحب پر بھروسہ کرتے تھے اور کسی بھی منصوبے کو ان کے حوالے کرنے کے بعد

ان کی پریشانی سمجھتے ہوئے ان کو چھیڑنے کے لئے کبھی کبھی مذاق میں کہا کرتے تھے ماسٹر صاحب پیسے سے تو سب ہی کام کر لیتے ہیں۔ آپ بھی اگر پیسے کی شکایت کریں گے۔ تو پھر آپ میں اور دوسروں میں کیا فرق رہے گا۔

اتوار کا پورا دن جامعہ کے لئے تھا۔ صبح آجاتے تھے اور شام کو گھر جاتے تھے دل تو ان کا یہی چاہتا تھا کہ جتنا زیادہ وقت جامعہ میں گزار سکیں اچھا ہے۔

جامعہ کے کسی ادارے میں کوئی بھی معمولی سا جلسہ ہو اس میں آنے کی فوراً حامی بھر لیتے تھے اور پھر جلسہ شروع ہونے سے پہلے ہی جلسہ گاہ پہنچ جاتے اور وقت کی پابندی کی تاکید کرتے۔

ڈاکٹر صاحب اور ماسٹر صاحب کی یہ تعلیمی بستی بہت جلد ملک کے گوشے گوشے میں مشہور ہو گئی اپنی قسم کا یہ واحد ادارہ ہونے کی وجہ سے ملک کے باہر بھی اس کا نام لیا جاتا رہا اور نتیجے میں طلباء کی ایک بڑی تعداد دوسرے ممالک سے آنے لگی۔

جامعہ ملیہ کی شکل میں دو ساتھیوں نے قوم کو جو کچھ دیا ہے قوم کا فرض ہے کہ اس کو سنبھال رکھے اور انکی خواہشات کے مطابق انکے کام کو آگے بڑھائے۔

ڈاکٹر صاحب جیسا رہنما اور ماسٹر صاحب جیسا پرخلوص کارکن اب موجود نہیں مگر امید ہے کہ حکومت اور قوم ان کی خواہشات کے مطابق ان کے نامکمل منصوبوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔

جمال الدین افغانی نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں وطن ہی سے نہیں کئی اسلامی ممالک سے نکالے گئے۔ اور آخر میں بحالت نظر بندی ترکی میں ان کا انتقال ہوا۔ مگر اس دُھن کے پکے انسان کو کوئی مصیبت اور کوئی تکلیف اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکی۔ ایسے ہی لوگ نہ صرف تاریخ میں یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ تاریخ ساز کہلاتے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمود حسین

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

جامعہ تعلیمِ ملّی اپنے پس منظر میں

جامعہ تعلیمِ ملی کے منظر و پیش منظر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کے پس منظر سے لوگوں کو صحیح واقفیت نہیں ہے حتیٰ کہ مجلس تعلیمِ ملی کی سالانہ مطبوعہ روئدادیں بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں اس لئے اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ابتداً اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مجلس تعلیمِ ملّی (رجسٹرڈ) نام ہے ایک انجمن یا تنظیم کا اور جامعہ ملیہ نام ہے اس تعلیمی ادارے کا جو اس مجلس کے تحت قائم ہوا۔ مجلس تعلیمِ ملّی کی جانب سے ۱۶ر مارچ ۱۹۵۳ء کو جو میمورنڈم چھپا تھا اور جسے بعض ترمیمات کے ساتھ ٹائمس پریس کراچی سے بھی ۱۹۶۴ء میں شائع کیا گیا تھا اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بعض قدیم طلبہ، اساتذہ اور بہی خواہوں کا ایک جلسہ ۸ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ اسی میں مجلس تعلیمِ ملّی پاکستان کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی تھی، پھر ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو اس کا میمورنڈم مرتب کیا گیا اور، مولانا اسلم جیراجپوری، پروفیسر وقار عظیم، سید عروج الحسن، عبدالواحد سندھی، رحیم الدین، تصویر حسین اور کے۔جی چشتی نے اس پر دستخط کئے لیکن یہ مجلس کئی برس تک صرف کاغذ پر رہی اور کوئی عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ جب ماسٹر عبدالحیٔ مرحوم اور اس وقت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر محمود حسین مرحوم، اس میں عملاً شریک ہوئے تو مجلس تعلیمِ ملی ایک فعال منتظم بن گئی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قیادت میں ۲۹ر اکتوبر ۵۲ء کو "جامعہ ملیہ" کے نام سے اپنے وجود و اقدام کا عملی ثبوت فراہم کر سکی۔ چنانچہ مجلس تعلیمِ ملی کا یومِ تاسیس اسی نسبت سے ۲۹ر اکتوبر کو منایا جاتا ہے اس تاریخ کے انتخاب میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد بھی اسی تاریخ کو رکھی گئی تھی۔

"مجلس" کی طرح "جامعہ ملیہ" کے پس منظر سے بھی عام طور پر لوگ بے خبر ہیں حالانکہ ۹ر مارچ ۱۹۵۲ء کے سارے اخبارات اور، اپریل ۱۹۵۲ء کے نگار کے علاوہ جون ۱۹۶۶ء کے نگار میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ اکتوبر ۵۲ء میں جس وقت مجلس تعلیمِ ملّی کو جامعہ ملیہ کے لئے موجودہ جگہ الاٹ ہوئی

تو وہاں چند کمروں کی وہ لمبی بیرک موجود تھی جس میں جامعہ ملیہ کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ یہ گرو کل بلڈنگ نام کی ایک متروکہ عمارت تھی اور جامعہ ملیہ سے پہلے اس میں "نرسری پبلک اسکول" کے نام سے آٹھویں جماعت تک ایک اسکول ۱۹۵۰ء سے قائم تھا۔ طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ چھ استاد تھے پہلے ہیڈ ماسٹر مقبول احمد مرحوم اور دوسرے ہیڈ ماسٹر ذاکر حسین صدا لکھنوی تھے یہ اسکول "انجمن تعلیمات ملیہ" (رجسٹرڈ) کے تحت قائم تھا اور انجمن کے صدر ملک کے ممتاز صنعت کار اور علم دوست جناب پیر محفوظ علی صاحب تھے اس کی مجلس منتظمہ میں مولانا سعید الرحمن رہبر کانپوری، سید رشید احمد رومی، عبدالعزیز جعفری اور ریاض الحق وغیرہ کے ساتھ راقم الحروف بھی شعبۂ نشر و اشاعت کے انچارج رکن کی حیثیت سے شامل تھا۔ نظامت تعلیم کی طرف سے اسکول کے معائنے بھی ہوئے لیکن چونکہ اسکول کی عمارت کے دو کمروں میں مولانا رضی صاحب مع خاندان کے رہتے تھے اور کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے اس لئے نہ تو پوری عمارت انجمن کی تحویل میں آ سکی اور نہ اسکول کو سرکاری امداد مل سکی۔ مالی خستگی کو دور کرنے کے لئے یہ طے پایا کہ ایک بین الملکی مشاعرہ منعقد کیا جائے اس مشاعرے کا کنوینر اور اس کی انتظامی کمیٹی کا سکریٹری بھی راقم الحروف تھا۔ ۸ مارچ ۱۹۵۲ کو سندھ مدرسہ کے احاطے میں مشاعرہ ہوا۔ میری گزارش پر علامہ نیاز فتحپوری مرحوم صدارت کے لئے اور جوش، فراق، جگر، اثر لکھنوی اور شعری بھوپالی مہمان شاعر کی حیثیت میں ہندوستان سے تشریف لائے۔ حفیظ جالندھری صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کا چیرمین کی حیثیت سے باہر سے آنے والے شعرا کا خیر مقدم کیا اور ضیاء الحسن موسوی صاحب نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک غیر معمولی مشاعرہ تھا۔ اس میں اس وقت کے بیشتر مرکزی وزرا شریک ہوئے تھے۔ سید ہاشم رضا صاحب کراچی کے ناظم اعلیٰ تھے اور ہندوستانی شعرا کے لئے اجازت نامے انھیں سے حاصل کئے گئے تھے۔ دوسرے دن شعرا کے اعزاز میں پیر محفوظ صاحب نے اپنے گھر پر جو عشائیہ دیا تھا اس میں بھی سید ہاشم رضا صاحب، حفیظ جالندھری صاحب اور ذوالفقار علی بخاری صاحب شریک تھے۔ لیکن مشاعرہ جس غرض سے کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ذاکر صاحب مرحوم وزیر تعلیم تھے اور جامعہ ملیہ کے قیام کے لئے جگہ کی تلاش میں تھے، ہاشم رضا صاحب کے توسط سے انھوں نے انجمن تعلیمات ملیہ کے صدر پیر محفوظ علی صاحب سے بات چیت کی اور اس خیال سے کہ ملیہ میں بہت جلد ایک مثالی تعلیمی ادارہ قائم ہو جائے گا، پیر محفوظ صاحب نے نرسری پبلک اسکول کی عمارت کو مجلس تعلیم ملی کی تحویل میں دے دیا۔ بعد کو مولانا رضی نے بھی کمرے خالی کر دیئے۔ مجلس نے ۹ اکتوبر ۵۳ء کو اپنے انداز پر کام کرنا شروع کر دیا

احسان دانش

آئینۂ اخلاق و ادب

صاحبِ غیرت و ایمان تھا محمود حسین
قابلِ رشک مسلمان تھا محمود حسین

اُٹھ گیا آہ سلگتی ہوئی یادیں دے کر
قحطِ آدم میں اک انسان تھا محمود حسین

خوش تھے یوں دولتِ بیدار میسر ہے ہمیں
اب یہ لگتا ہے کہ مہمان تھا محمود حسین

ایک آئینۂ اخلاق و ادب ٹوٹ گیا
صاحبِ حکمت و عرفان تھا محمود حسین

جس میں ایثار و مروّت کے تھے لاکھوں پہلو
وہ شرافت کا اک عنوان تھا محمود حسین

رحمتیں اس کی محافظ ہوں لحد روشن ہو
عاشقِ سیدِ ذیشان تھا محمود حسین

ہے بصد غم لبِ فرمانؔ پہ جاری دانشؔ
ہم پہ اللہ کا احسان تھا محمود حسین

لے ڈاکٹر فرمان فتحپوری

صابر اکبرآبادی

علمِ مجسّم

اخلاق، خلوص اور صداقت — یہ لفظ اگرچہ دلنشیں ہیں
علم اور عمل متانت و فکر — کاغذ پہ یہ لفظ بھی حسیں ہیں
تاریخ و ادب تدبّر و نظم — سب خاتمِ علم کے نگیں ہیں
وہ ذات کہ جس میں سب تھے موجود — اب اس کے نشان بھی کہیں ہیں
دانشکدہ بے چراغ سا ہے — طلّاب ملول ہیں حزیں ہیں
جو دید سے ان کی تھیں منوّر — ان آنکھوں میں اشک جاگزیں ہیں
جو قُرب سے ان کے مفتخر تھے — کھو کر انھیں سنگ بر جبیں ہیں
ہے بزمِ اساتذہ میں ماتم — شاگرد، ملال کے قریں ہیں

دیکھیں کہاں علم کو مجسّم
محمود حسین خاں نہیں ہیں

پروفیسر منظور حسین شور

ماحول کی موت

(۱)

غم جسکی زمین، کرب ہیں جس کے بادل،
چلتا ہے جہاں گردش افلاک کا ہل
قاموس میں جس کھیت کا "انسان" ہے نام
اُس کشتِ بلا خیز کی دہقان ہے اجل

(۲)

خورشید کو ظلمات سے دھونا ہوگا
شبنم کو شراروں میں ڈبونا ہوگا
اے دیدہ ورِ ماتمِ محمود کے بعد
شائستگیٔ نفس کو رونا ہوگا

(۳)

کر جاتا ہے جب اہلِ بصیرت کوئی فوت
ہو جاتا ہے مزارِ بصیرت بے صوت
پیغمبرِ تہذیب و ثقافت ہو جو شخص
اس شخص کا مرنا بھی ہے ماحول کی موت

(۴)

اے شیشہ گرِ کارگہِ نقد و نظر
کیا کیا ترے شیشے پہ نہ برسے پتھر
ان کو بھی کلیجے سے لگایا تو نے
لے لے کے بڑھے جو تری جانب خنجر

(۵)

ہے موت تری وقت کے سینے کا وہ گھاؤ
دہکے گا دلوں میں جو سدا بن کے الاؤ
تہذیب مصر ہے کہ "مجھے دفن کرو"
کہتی ہے شرافت "مرا تابوت اٹھاؤ"

(۶)

جینا ہی نہیں آدم و حوا کی زکات
مرنا بھی ہے کشکولِ ازل کی خیرات
دنیا جسے کرتی ہے اجل سے تعبیر
اس کو بھی سمجھ حلقۂ زنجیرِ حیات

(۷)

ہے کاتبِ تقدیر کا یہ بھی مضمون،
سو جاتے ہیں یوں بھی سرِ ساحل جیحون
تربت کو تری دیکھ کے یہ راز کھلا
دانش کو کیا جاتا ہے یوں بھی مدفون

شورش کاشمیری

علم و حکمت کا علمدار

علم کے عشق کی للکار تھا محمود حسین
ملک میں صاحبِ کردار تھا محمود حسین

اس کے امروز میں دیروز کا اسلوب نظر
فکرِ فردا کا نگہدار تھا محمود حسین

اس کا دل چشمۂ صافی تھا یا اندازِ کہن
دینِ قیّم کا طرفدار تھا محمود حسین

لشکرِ ملّتِ بیضا کے جگرداروں میں
شہسواروں کا طلبگار تھا محمود حسین

اس پہ نازاں رہے اربابِ ادب کے حلقے
علم و حکمت کا علمدار تھا محمود حسین

نسلِ نو کے لئے سرچشمۂ افکار و علوم
نوجواں پود کا معمار تھا محمود حسین

فخر کرتے رہے تا زیست حواسِ خمسہ
ایک نغمہ پارہ و شہکار تھا محمود حسین

ہم سیاہ بخت تہی دست ہوئے جاتے ہیں
دولتِ دیدۂ بیدار تھا محمود حسین

قد و قامت میں تھا اقبال کا مردِ مومن
خوشہ چینِ شہِ ابرار تھا محمود حسین

عصرِ حاضر کے مسائل پہ نگہ تھی اس کی
یا خدا، واقفِ اسرار تھا محمود حسین

اُٹھ گیا ہم سے تو پھر اس کی ہمیں یاد آئی
کیا لکھوں ؟ مخزنِ انوار تھا محمود حسین

رئیس امروہوی

مردِ عظیم

محمود حسین خاں کا کردار
حیرت فزا۔ منفرد۔ یگانہ

محمود حسین خاں کے افکار
سرمایۂ نازشِ زمانہ

وہ پیکرِ عظمت و شرافت
دانش ور و دوستدار و دانا

تحریر تھی جس کی علم پرور
تقریر تھی جس کی عارفانہ

وہ فکرِ فلک نورد اس کی
وہ مرغِ بلند آشیانہ

ممتاز معلّم و مورّخ
کیا شان تھی اس کی عالمانہ

تھا مرجعِ صاحبانِ دانش
اس جانِ ہنر کا آستانہ

محمود صفت ایاز آئیں
محبوب بہ شانِ عاشقانہ

وہ اس کا تبسمِ دل افروز
وہ اس کی ادائے والہانہ

اللہ رے انکسار اس کا
ہر چند کہ شان تھی شہانہ

ہر لفظ میں تہ بہ تہ معانی
ہر بات میں کیفِ شاعرانہ

ہم سب نے جو حق تھا جاننے کا
اس مردِ عظیم کو نہ جانا

یارو! جو امیرِ کارواں تھا
وہ کس طرف ہو گیا روانہ؟
جو شخص حقیقتِ ابد تھا
صد حیف کہ بن گیا فسانہ

شاعرلکھنوی

علم وفن کا مینار

ایثار کا خلوص کا پیکر تھی اس کی ذات
خوشبوئے سادگی سے معطر تھی اسکی ذات

لہجے میں اسکے قوسِ قزح کی گھلاوٹیں
رنگوں کے امتزاج کا مظہر تھی اسکی ذات

صورت میں ایک حسن تو سیرت میں اک جمال
آئینہ اُس کا روپ تھا، جوہر تھی اسکی ذات

تاریخ کی رگوں میں لہو اس کی فکر کا
نقد و نظر میں بر سرِ منبر تھی اس کی ذات

ہر دور کے ادب پہ نظر اس کی تھی محیط
ہر رنگ کی بہار کا منظر تھی اسکی ذات

ہر اہلِ فکر کے لئے وہ نقطۂ عروج
ہر دائرے کے واسطے محور تھی اسکی ذات

اک حرف میں ہزار معانی کے تھے ہجوم
اک فرد کی اکائی میں لشکر تھی اسکی ذات

تہذیب و آگہی کے سبق اسکے نطق میں
دل کی صداقتوں سے منور تھی اسکی ذات

مینارِ علم و فن تھا وہ اپنی صفات میں
قامت میں روشنی کے برابر تھی اسکی ذات

سویا وہ زیرِ خاک تو اک عہد سو گیا
صدیوں کے علم و فضل سے بڑھکر تھی اسکی ذات

ہم اس کے ظرفِ علم کا کیا تجزیہ کریں
دریا یہ کہہ رہے ہیں سمندر تھی اس کی ذات

کس منہ سے یہ کہیں کہ وہ ہم میں نہیں رہا
کیسے کہیں کہ ہم کو میسر تھی اسکی ذات

اقبال شوقی

شرافت کا ستون

اک عالمِ باعمل تھا محمود حسین   اک مشفقِ بے بدل تھا محمود حسین
بذلہ سنج و سخن در و نکتہ شناس   کھِلتا ہوا اک کنول تھا محمود حسین

تن من تھا اور نہ دھن تھا محمود حسین   اک مقصد، اک لگن تھا محمود حسین
آج اس کے بغیر انجمن سونی ہے   کل آپ اک انجمن تھا محمود حسین

ہم جادہ و ہم سفر تھا، محمود حسین   ہمراہی و راہبر تھا محمود حسین
اوصاف تمام تھے فرشتوں کے سے   ہر چند کہ اک بشر تھا محمود حسین

معمارِ اساسِ عصر، محمود حسین   ممنونِ سپاسِ عصر، محمود حسین
گو طرفہ ادائے بے نیازی تھی، مگر   تھا نبض شناسِ عصر، محمود حسین

گلشن میں بہارِ جانفزا کھلا یا   محفل میں چراغِ پر ضیا کھلا یا
انفاس کی گرمی سے شگوفے کھِل اُٹھے   گلزارِ عنادل میں صبا کھلا یا

ظاہر میں وقار و عزم و ہمت کا ستون   باطن میں خلوصِ حسنِ نیت کا ستون
علم و دانش میں روشنی کا مینار   اخلاص و مروت میں شرافت کا ستون

شل ہو گئے پاؤں، سر مگر خم نہ ہوا   موت آئی تو ذوقِ زندگی کم نہ ہوا
انفاسِ کی راگنی نے دم توڑ دیا   شیرازۂ خوابِ زیست برہم نہ ہوا

کچھ صاف کبھی، اور کبھی کچھ مبہم   آواز یہ آ رہی ہے لیکن پیہم
محمود حسین کیا گئے عالم سے   یہ کہئے کہ "رفت روشنی از عالم"

۱۳۹۵ھ

انور حارث

مردِ خلیق

حقیقتِ ابدی کی طرح فسانے میں
طیورِ علم پھڑکتے ہیں آشیانے میں
ستارہ ہائے ہنر خاکداں کے چشم و چراغ
دلیلِ راہِ وفا مردِ حق زمانے میں
بقدرِ ساز نہیں سوزِ عشق کی مضراب
سرشک و خونِ تمنا کہاں ترانے میں
متاعِ کشتۂ آلام شیوۂ تسلیم
کہ چرخ کو یدِ طولےٰ ہے آزمانے میں
میانِ ساغر و مینا نہ پوچھ مستوں سے
"ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں"[1]
"فقط[2] یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق"

---

[1] [2] اقبال

سحر انصاری

عِلم کی تاریخ

رازِ مہ و مرّیخ تھے محمود حسین
اوہام کی تنسیخ تھے محمود حسین
کیوں علم کی تاریخ میں زندہ نہ رہیں
خود علم کی تاریخ تھے محمود حسین

آئینہ میں خورشید کی تابانی تھی
یا لوحِ علوم، لوحِ پیشانی تھی
ہر چینِ جبیں تھی سطرِ اسرارِ حیات
یا آیتِ اعتمادِ انسانی تھی

دریا کی طرح نرم و رواں تھی تحریر
شبنم کی طرح مرہمِ جاں تھی تقریر
حق یہ ہے کہ تھا پیکرِ محمود حسین
تہذیب و شرافت کی مکمل تصویر

وہ ذات کہ خود علم کرے جس پر ناز
سمجھا گئی تدبیر کو تقدیر کے راز
گر معبدِ تعلیم سے بانی ہو جدا
اشکوں سے وضو کر کے پڑھو غم کی نماز

ولی رضوی

شفقتوں کا پیکر

میں سوچتا ہوں
کروں بھی میں تعزیت تو کس سے
میں آج کس کس کا غم بٹاؤں
عجب ستم ہے، ہر آنکھ نم ہے
میں کس کس کے اشک پونچھوں
عجب ستم ہے
یہ پڑھنے والے۔ یہ کالجوں کے، یہ جامعہ کے یتیم لڑکے
جو والدِ معنوی سے اپنے بچھڑ کے مغموم ہو گئے ہیں
محبتوں، شفقتوں کے پیکر سے آج محروم ہو گئے ہیں
یہ دل گرفتہ اداس لڑکے
کہ جن کے پلکوں پہ آنسوؤں کے چراغ سے جیسے
جل رہے ہوں
خدا انھیں صبر و استقامت کا حوصلہ دے

فرخ آباد سے $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۴}$ کے سائز پر "مجیب" نام کا ایک پرچہ نکلتا تھا۔ ۷ اپریل سنہ ۳۲ء کے پرچے کے چار صفحے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے کاغذات میں دستیاب ہوئے۔ ابتدائی چار صفحے غائب ہیں۔ اس میں صفحہ پانچ پر ڈاکٹر صاحب پر "خوش آمدید" کے عنوان سے دو نظمیں وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ صفحہ سات پر بھی اڈیٹر کی جانب سے ایک نوٹ ہے۔ چونکہ یہ نظمیں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ اس لئے ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں۔

(ف۔ف)

خوش آمدید

عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کے برادرِ اصغر عزیزی مسٹر محمود حسین خاں صاحب جو حال ہی میں جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری اکسیلنٹ کی امتیازی حیثیت کے ساتھ حاصل فرما کر تشریف لائے ہیں ۱۳ اپریل ۱۹۳۲ء کو آپ کے قائم گنج تشریف لانے پر جو دو نظمیں آپ کی خدمت میں بطور ہدیۂ خلوص اسٹیشن قائم گنج پر پیش کی گئیں تھیں وہ ناظرینِ مجیب کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حفیظ الرحمٰن مجیبی

(۱)

حبذا محمود اے نورِ نگاہِ انجمن
مہرِ چرخِ علم و حکمت اے دُرِ دُرجِ وطن

اے کہ تیری ذات پر نازاں بہارِ آرزو
فصلِ گل آمد نسیمِ خوش وزد اندر چمن

کیوں نہ ہو خاکِ چمن کو ناز تیری ذات پر
تیری باتیں ہیں گلِ نسرین و بوئے نسترن

اے بہارِ تازہ اے موجِ نسیمِ خوشگوار
تجھ پہ قرباں کر دیا پھولوں نے اپنا بانکپن

کیوں نہ احباب و اعزا ہوں تیرے ملنے سے شاد
شمعِ بزمِ دلبری اے مطلعِ صبحِ وطن

مخزنِ مغرب سے لایا کھینچ کر تو وہ کمال
ناز کرتی ہیں نگاہیں دیکھ کر تیرا جمال

گلعذار اے گلعذار اے سایۂ ابرِ بہار — زندگانیٔ چمن اے بیقراروں کے قرار
تیری آمد سے مشامِ زندگی تازہ ہوا — نافۂ روحِ طرب اے موجۂ مشکِ تتار
روز و شب خاکِ وطن تجھسے ضیا اندوز ہو — مہر کو شرمائے تیری ہر شعاعِ زرنگار
تیرے حصے میں رہا بچپن سے دردِ قومیت — اخترِ برجِ وطن اے درد کے سرمایہ دار
بلبلیں اب شاخِ گل پر نغمہ سامانی کریں — تو جو آیا آئی گلزارِ تمنا میں بہار

فرخ آباد اور قائم گنج عشرت کوش ہیں
تیرے مقدم میں نگاہیں صورتِ آغوش ہیں

اے عزیزِ جان و دل جینے کا سامان کردیا — یہ سیہ خانہ تجلی سے درخشاں کردیا
رنگ وہ لائی بالآخر فطرتِ اعلیٰ تری — ضوئے علمیت نے تجھکو مہرِ تاباں کردیا
ذاکر و یوسف کو دلکی اے بہارِ دلفریب — تونے ہر خارِ وطن گلشن بداماں کردیا
ایکسیلنٹ اور تمغائے فضیلت شاد باد — خاکِ قائم گنج کو تونے فروزاں کردیا
چھوٹ کر تجھ سے جو سینہ ہوگیا تھا داغ داغ — پھر تبسم نے ترے اسکو گلستاں کردیا

سینۂ زخمی سے بزمِ گل ہے شرمائی ہوئی
ہے حفیظ اپنے گلستاں میں بہار آئی ہوئی

---

(۲)

منشی نذیر محمد خاں صاحب نذیر خلیلی

ہر طرف آج نرالی چمن آرائی ہے — باغِ اُمید میں اِک تازہ بہار آئی ہے
اللہ اللہ عجب حسن ہے زیبائی ہے — ہمہ تن چشم ہر اِک نرگسِ شہلائی ہے

لختِ دل لختِ جگر قرۃ العین آئے ہیں
لو مبارک ہو کہ محمود حسین آئے ہیں

کوئی مدہوش کوئی مست کوئی ہے شاداں — کوئی ششدر کوئی آئینہ صفت ہے حیراں
کوئی ہے وجد کناں کیف میں کوئی رقصاں — بارک اللہ عجب ساز عجب ہے ساماں

یک بیک کون یہ مستِ مئے ناز آیا ہے

دل یہ کہتا ہے کوئی شعبدہ باز آیا ہے

اے کہ تھی ہستیٔ ملت کو ضرورت تیری — ایک مدت سے تھی مشتاقِ زیارت تیری

سب دعاگو ہیں بڑھے عزت و حشمت تیری — دولتِ علم ملے سب کو بدولت تیری

وجہ صد فخر و مباہات تری ذات رہے

بول بالا ہو زمانہ میں تری بات رہے

تیری آنکھوں سے ہو وابستہ نظامِ عشرت — تو جہاں جائے وہاں پر ہو نزولِ رحمت

روز افزوں ہو جہاں میں تری شان و شوکت — اور روشن ہو ترے دم سے چراغِ ملت

خدمتِ قوم کی دل میں وہ فراوانی ہو

کام ایثار ہو پیشہ ترا قربانی ہو

دولت و عمر بڑھے شوکت و اجلال بڑھے — مثلِ خورشیدِ سحر نیرِ اقبال بڑھے

عیش و عشرت کا ہر اک ماہ بڑھے سال بڑھے — مطمئن قلب ہو آسودگیٔ حال بڑھے

دل ہو مسرور طرب عیش کا ساماں ہو کر

تو عزیزوں میں رہے عشرتِ دوراں ہو کر

ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب کی تشریف آوری

عزیزگرامی جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب (پی۔ایچ۔ڈی) نے بمراہی لفٹنٹ خانصاحب سلطان عالم خانصاحب اسپیشل مجسٹریٹ قائم گنج و منشی قدوس عالم خاں صاحب رئیس قائم گنج و عزیزی امتیاز حسین خانصاحب (جامعی) ۷ر اپریل کو بوقت صبح اپنی تشریف آوری سے دفتر "مجیب" کو سرفراز فرمایا۔ یہاں سے آپ صاحبان مدرسہ شفیق الاسلام بھی تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب نے مدرسہ کے طریقۂ تعلیم کو ازحد پسند فرمایا۔ اور مہتمم مدرسہ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب کے غیر معمولی انہماک کو زیادہ سراہا۔ تقریباً دو بجے آپ سب صاحبان قائم گنج واپس تشریف لے گئے جہاں سے ۸ر اپریل کو ڈاکٹر محمود حسین صاحب دہلی تشریف لے جائیں گے۔

ہم ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب (پی۔ایچ۔ڈی) کی کامرانی و مراجعتِ وطن کے سلسلہ میں مخدومی ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی شیخ الجامعہ دہلی اور محبی ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب ڈی لیٹ پیرس پروفیسر عثمانیہ

"محمود میاں کے نام"

(غیر مطبوعہ خطوط)

صدر دفتر

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۲۸ر اگست ۱۹۳۵ء

محمود میاں خوش رہو اور تندرست۔ تمہارے دونوں خط ملے۔ مستقلی کی خبر پاکر سب کو بہت خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ امتیاز ۳۰ر کو بمبئی سے روانہ ہوگئے۔ ان کی تعلیم کے سلسلے میں تمہیں اور یوسف کو مدد کرنی ہوگی۔ ورنہ آخر میں دقت پڑے گی۔ ہم لوگوں نے یورپ میں تعلیم پاکر اب سب خاندان والوں کے لئے مغربی تعلیم کو لازم کردیا ہے اور یہ کوئی رنج کی بات نہیں۔ ہر چند کہ بہت زیادہ عقلمندی کی بات بھی نہیں۔ مگر امتیاز سے امید ہے کہ وہ یورپ کے قیام سے فائدہ اٹھائیں گے اور واپسی پر مقصدی آدمی کی حیثیت سے کام کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اور یوسف کو ابھی سے کوئی ۴۰ یا ۵۰ ماہوار اس کی تعلیم کے لئے الگ کرتے رہنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ رقم زیادہ معلوم ہو۔ مگر دل کے بہلانے کے ہزار طریقے ہیں۔ سمجھ لینا کہ تقرر اسی تنخواہ پر ہوا یا جامعہ میں کام کرلیا، یا کچھ دن نوکری نہ ملی وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس وقت سے کچھ نہ بچاؤ گے تو بعد میں یکشت دینے میں دقت ہوگی۔

میں دسمبر میں کیسے آؤں جی تو چاہتا ہے۔ مگر کانفرنس میں شرکت کروں تو کچھ لکھوں۔ اور یہ کیسے کروں نہ پڑھنا نہ لکھنا، نہ کتابیں نہ فرصت۔ رفتہ رفتہ امیوں میں شامل ہوتا جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ عاقل صاحب کو بھیج دوں۔ وہ کوئی مقالہ بھی تیار کرلیں گے۔

جامعہ کی عمارت کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ ایک عمارت جس میں آئندہ سال کالج اور ثانوی مدرسہ جاسکے گا مئی کے ختم تک تیار ہو جائے گی۔

سعیدہ سلام کہتی ہیں۔ صفیہ بیمار ہے۔ تمہاری بھاوج تمہیں بہت پوچھتی ہیں اور اپنی دیورانی اور بھتیجے کو دعا کہتی ہیں۔ مروّت خالہ کو میری طرف سے اور سعیدہ اپنے چھوٹے بھائی کو دعا کہتی ہیں اور چچی کو سلام اور نانی کو آداب۔ بس خدا حافظ

تمہارا ذاکر

ہاں ایک خط تمہارے نام آیا رکھا ہے۔ نہ معلوم کس کا ہے

جامعہ، دہلی

۱۹ر نومبر ۱۹۳۵ء

محمود میاں۔ خوش رہو اور تندرست

تمہارا خط ملا۔ چک ہمدردان جامعہ کے ذریعے تعمیر فنڈ کو بھیج دیا۔ شفیق صاحب حیدرآباد گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ شکریہ کا خط لکھتے اور بقیہ کا تقاضہ کرتے۔ اردو کی طباعت کا کام شروع ہو رہا ہے۔ سب کی رائے یہ ہے کہ ٹائپ میں چھپے۔ چنانچہ یہی ہوگا۔ مقدمہ اور ترجمہ مجھے مقابلہ کے لئے دے دیا گیا ہے۔ مقدمہ دیکھ کر دے دیا ہے۔ جوں کا توں۔ ترجمہ دیکھ رہا ہوں۔ بہت اچھا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ کس انگریزی ترجمہ سے تم نے کیا ہے میرے پاس تو Tozer کا ترجمہ ہے۔ معاشی کانفرنس میں میں کیا آؤں۔ پڑھنے لکھنے کی فرصت بالکل ہی نہیں ملتی۔ اگر کوئی کام لکھنے کا اپنے ذمہ لے لیتا ہوں تو اس کے پورا کرنے میں جو زحمت ہوتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ ادھر کچھ عرصہ سے آنکھوں کی حالت بھی اچھی نہیں۔ دن میں اور کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ رات کو مجبوراً لکھ پڑھ لیتا تھا تو اب آنکھوں کی وجہ سے یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کبھی کرتا ہوں تو سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اُلٹی آنکھ کی بینائی میں خاصی کمی ہو گئی ہے۔ خدا رحم کرے۔

تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اگر آنا ہی ہوا تو معاشی کانفرنس میں نہیں یونہی چھٹی لے کر آجاؤں گا۔ یا تم اب کبھی موقع پاؤ تو شیلانگ کی جگہ دہلی آجانا۔ امتیاز لندن میں خیریت سے ہیں۔ قاضی حمید کے ساتھ رہتے ہیں۔ سعیدہ اور صفیہ سلام کہتی ہیں۔ اور ان کی ماں دعا۔ بھاوج کو دعا بچہ کو بہت بہت پیار۔ بچہ کے نام کا مسئلہ قطعی طور پر طے ہوا یا ابھی تک کئی نام ہیں؟ مروّت خالہ کی خدمت میں سلام بس خدا حافظ

تمہارا ذاکر

صدر دفتر

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ دہلی

مورخہ ۵ رجولائی ۱۹۲۷ء

محمود میاں، خوش رہو اور تندرست

میں نے غالبًا ڈھاکہ سے واپسی پر تمہیں کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ تم تو شاید کچھ نہ کہتے ہو مگر بھاوج کیا کہتی ہوں گی۔ اور نوری[1] ! نوری بہت یاد آتا ہے۔ خدا عمر دراز کرے اور با اقبال بنائے۔ اب کی چھٹیوں میں ضرور آؤ۔ نوری سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

ایک دن مولانا سورتی سے ملاقات ہوئی تو میں نے وہابیوں کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے جو اشارے لکھ کر دیئے وہ منسلک ہیں۔ ہاں، سُنا ہے کہ کسی شخص نے حال ہی میں انگریزی میں اس موضوع پر مفصل لکھا ہے۔ شاید اسلم صاحب نے ذکر کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا۔

میں ان گرمیوں میں یہیں رہا اور اچھا رہا۔ اب اگست سے کام شروع ہوگا۔ خدا کرے یہ سال پچھلے سال سے بہتر گزرے۔

گھر میں دعا کہنا۔ مروّت خالہ کو سلام اور نوری میاں کو بہت بہت پیار۔ جس پر غالبًا وہ کہیں گے ابھی' یا ابھی نہیں یا باجا!! غالبًا 'باجا' کہیں گے !۔ بس خدا حافظ

تمہارا ذاکر

صدر دفتر

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ دہلی

مورخہ ۲۴ رجنوری ۱۹۲۸ء

محمود میاں ۔ خوش رہو اور تندرست

بہت دن بعد تم نے یاد کیا۔ اس روز وردہ کے اسٹیشن پر عجیب سرسری ملاقات ہوئی میں بھی بدحواس تھا اور تم بھی بہرحال تمہیں دیکھ لیا۔

---

[1] انور حسین گھر میں نوری کہلاتے ہیں

.... رپورٹ تم کیا پڑھو گے۔ مہمل سی چیز ہے۔ ایک شاید الیاس صاحب بھیج چکے۔ میں علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ اس مرتبہ کورٹ میں ہمارے بہت آدمی جمع ہوئے۔ یہی رنگ رہا تو غالباً ضیاالدین صاحب کو جانا پڑے گا۔ وہ آغا خاں سے زور ڈلوا رہے ہیں۔ کل آغا خاں نے مجھ سے بھی کہا کہ سمجھوتہ کرلو۔ میں نے تو قطعی انکار کر دیا۔ دیکھئے کیا ہو؟

بادل خاں مرحوم والا فقرہ بہت اچھا ہے۔ جی خوش ہوگیا۔ مروت خالہ کو سلام۔ بھاوج کا کیا حال ہے۔ انھیں دعا بچوں کو پیار۔

تمہارا ذاکر

صدر دفتر

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۵ ستمبر ۴۳ء

محمود میاں خوش رہو۔ کارڈ ملا۔ مجھے بخار آگیا تھا۔ اب نہیں آتا۔ لیکن کسی دن بھی آسکتا ہے۔ اسے شکست دینے کے لئے روزے رکھ رہا ہوں۔ شاید بھاگ جائے۔ سلطان قائم گنج گئے ہوئے ہیں پرسوں اُن کے خط سے علی عثمان خاں کے انتقال کی خبر ملی لیکن خط سلطان ہی کا ہے اس لئے ڈر ہے کہ خبر صحیح ہوگی۔ تفصیل اس میں کچھ نہ تھی صرف یہ لکھا تھا کہ بدایوں میں دفن ہوئے مفصل خط آئے تب کچھ حال معلوم ہو۔ بڑا سانحہ ہے۔ جوان آدمی۔ بچوں کی پرورش کا بار۔ اور کوئی کچھ کہے مجھے تو وہ آدمی نہایت اچھا لگتا تھا۔ میرے مدرسہ کے ساتھی تھے اور بڑی محبت سے ملتے تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ بچے اچھے ہیں۔ مینا کے نہ ہونے سے کچھ سُونا سُونا ہے۔ خدا کرے جلد آجائے۔ ہریا کو بخار ہوگیا تھا اب اچھی ہے۔

ذاکر

جامعہ، دہلی

۴ دسمبر ۱۹۴۶ء

محمود میاں خوش رہو۔ معاف کرنا کہ تمہیں عرصے سے خط ہی نہ لکھ سکا۔ آج کل ہر جگہ جو حال ہے اور خصوصاً ڈھاکہ میں بدامنی کا جو لامتناہی سلسلہ ہے، اس سے طبیعت بہت

ہی فکر مند رہتی ہے خدا تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔

جوبلی ہوگئی اور اچھی خاصی رہی۔ زمانہ بہت خراب تھا۔ اور آخری دنوں میں خود دہلی میں جو حالت تھی اس نے ننقہ بہا قصہ پاؤں پھیلا دیئے تھے۔ انتظامات کو تقریباً درہم برہم کر دیا تھا۔ کچھ تائید غیبی ہی تھی کہ خیریت رہی اور توقع سے زیادہ کامیابی سے یہ تقریب گزر گئی۔ جناح صاحب بھی آئے اور بڑی خوش دلی سے آئے۔ ان کا بڑا احسان ہے۔

اُمید تھی کہ   کے لئے تم ۹ رسے پہلے آجاؤ گے مگر وہ معاملہ بھی ابھی کھٹائی میں ہے، بعد میں دیکھئے . . . . کیا طے ہو۔ اب اگر اسمبلی ہوئی اور لیگ تحریک ہوئی تو غالباً تمھیں یکایک آنا ہوگا آنے میں ذرا تامل نہ کرنا، تمھارا مکان تو خالی نہ کرا سکوں گا مگر تم آتے ہی تو میرے ساتھ رہنا۔ پھر کوئی انتظام ہو جائے گا۔ برکت صاحب کا ایک مکان کچھ آدھا خالی آدھا بھرا ہے انشاءاللہ وہ مل جائے گا۔

نوری میاں اچھے ہیں۔ جوبلی میں مصروف رہے۔ بیت بازی بھی ہوئی تھی۔ اس میں ان کا خاصہ حصہ تھا اور دوسرے کام بھی تھے۔

سعیدہ آجکل یہیں پر ہیں۔ صفیہ اور سعیدہ دونوں سلام کہتی ہیں اور دعا مانگتی ہیں کہ تم لوگ جلدی آجاؤ۔

خدا کرے تم سب اچھے ہو۔   خدا حافظ

تمھارا   ذاکر

دفتر شیخ الجامعہ

جامعہ نگر، دہلی

۲۸ راگست ۴۷ء

محمود میاں۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے

ڈرتا ہوں کہ تم نے کہیں اخبار میں نہ پڑھا ہو کہ میں جلندھر میں گھر گیا تھا اور ایک شریف سکھ افسر کی مہربانی سے قتل ہونے سے بچ گیا۔ خبر تو صحیح ہے اور واقعہ جس وقت پیش آیا تھا سخت تھا، لیکن اب تو گزر گیا اس پر متوحش ہونے سے فائدہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی چوٹ نہیں آئی ہے۔

دوسرے دن بخیریت دہلی پہنچ گیا۔ البتہ سری نگر نہ پہنچ سکا۔

دہلی کا حال بھی اچھا نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ اب کچھ ہوا۔ اب کچھ ہوا۔ . . خدا رحم کرے۔ بہرحال پاکستان میں تو لوگ محفوظ ہوں گے ہم تو پاسنگ ہیں، یوں ہی ختم ہو جائیں گے۔ خدا مبارک کرے۔ خدا کرے تم سب بخیر ہو۔ والسلام

تمہارا ذاکر

دفتر شیخ الجامعہ

جامعہ نگر، دہلی ۲۶ ستمبر ۴۷ء

محمود میاں - خدا تم سب کو خوش اور تندرست رکھے

ہم سب اب تک زندہ اور بخیر ہیں۔ دہلی پر جو گزر گئی اس کا بیان کرنا آسان نہیں۔ ابھی اور کیا کچھ باقی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے بہرحال چند روز سے کچھ امن ہے۔ ہم لوگ اب تک حملہ سے محفوظ ہیں اوکھلا گاؤں بھی بچا رہا۔ ورنہ مضافات کے سب گاؤں میں مسلمان ختم ہو گئے۔ شہر میں ڈیڑھ لاکھ سے اوپر مسلمان بے گھر در ہیں۔ بارش سخت ہو رہی ہے۔ سب ان کے سر پر۔ ہیضے اور نمونیا کا زور ہے۔ خدا رحم کرے۔ لیڈر سب غائب ہیں۔ میں اب آٹھ دس روز سے کیمپوں میں جاتا ہوں غذا، خیموں، دواؤں کا جو انتظام کرا سکتا ہوں کرا رہا ہوں۔ مگر حالت بہت خراب ہے اور لوگ ایسے ٹوٹ گئے جیسے کہ خود اپنی کسی قسم کی تنظیم نہیں کر سکتے۔ کل ایک کیمپ میں کئی ہزار آدمیوں کو جامعہ کے والنٹیروں کے ذریعہ تیسرے روز راشن بٹوایا جا سکا۔

بتول بھابی یہیں ہیں۔ سعیدہ، صفیہ، سلطان خیریت سے ہیں۔ ہم سب جامعہ کی بڑی عمارت میں آ گئے ہیں۔ اسی کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اپنی ۸-۱۰ بندوقیں ہیں اور ایک فوج کا . . . . ل گیا ہے۔ رات بھر ہمارے آدمی پہرہ دیتے ہیں اور یوں یہ دن اور راتات کٹتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں ہم لوگ جنت میں ہیں۔

نانی کی خدمت میں سب کا سلام۔ نوری، طارق اور بچیوں کو بہت بہت پیار اور ان کی والدہ کو سب کی دعائیں۔ خدا تم سب کو بخیر رکھے۔ خدا حافظ

تمہارا ذاکر

مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ ۳ دسمبر ۱۹۵۲

محمود میاں۔ خدا تم سب کو خوش اور تندرست رکھے

صفیہ کی شادی کے لئے ۱۰ جنوری مقرر ہوئی ہے۔ اب تو تم لوگ جدا سے ہو گئے ہو مگر اس موقع پر تو بہت جی چاہتا ہے کہ تم بھی ہو اور بچے بھی۔ مجھے اس کے بعد کوئی اور تقریب نہیں کرنی ہے جس میں پھر بلا سکوں۔ اس لئے اگر کسی نہ کسی طرح آجاؤ تو بہت ہی اچھا ہو میں جانتا ہوں کہ دقتیں ہیں مگر کوشش کرو گے تو آنا ہو ہی جائے گا۔ تاریخ ابھی مقرر ہوئی ہے اور فوراً تمہیں لکھ رہا ہوں تاکہ ابھی سے انتظام شروع کر دو اور تنگی وقت کی وجہ سے آنے میں مزید دشواری نہ ہو۔ مروت خالہ کا نہ معلوم کیا حال ہے ہو سکے تو انھیں بھی ساتھ لانا۔

سعیدہ اور صفیہ بہت سلام کہتی ہیں۔ سلطان اور بچوں کو دعائیں۔ مروت خالہ کو سلام

تمہارا ذاکر

بہار گورنرز کیمپ

پٹنہ

۱۸ اپریل ۵۸ء

محمود میاں۔ خدا تمہیں سب کو خوش اور تندرست رکھے

تمہارا ۱۱ مارچ کا خط مجھے ۱۸ کو مل گیا تھا لیکن اس زمانے میں چند بار باہر سفر پر جانا ہوا اس لئے اوقات کچھ منتشر سے رہے اور جواب رہ گیا۔ آج تمہاری بھاوج نے پوچھا کہ جواب لکھ دیا؟ تو بس زمین پیروں تلے سے نکل گئی۔ خاصی ڈانٹ پڑی اس لئے فوراً یہ خط لکھ رہا ہوں۔ جو نام تم نے لکھے ہیں ان میں مجھے تو رحیم الدین سب سے اچھا لگتا ہے بڑی بہن چھوٹے بھائی کو اور چھوٹی بہن بڑے کو ..... بے جوڑ سی بات ہے ورنہ مجھے تو اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا ویسے تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔

یہاں سب خیریت ہے۔ تمہاری بھاوج یہیں ہیں صفیہ ساتھ تھی مگر رمضان سے پہلے شاہجہاں پور چلی گئی اب مئی میں آئے گی۔ سعیدہ بیچاری اپنے امتحان کے چکر میں ہے، امتحان

۲۴ اپریل سے شروع ہوگا اور وسط مئی کے آخر تک چلے گا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی آئے۔ میں ۱۰ مئی کو رانچی چلا جاؤں گا اور ستمبر کے آخر تک وہیں رہنے کا قصد ہے۔ برسات میں رانچی بہت خوشگوار ہو جاتا ہے۔

سلطان کو دعائیں، بچیوں کو اور اجمل و طارق کو پیار۔ خدا کرے تم سب بخیر ہو۔

والسلام تمہارا

ذاکر

ہاں، تمہاری بھاوج معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ یاسمین کو شادی کے تحفہ کی قیمت مل گئی یا نہیں؟

راج بھون

رانچی

۱۶ اکتوبر ۵۹ء

محمود میاں۔ خدا تمہیں خوش رکھے

ایک تصویر بھیجتا ہوں۔ صفیہ کی لڑکی رابعہ کی بسم اللہ پڑھائی تھی۔ کسی نے یہ تصویر لے لی، جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس لئے بھیجتا ہوں۔

اگر بچیوں کی شادی کے موقع کی یا اور کوئی تصویریں ہوں تو ضرور بھیج دو یا کسی آتے جاتے کے ساتھ یا ڈاک سے۔

میں اچھا ہوں۔ کل یہاں رانچی سے پٹنہ جا رہا ہوں۔ رانچی کا ۵ مہینے کا قیام بہت اچھا رہا۔ یہ بہت پر فضا جگہ ہے۔ پہاڑ تو نہیں ہے مگر سطح مرتفع ہے کوئی ۲۵۰۰ فٹ سطح سمندر سے اونچی۔ اپریل مئی میں کچھ گرمی ہوتی ہے پھر بہت اچھا موسم ہو جاتا ہے، سردی بھی نہیں ہوتی گرمی بھی نہیں۔

سلطان، بچوں اور بچیوں کو بہت دعائیں۔ میری طرف سے بھی، تمہاری بھاوج کی طرف سے بھی۔ صفیہ سلام عرض کرتی ہے۔

خدا حافظ

تمہارا ذاکر

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹیڈیز

راشٹرپتی نواس

شملہ ۵

۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء

محمود میاں۔ تمہاری خیریت و عافیت مہرتی بی کے خطوں سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ سے آنے کے بعد میں نے "یادوں کی دنیا"[1] لکھ ڈالی اور اسی سال کے شروع میں اُسے معارف پریس چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ وہاں سے اطلاع آئی ہے کہ کتاب اب تیار ہو گئی ہے جلد بندی ہو رہی ہے۔ اس ماہ کے آخر میں شائع ہو جائے گی، چند روز ہوئے میں نے انھیں کچھ پتے بھیج دیئے ہیں جن پر کتاب روانہ کر دی جائے۔ تمہارا پتہ بھی دے دیا ہے کہ دو نسخے تمہیں بھیج دیں ایک تمہارے لئے اور دوسرا مہرتی بی کے لئے۔

اس کتاب میں میں نے بزرگوں کے حالات جو لکھے ہیں وہ وہی ہیں جو میں نے بچپن میں سنے تھے۔ احتیاط کے طور پر میں نے انھیں ذاکر میاں کو بھی دکھا دیا تھا۔ انھوں نے اُن پر صاد کیا اور جہاں انھوں نے ترمیم یا تبدیل کے لئے کہا وہاں تبدیل کر دی ہے۔ باقی حالات شجری یادداشتوں اور یادوں پر مبنی ہیں۔ تم کتاب پڑھ کر اپنی رائے لکھ بھیجنا۔ ہمارا انسٹی ٹیوٹ یکم دسمبر سے ساڑھے تین ماہ کے لئے بند ہو رہا ہے میں ۲۰ دسمبر کو دہلی جاؤں گا اور وہیں رہوں گا وہاں کا میرا پتہ یہ ہے

F 4 Nizamuddin West New Delhi

مہرتی بی نے لکھا تھا کہ ان کا ارادہ ہندوستان آنے کا ہے یہ نہیں لکھا کہ کب آ رہی ہیں۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ نوری کویت گئے ہوئے ہیں۔ بھاوج کو سلام۔ میری بیوی سب کو سلام کہہ رہی ہیں۔ امید ہے کہ لوگ بخیر و عافیت ہوں گے۔

تمہارا بھائی

یوسف حسین

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین کی آپ بیتی مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء

علی گڑھ۔ مسلم یونیورسٹی۔ شعبہ اردو
یکم جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

محمود صاحب "خوش وقت و بعافیت باشند" یہ دعا آج سے ۴۰۔۵۰ سال پہلے دی جاتی تھی۔ امید ہے اس کے قبول ہونے کا زمانہ آ گیا ہوگا انداز ترقی پسندانہ نہیں ہے لیکن مخلصانہ ضرور ہے۔

میرا بڑا لڑکا اقبال رشید صدیقی بی۔ اے راولپنڈی اور لاہور کے (GOODYEAR'S TYRE) گوڈایرس ٹائر اینڈ ربر کمپنی کا ملازم ہو گیا ہے۔ تجارتی نمائندہ یا سیلس ایجنٹ کی حیثیت سے۔ طبعاً اور اکتساباً وہ ادب، صحافت، سیاست اور ثقافت کے کاروبار کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ مجبوری نے کمپنی کی ملازمت میں داخل کر دیا۔

اس دیار میں اجنبی ہے اور گھر سے پہلے پہل نکلا ہے۔ چونکہ بہت پڑھا لکھا ذہین اور باخبر ہے اس لئے بے راہ ہو جانے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اگر کبھی لاہور یا راولپنڈی کی طرف گذر ہو تو اسے بلا کر تھوڑی سی پرسش احوال کر لیجئے گا۔ بڑے، اپنے چھوٹوں سے یہ سلوک کرتے رہیں تو چھوٹے بیزار اور گمراہ نہیں ہوتے، جس کا آجکل زیادہ امکان ہے بس تھوڑا سا چمکار دیجئے گا۔ کوئی اور بات نہیں۔ اسے یہ معلوم کر کے تقویت پہنچے گی کہ اس کے آس پاس قابل اور مخلص لوگ ہیں۔ ذاکر صاحب کے رشتہ سے آپ پر یہ ذمہ داری بھی تو عاید ہوتی ہے۔

صفیہ ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئیں کیسی خوش تھیں۔ لیکن خوشی کے جو لڈو انھوں نے تقسیم کئے وہ نہ آپ کے سائز سے مناسبت رکھتے تھے نہ ذاکر صاحب کے شوق سے!

اس کی تلافی آپ کریں گے تو میں اور ذاکر صاحب دونوں آپ سے "راضی اور خوشنود" ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی راہ نجات میں آیا ہے کہ وہ اس طرح راضی اور خوشنود ہوتا ہے!

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ شعبہ اُردو ۔
۱۵ اگست ۱۹۴۹ء

عزیز گرامی، دعائے صحت واقبالہ

یہ بشیر احمد صدیقی صاحب ہیں ۔ ام اے ۔ ال ال بی/ بی ٹی علیگ پرنسپل شبلی کالج اعظم گڑھ ۔ میرے برادر نسبتی ۔ میرے ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں ۔ جب آپ اور میاں یوسف ہائی اسکول علی گڑھ میں تھے ۔ ذاکر صاحب سے ان کو بھی وہی تعلق ہے جو ہم سب کو ہے۔ اپنے عزیزوں اور بچوں کو دیکھنے کراچی جا رہے ہیں۔ میں نے مشورہ دیا کہ آپ سے بھی ضرور ملیں ۔ نواح اعظم گڑھ کے مشہور ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں میں ہیں اور پرانے علی گڑھ کا بڑا اچھا نمونہ ۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں ۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

بریلی ۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۳ء

برادر محمود صاحب السلام علیکم

آج آپ کا خط ملا ۔ میرا الہ آباد کا پتا یہ ہے ۔

" بر مکان شیخ محب حسن صاحب مرحوم ، بالسن منڈی الہ آباد ۔"

بھائی! میرے لئے ایک اوپر کی سیٹ پر ، دہلی ہی سے قبضہ جما لینا ۔ میں بڈھا آدمی رات کو مجھ سے نہ جاگا جائے گا ۔ آپ لوگ ماشاء اللہ جوان ہیں ہر طرح گذار لیں گے ۔ مجھے تو یقینِ کامل ہے کہ یونیورسٹی اگر کھلی بھی تو پھر بند ہو جائے گی ۔ البتہ ہم لوگوں کو مفت کی کوفت اور تکلیف ضرور اٹھانی پڑے گی "حکم حاکم" والا معاملہ ہے ۔ بڑے صاحب کی ایسی ہی مرضی ہے تو اب چارہ کیا ہے ۔ والسلام

آپکا
شادانی

پیرس ۔ ۷، صفر المظفر ۱۳۷۱ھ (۱۵، نومبر ۱۹۵۱ء)

محترمی زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ، میں دو ماہ سے ترکی گیا ہوا تھا ابھی ابھی واپسی پر جناب کا مرسلہ بستہ ملا (عنایت فرمودہ کتاب "فتح المجاہدین" پہنچی) اس نوازش پر دلی شکریہ عرض کرتا ہوں۔

اگر ایک نومشق، کالج کے طالبعلم، کے مضمون کا مطالعہ، مولف فتح المجاہدین کے حالات کی جگہ مندرجات کتاب کے متعلق کیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا جو ٹیپو سلطان کی زندگی ہی میں نقل ہوا ہے۔ مطبوعہ "فتح المجاہدین" کے فوری اور سرسری ورق گردانی پہ نظر آیا کہ فاضل اڈیٹر کے پیش نظر نسخوں میں وہ باب غائب ہے جو ہمارے خاندان کے نسخے میں ہے اور جس میں مختلف اوقات میں گائی جانے والی نظموں اور ان کے سروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ اگر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سے خواہش کی جائے تو وہ مطبوعہ نسخے کا ہمارے خاندانی نسخے سے مقابلے کا انتظام بہ آسانی کرا سکتے ہیں۔

لندن میں بعض شریف وغریب طالب علم ہیں۔ انھیں کوئی مناسب معاوضہ دیا جائے تو وہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے تمام ہی نسخوں سے مطبوعہ نسخے کا مقابلہ کر کے ایک رپورٹ دے سکتے ہیں۔ افسوس کہ یہ کتاب مجھے تین ماہ پہلے نہ ملی ورنہ میں خود یہ کام لندن میں کر دیتا۔ اب فی الحال مکرر وہاں جانے کے آثار نہیں ہیں۔

میں ان اذکار میں بھول گیا کہ ہمارے محترم و مخدوم لیاقت علی خاں صاحب[۱] کی تعزیت عرض کردوں۔ میں اس زمانے میں استنبول میں تھا اور لائبریرین و پروفیسر سے لے کر ہوٹل کے ویٹر وغیرہ تک ہر شخص اس صدمے سے ششدر و متاثر تھا، مرحوم نے ملت کی بڑی خدمت کی اور اپنے علم و دانست کے مطابق خلوص کے ساتھ اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ مشیتِ خداوندی کے آگے کیا چارہ ہے۔ خدا ملک و ملّتِ پاکستان کو اپنے نئے رہنماؤں کی رہبری میں ساحل مراد تک پہنچائے۔ آمین۔

غمگین

محمد حمید اللہ

---

[۱] پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خاں

رمنا۔ ڈھاکہ ۔ ۱۸ ر مارچ ۱۹۳۳ء

ڈیر ڈاکٹر حسین

مجھے یقین ہے کہ آپ کو رجسٹرار کا خط مل گیا ہوگا جس میں آپ کو اس یونیورسٹی میں ریڈر کے عہدے کی پیش کش کی گئی ہے۔

جو خاص مضامین آپ کو پڑھانے ہوں گے وہ یہ ہیں :۔

۱۔ بی۔ اے کے طلبہ کو تاریخ انگلستان ۔ سیاسی اور آئینی دونوں ۔

۲۔ ایم ۔ اے کے طلبہ کو بین الاقوامی قانون اور ماڈرن ہسٹری ۔

میں مطبوعہ سلیبس کی ایک کاپی، متعلقہ پرچوں پر نشان لگا کر بھیج رہا ہوں تاکہ آپ ان تین مہینوں سے فائدہ اٹھا سکیں جو یونیورسٹی کھلنے میں باقی ہیں ۔

خیر اندیش ۔ آر۔ سی ۔ موجمدار

ایم ۔ اے، پی ایچ ۔ ڈی۔ پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

ڈھاکہ ۔ ۱۰ ر مارچ ۴۹ء

بھائی محمود صاحب

سلام علیکم ۔ آپ جب سے گئے ہیں مومن کی مشہور غزل کی ردیف "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے مصداق بنے ہوئے ہیں ۔ بقول شخصے نہ چٹھی نہ چپاتی ۔ ہاں اخباروں میں آپ کی تصویریں اور تقریریں برابر چھپتی رہیں ۔ شاید آپ نے اسی کو کافی قرار دیا ہو مگر ۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں　　　مانا کہ تیرے رُخ سے نظر کامیاب ہے

آپ شاید کہیں کہ تمھیں نے کون بہت خط لکھا تو قبلہ! اول تو آپ یہاں سے تشریف لے گئے ہیں تو گیا نہیں ۔ دوسرے اگر پیر طریقت کے فرمانے کے مطابق کہ " تو در طریق ادب کوش وگو گناہ منست " الزام مان بھی لوں ۔ تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ " گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا ۔"

حال میں ایک جگہ احباب کا اجتماع تھا۔ ایک صاحب جانے لگے کسی نے کہا NIGHT IS STILL YOUNG "۔" اس خیال نے فوراً ایک منظوم صورت اختیار کرلی۔ فضلی صاحب نے فرمایا۔

آغازِ شباب شب ابھی ہے — جانے کا یہ وقت کب ابھی ہے

احباب نے بہت پسند کیا۔ دوسرے دن شادانی سے ذکر آیا وہ بھی بہت محظوظ ہوئے تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے خیال دلایا کہ اگر اس کی ردیف بدل کر "ہے پیارے" کردی جائے تو غزل کی بڑی اچھی زمین نکل آئے۔ مجھے یہ تجویز بہت پسند آئی چنانچہ اس بحر میں ایک غزل نازل ہوگئی۔ نرم نازک، فضلی صاحب کے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں آپ اس انداز کے قدردانوں میں ہیں دیکھئے کیسی غزل ہوئی ہے۔

آغازِ شباب شب ہے پیارے — جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے
تو پاس نہیں تو کچھ نہیں ہے — جب تو ہے یہاں تو سب ہے پیارے
آجا، اب آبھی جا کہ تجھ بن — سونی بزمِ طرب ہے پیارے
تو آئے تو دل سے دور ہو جائے — جتنا رنج و تعب ہے پیارے
پھر بعد میں آکے کیا کرے گا — آنے کا وقت تو اب ہے پیارے

ایک قافیہ ملاحظہ ہو۔ دیکھئے کس انداز سے نظم ہوا ہے۔

اک آگ جلائے دے رہی ہے — دل جیسے ابولہب ہے پیارے

اور یہ شعر دیکھئے گا۔

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا — یہ گریۂ بے سبب ہے پیارے
کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی — کیوں خندۂ زیرلب ہے پیارے
اپنے ہاتھوں سے تو پلائے — پینے کا مزا تو جب ہے پیارے
بے بات کی بات پر بگڑنا — غصہ ترا غضب ہے پیارے
پھولوں سے یہ کہہ رہی ہے شبنم — کیوں ہنستے ہو کیا سبب ہے پیارے

عزت کا مدار ہے عمل پر بیکار حسب نسب ہے پیارے
ہیں تیری ادائیں اس غزل میں جو شعر ہے منتخب ہے پیارے
کہتے ہیں تجھی کو جانِ فضلی اب تیرا یہی لقب ہے پیارے

اپنے فضلی سے جو خفا ہے
اس کا کوئی سبب ہے پیارے؟

میری پنشن کی درخواست فی الحال کراچی میں زیر غور ہے۔ یہاں کی گورنمنٹ نے تو منظوری دیدی ہے۔ بلاشرط۔ یعنی میرے بدلے میں کسی اور افسر کو مانگا بھی نہیں ہے لہٰذا وہاں سے منظوری میں کوئی دقت نہ ہونی چاہئے۔ احکام کا انتظار ہے مگر میرے چند مخصوص احباب یہ کہہ رہے ہیں کہ شاید کشمیر کے کام کے سلسلے میں SENIOR افسران کی ضرورت ہے اور اس کام کے لئے "جہادِ کشمیر" کی نظم کہنے والے کو انکار نہ کرنا چاہئے۔ میں نے اس چیز پر بہت غور کیا اور اس بات کی معقولیت دل میں لگی۔ میری ترکِ ملازمت کی خواہش اس لئے تو ہے نہیں کہ باہر زیادہ آمدنی کی امید ہے۔ کم یا زیادہ آمدنی میری نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ (ممکن ہے بر خود غلط ہو) کہ میں ملازمت کے شکنجوں سے نکلوں تو مسلمانوں کی خدمت شاید زیادہ بہتر طریقے سے کر سکوں لیکن کشمیر کا کام بھی ایسا ہے کہ اگر بہ احسن وجوہ انجام پا جائے تو مسلمانوں کی بڑی خدمت ہے۔ بمصداق

تیری ساری مشکلوں کا ہے یہ حل اے مسلماں چل سوئے کشمیر چل

ابھی اصغر علی شاہ اور ———— کو مرکزی حکومت نے کشمیر کے کام کے لئے مانگا تھا۔ اول الذکر کو یہاں کی گورنمنٹ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی۔ مگر میرے متعلق وہ پہلے ہی لکھ چکی ہے لہٰذا اگر میری خدمات کی وہاں واقعی ضرورت ہو تو مجھے اپنے ارادہ پنشن کو اس کام کے انجام تک ملتوی رکھنا چاہئے۔ اس کی وجہ سے میرا پروگرام بڑی حد تک درہم برہم ہو جائے گا۔ مجھے اٹھائیس مہینے کی چھٹی مل سکتی ہے۔ جس میں امریکہ وغیرہ جا کر میں اسٹوڈیو اور پریس کے

لئے مشینوں کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کشمیر کا کام اتنی بڑی قومی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے آگے میرے اپنے ذاتی پروگراموں کی کوئی حقیقت نہیں۔ مختصر یہ کہ اگر میری واقعی ضرورت ہو تو میں تیار ہوں اور اگر بغیر کسی خاص دقت کے کوئی اور انتظام ہو سکے تو فبہا۔ پھر میں اپنے موجودہ پروگرام ہی کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہو جاؤں۔

اگر میری خدمات کی واقعی ضرورت پڑ جائے تو مرکزی حکومت بذریعہ تار دریافت کر سکتی ہے کہ اگر میرا کشمیر میں تقرر ہو تو میں اپنی پنشن کی درخواست کو ملتوی کرنے پر آمادہ ہوں گا یا نہیں۔ اس کا جواب میں اثبات میں دوں گا۔ اور اس طرح میری پنشن کی درخواست کی وجہ سے جو اشکال پیدا ہوا تھا دور ہو جائے گا۔ اپنے "گھر میں" ہماری۔ "گھر میں" "اور" ہمشیرگان کی طرف سے سلامِ شوق۔

والسلام

فضلی

ڈھاکا۔ ١٧/ مارچ ٤٩ء

بھائی محمود

سلام علیکم، حال میں ایک خط ارسال خدمت کیا جا چکا ہے۔ مجھے ایسا خیال آ رہا ہے کہ شاید میں اس خط میں اپنا مافی الضمیر ٹھیک سے ادا نہیں کر سکا جس سے ممکن ہے کہ کچھ غلط فہمی پیدا ہو
میں اب بھی پنشن لینے ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ دل افگندیم بسم اللہ ...... لیکن اگر کشمیر جیسے اہم قومی کام کے لئے میری خدمات کو ارباب حل و عقد واقعی مفید سمجھتے ہوں اور میری سچ مچ ضرورت ہو تو میں اپنی درخواست پنشن کو ملتوی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہوں۔

لیکن میں اپنے آپ کو زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ کچھ لوگوں نے یہ خیال دیا کہ اگر میری پنشن کی درخواست حکومت کے سامنے نہ ہوتی تو غالباً کشمیر کے کام پر مجھے لگایا جاتا۔ محض اس دشواری کو دور کرنے کے لئے میں نے خط لکھا تھا۔ آپ اپنے طور پر عندیہ لے کے لکھئے۔ اگر وہ واقعی چاہیں تو

میں حاضر ہوں اور اگر ذرا پس و پیش ہو تو پھر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ میں مجوزہ پروگرام کے مطابق کام شروع کردوں۔ بقول فضلی صاحب

قفس کی زندگانی میں بہت آرام ہے لیکن
ہوئے جاتے ہیں رفتہ رفتہ ہم بے بال و پر کتنے

یا:- گلشن کی یہ آزاد ہوا آئی کہاں سے
گھٹنے لگا اب قید میں دم اور زیادہ

ہاں اُس غزل میں ایک شعر اور ہوا ہے

اچھا ہوں جس حال میں بھی ہوں میں آگے حدِ ادب ہے پیارے

اور مقطع یوں کر دیا ہے ہے

سب کہتے ہیں تجھ کو جانِ فضلی
پیارا ترا لقب ہے پیارے

والسلام فضلی

ہمارے لئے صحیح لائحہ عمل یہ ہوگا کہ تعلیم عام و لازمی ہو، ذریعہ تعلیم مقامی زبان ہو۔ جہاں مقامی زبان اردو نہیں وہاں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور اعلیٰ مدارج میں ایک بیرونی زبان سکھائی جائے۔ اُردو کی تعلیم عام کرنے کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں تعلیمی درسگاہوں کا ایک جال بچھا دیا جائے۔ اردو میں اچھے نصاب کی کتابیں مدون ہوں۔ قابل اساتذہ کی فراہمی اور تربیت کا انتظام ہو۔ تعلیم بالغان پر پورا زور دیا جائے۔ اور اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ ابتدائی تعلیم کے علاوہ اعلیٰ مدارج کی تعلیم کے لئے اردو کے کالج کھولے جائیں اور نہ صرف ایک اردو جامعہ قائم کی جائے بلکہ پاکستان کی ساری یونیورسٹیاں اردو کی ترویج میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ محمود حسین

نامہ ہائے محمود

۳۰ر اپریل سنہ ۱۹۶۷ء

عزیزی ضیاء الدین۔ کل تمھارا خط ملا تھا جس سے کچھ امید بندھی تھی گو امید کے ساتھ خدشہ بھی تھا، اور ہم سب کی بدقسمتی کہ جب رات تمھارا تار ملا تو امید پر پانی پھر گیا۔ عزیزی وقار کی موت کی خبر دل ہلا دینے والی خبر ہے۔ تم پر جو گزری ہوگی وہ ظاہر ہے۔ ابھی صفی کی وفات کا صدمہ تازہ تھا کہ یہ آفت ناگہانی سر پر آپڑی ہے۔ ندو کا جو حال ہوگا اس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رات تار دیا تھا جو تمھیں ملا ہوگا۔ خدا تمھیں صبر کی توفیق دے۔ اس کے علاوہ کیا لکھوں، سلطان اور میں رات سے سخت پریشان ہیں کہ خدا نے کیا کیا۔ مگر کیا کر سکتے ہیں۔ جو اسے منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔

خدا بخشے بڑی ہمت اور صلاحیت کا نوجوان تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اس طرح اور اس عمر میں دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ اب اللہ تعالےٰ اس کی روح کو اپنے کرم سے نوازے۔

بن کو ہم دونوں کی طرف سے دلاسا دینا۔ ایسے موقع پر کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور انسان کو اپنی بے بسی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

تمھارا محمود

۸ر دسمبر سنہ ۱۹۶۸ء

عزیزی ضیاء الدین۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے۔

تمھارا ۴ر تاریخ کا خط ۱۴ر کو ملا۔ تمھارے اور بن کے خطوط کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بہت دیر میں پہنچتے ہیں۔ ڈھاکہ سے اور جو خط آتے ہیں ان کے ساتھ یہ نہیں پیش آتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اسکی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ تو نہیں کہ تمھارا کوئی خاص لیٹر بکس ہے جس میں تم خط ڈلواتے ہو اس میں سے

ہفتہ میں ایک دن یا پندرہ روز میں ایک مرتبہ ڈاک نکلتی ہے! یا پھر ایسا تو نہیں ہے کہ تم خط لکھ کر رکھ لیتے ہو اور بہت دن بعد ڈلواتے ہو؟ بہر حال جو بھی ہو تمھارے خط اکثر بہت دیر سے ملتے ہیں۔
یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم سب مع بیا اور شاہد کے اچھی طرح ہو اور کراچی آنے کا ارادہ ہے، ضرور آؤ۔ تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی اور اگر ضرورت ہوئی تو بین کسی اچھے ڈاکٹر کا علاج بھی کرا سکتی ہیں۔

میرا جو پروگرام ادھر آنے کا تھا وہ منسوخ ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جو میٹنگ دسمبر کے آخر میں ہونے والی تھی۔ وہ اب فروری کے آخر میں ہو۔ ابھی حال میں آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔
خدا کرے تم سب اچھی طرح ہو۔ عزیزی رحیم کا فون آیا تھا وہ لوگ یہاں ۲۰ کی شام کو کار سے پہنچ رہے ہیں۔ انشاءاللہ۔ خیریت سے ہیں۔ یاسمین امی اور بچے بھی اچھی طرح ہیں۔

دعاگو ــــ محمود

---

۸ جنوری ۱۹۷۰ء

بین بیٹیا۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے۔ ۵ تاریخ کا لکھا ہوا مسعود حسن خاں کا خط وصول ہوا جس میں انھوں نے طارق اور صبیحہ کی نسبت کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ خدا مبارک کرے۔ یہ لڑکی تمھاری پسند کی ہے، تمھیں خاص طور پر مبارک ہو۔ مینا کو بھی ہماری طرف سے مبارکباد دینا۔ مینا کو بھی لڑکی پسند آئی تھی۔

میں نے طارق کو بھی خط لکھا ہے۔ اب تم اور مینا ایسا کرو کہ مسعود حسن خاں سے مل کر تاریخ اور دن طے کر لو اور اس دن جا کر انگوٹھی چڑھا دو۔ ہمارے ہاں جیسا تمھیں معلوم ہے، چاندی کے کڑوں کی بھی رسم ہے وہ بھی پوری کرنا۔ ہم اگر ممکن ہوا تو یہیں کراچی سے کڑے اور انگوٹھی بھجوا دیں گے ورنہ تم ڈھاکے میں خرید لینا۔ تمھیں روپیہ روانہ کر دیں گے۔ میرے خیال میں کل بیا یاسمین کو لے کر شہر جائیں گی اور کڑے اور انگوٹھی لائیں گی۔ ایک جوڑا کپڑے بھی بھیج دیں گے۔ مٹھائی تم وہیں ڈھاکے سے خرید لینا۔ غرض ایسا کرو کہ تمھارے یہاں آنے سے پہلے پہلے یہ رسم ادا ہو جائے۔ پھر شادی کی تاریخ انشاءاللہ بعد میں مقرر ہو جائے گی۔

دُعاگو محمود

کراچی ۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۷۱ء

مینا بیٹیا ۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے ۔

تمھارا کبھی ٹیلیفون آجاتا ہے تو خیریت معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوجاتا ہے ۔ اب اگر رحیم الدین کبھی گھر پر نہیں ہیں تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ تم بچوں کو لے کر ہمارے پاس آجاؤ ۔

خدا کرے شاذہ اب اچھی طرح ہوں ۔ بیا سے معلوم ہوا کہ سمن کو بھی یرقان کی شکایت ہوگئی ہے ۔ علاوہ وٹامن کے جو ڈاکٹر دیتے ہیں ۔ اگر تم کسی اچھے حکیم کو کھالیتیں تو میرے خیال میں مناسب تھا ۔ حکیموں کے ہاں یرقان کی اچھی دوائیں ہیں ۔

۴ر دسمبر کو وزارت تعلیمات میں میری ایک میٹنگ صبح کے وقت ہے ۔ اس لئے میں ۳ر دسمبر بروز جمعہ سہ پہر کو پانچ بجکر پچیس منٹ پر PK 305 سے راولپنڈی پہنچوں گا ۔ اگر ڈرائیور ہو تو گاڑی بھیجدینا ۔ غالباً وہ مجھے پہچانتا ہوگا ، اور اگر ڈرائیور نہ ہو ایجوکیشن سکریٹری ڈاکٹر ہاشمی کے ۔ پی ۔ اے کو فون کر دینا کہ وہ ہوائی اڈے پر گاڑی بھجوادیں تاکہ وہ مجھے تمھارے گھر پہنچا دے

یہاں بفضلہ خیریت ہے ۔ خدا کرے تم سب خیریت سے ہو ۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو اچھی طرح رکھے ۔

دعاگو

محمود

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء

مینا بیٹیا ۔ خدا تمھیں خوش اور صحیح سلامت رکھے ۔ ہم لوگ بفضلہ یہاں خیریت سے ہیں تمھاری طرف سے اور خاص طور پر عزیزی رحیم الدین کے سبب طبیعت بہت فکرمند رہتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنی حفاظت و اماں میں رکھے ۔

کراچی پر کئی دن تک بمباری نہیں ہوئی تھی ، مگر رات پھر دشمن کے جہاز آئے کچھ نقصان کر گئے ہیں کہتے ہیں ۳۰ جانیں ضائع ہوئیں اور ۱۰۰ زخمی ہوئے ۔ جہاز مار گرایا گیا ہے ۔

ہم لوگ رات کو ڈرائنگ روم میں زیادہ دیر تک رہتے ہیں ۔ البتہ میں اپنی لائبریری میں ہی رہتا ہوں ، باقی روشنی پر پابندیاں ہیں ان پر سختی سے عمل کرتے ہیں ۔ تمھارے لئے دل سے دعا نکلتی ہے ۔ دعا کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کامیابی نصیب کرے ۔ بیا دعا کہتی ہیں ۔ شاذہ ، فائزہ ، سمن اور آصف سب کو بہت بہت پیار ۔ خدا کرے رحیم خیریت سے ہوں ۔

دعاگو محمود

تعزیتِ مہر و وفا

جناب چودہری فضل الٰہی ۔ صدر پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ان کی موت نے ہمیں ایک ممتاز ماہر تعلیم سے محروم کر دیا ہے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں میں ملک و قوم کی خدمت کی اور ہر جگہ انھوں نے اپنی اہمیت و فراست کا مظاہرہ کیا۔ اس ملک میں تعلیم و تعلم کی جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں، انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ذوالفقار علی بھٹو ۔ وزیر اعظم پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین ایک فرض شناس اور مخلص ماہر تعلیم، ایک بالغ نظر اور مشفق استاد تھے۔ ان کی وفات سے پاکستان، ایک ممتاز عالم سے محروم ہو گیا۔ مجھے ان کی وفات سے دلی صدمہ ہوا ہے۔ ان کی وفات صرف ان کے خاندان کے لئے نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ میں اور میری اہلیہ اس غم میں مرحوم کے اہل خاندان کے ساتھ ہیں۔

بیگم رعنا لیاقت علی خاں (جنیوا) گورنر سندھ

ڈاکٹر محمود کے انتقال کی خبر سن کر بے حد رنج ہوا۔ یہ پاکستان کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

غلام مصطفےٰ جتوئی ۔ وزیر اعلیٰ سندھ

ڈاکٹر محمود حسین کی رحلت کی خبر سن کر مجھے شدید رنج ہوا۔ وہ برصغیر کے نامور تاریخ داں اور ماہر تعلیم تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت کو کھو کر پاکستان نے بہت بھاری نقصان اٹھایا انھوں نے ملک و قوم کی جو خدمت کی ہے۔ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ ۔ وزیر تعلیم پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم ایک عظیم اسکالر اور غیر معمولی و منفرد ماہر تعلیم تھے۔ علمی و ملی خدمات کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم کے میدان میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ ان کے نام کو پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

پیار علی الآنہ وزیر تعلیم صوبہ سندھ

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ذات ایک قابل اعتماد رہنما اور شفیق بزرگ کی سی تھی ان کی وفات ایک المناک سانحہ ہے ایسا سانحہ جس نے ہمیں رہنمائی اور شفقت سے محروم کردیا ہے۔ ان کی وفات کا غم میرا ذاتی غم ہے۔ اس غم میں میں ان کے پسماندگان کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔

قرارداد۔ قومی اسمبلی پاکستان

یہ ایوان ڈاکٹر محمود حسین کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم اس وقت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور پاکستان کے ایک معروف اور مایہ ناز ماہر تعلیم تھے۔ ڈاکٹر محمود حسین ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ حکومت پاکستان سے بحیثیت نائب وزیر وزارت دفاع، ریاست اور سرحدی علاقے، نائب وزیر وزارت خارجہ اور دولت مشترکہ اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء وزیر امور کشمیر و تعلیم سے وابستہ رہے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک پاکستان میں فروغ تعلیم کے کاموں میں مصروف رہے۔

ان کی موت سے پاکستان ایک ممتاز شہری اور عظیم ماہر تعلیم سے محروم ہوگیا۔ ان کی رحلت پر اظہار غم کرتے ہوئے یہ ایوان ان کے اہل خاندان کے ساتھ ان کے رنج میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

عبدالقادر الگیلانی۔ سابق سفیر عراق، حال مشیر وزارت امور مذہبی حکومت پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات پر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے، جس نے پاکستان کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

ظہور الحسن بھوپالی ایم ۔ پی ۔ اے

ڈاکٹر محمود کی وفات کا ہمیں انتہائی صدمہ ہوا ۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم اور با اصول انسان تھے ۔ ان کے اٹھ جانے سے قوم ایک بہت بڑے محب وطن اور ایک عظیم وائس چانسلر سے محروم ہوگئی ۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت کرے ۔

اردم ارنر (ERDEM ERNER) سفیر ترکی

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کا مجھے انتہائی رنج ہے ۔ ان کی موت نے ہمارے درمیان سے ایک ممتاز عالم ، ایک معروف ماہر تعلیم ایک شریف النفس انسان اور ترکی کے ایک عظیم دوست کو اٹھالیا ۔ اللہ ان کی مغفرت کرے ۔

منوچہر ظلّی سفیر ایران

ڈاکٹر محمود حسین کی رحلت کی خبر اتنی جاں کاہ تھی کہ اس کا مجھے شدید رنج ہوا یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے ۔

ایم ۔ گارڈن ڈائیگر ۔ قونصل جنرل یو ایس اے

ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا ۔ وہ ایک عظیم انسان تھے ۔ یہ بات میرے لئے باعثِ صد افتخار ہے کہ پچھلے دو سال سے ، جب سے میں کراچی میں متعین ہوا ہوں انھیں جانتا ہوں ۔ ان کی موت یقیناً ان کی قوم ، تعلیم و تعلّم بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک عظیم نقصان ہے ۔

رو ئیس لی ۔ قونصل جمہوریہ انڈونیشیا

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کی خبر سن کر مجھے انتہائی صدمہ ہوا ۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم تھے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت کرے ۔

ریورنڈ توشیو میاکے (جاپان)

مجھے اپنے محترم دوست ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کی خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ یہاں جس نے یہ خبر سُنی اسے افسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب عالمی کانفرنس برائے مذہب و امن کے معین و مددگار اور اس کے اساسی رکن تھے۔ ان کی موت سے صرف ہماری تنظیم ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ یہ ساری نوع انسان کا نقصان ہے۔ ہم ڈاکٹر محمود حسین کے جذبۂ کار کو سامنے رکھ کر بین مذاہب تعاون کے ذریعہ دنیا میں قیام امن کی کوشش کرتے رہیں گے۔

لفٹیننٹ جنرل اعظم خاں

ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کی جان کاہ خبر سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس میں کلام نہیں کہ ـــــ ہر طبقے اور گروہ کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے قوم کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ ان کو ہمیشہ محترم بنائے رکھیں گی۔

میں نے ایک دوست کی حیثیت سے انھیں بہت قریب سے دیکھا انھوں نے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے جس خلوص سے خدمت کی ہے، اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہ طلبہ، پروفیسر اور یونیورسٹی کے دوسرے عملہ کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھے اور وہ ان کی علمی عظمت اور ان کے اوصاف حمیدہ کی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی قوم کی خدمت کی۔ وہ اپنے خلوص اور دیانتداری کی بدولت اُلجھے ہوئے معاملات کو سلجھا لیتے تھے۔ انھوں نے اپنی بلندیٔ فکر اور لگن کی مدد سے قوم کی بے انتہا خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

پروفیسر غلام جیلانی

ڈاکٹر صاحب کے ارتحال کی اطلاع ملی۔ یہ میرا ذاتی نقصان ہے۔

رمضان مرچنٹ صدر آغا خاں اسمٰعیل فیڈریشن

ڈاکٹر محمود حسین کی اچانک اور بے وقت موت پر میں آغا خاں اسمٰعیلی فیڈریشن کی

طرف سے اظہار تعزیت کرتا ہوں۔ وہ ایک عظیم ماہر تعلیم اور بہت بڑے عالم تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے۔

مشتاق احمد گورمانی

میں ایک مشفق اور عزیز دوست کی موت پر سب کے ساتھ شریکِ غم ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور انھیں درجات عالیہ عطا فرمائے۔ ان کا اس طرح اس دنیا سے اٹھ جانا میرا ذاتی اور قومی نقصان ہے انھوں نے پاکستان کی عظمت اور اسلام کی سربلندی کے لئے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ایم۔ کے واسطی، برطانوی اسلامی مشن لندن

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات پر برطانوی اسلامی مشن، لندن، کے اراکین اور مسلمانان برطانیہ کو ایک عظیم صدمہ پہنچا۔

ایچ۔ ایس۔ ایم۔ اسحٰق او، بی، ای، سی، ایس، پی (ریٹائرڈ) رحیم یار خاں

اگرچہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ڈاکٹر محمود حسین کی وفات ایک قومی نقصان ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ میرا ذاتی نقصان ہے۔ میں یہاں ان کے اوصاف حمیدہ اور ان کی بے پایاں اہمیت کا ذکر نہیں کروں گا اس لئے کہ سارا پاکستان ان کی ان باتوں کو دہرائے گا، حتیٰ کہ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) بھی۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سے ایک مرتبہ رخصت ہونے کے بعد میرے دل میں ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش نہ پیدا ہوئی ہو۔ میرے لئے وہ ایک محبوب شخصیت تھے اور میرا یہ تعلق چالیس سال پرانا ہے۔ وہ کتنے عظیم انسان تھے، اس طرح کے لوگ روزانہ نہیں پیدا ہوتے۔ علم کے ایک عظیم مینار لیکن وہ کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے اور جب ملتے تھے تو ایک مشفق، مخلص اور ذاتی دوست کی حیثیت سے۔ جس دن سے ان کے انتقال کی اطلاع ملی کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ میں پہروں ان کی عظمت اور ان کے اخلاص کا

ذکر کرتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا۔ ان کی یاد تازہ رہے گی۔
میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مرزا ابوالحسن اصفہانی

میں ان ہزاروں سوگواروں میں سے ایک ہوں، جو ڈاکٹر محمود حسین کے ارتحال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں انھیں قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور سے جانتا ہوں۔
ڈاکٹر محمود حسین صرف ایک معلم اور ایک جید عالم ہی نہ تھے بلکہ ان سے بالاتر وہ ایک شریف النفس انسان تھے۔ جن کا مثل ماضی میں خال خال نظر آتا ہے اور حال میں بھی ایسے کم لوگ موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک وجیہہ، بلند مرتبہ مگر منکسر مزاج انسان تھے۔
ان کی موت ایسی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اس نے قوم کو بے حال کر دیا۔ اور اس پر رنج والم کے بادل چھا گئے۔ ان کے اس طرح رخصت ہو جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے ہم مدتوں پُر نہیں کر سکیں گے۔
لاکھوں سوگواروں کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

احمد ای ایچ جعفر

مجھے اپنے عزیز اور محترم دوست اور پارلیمانی رفیق ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کا شدید رنج ہوا۔ یہ بات میرے لیے باعثِ فخر اور وجہ مسرت ہے کہ پہلی دستور ساز اسمبلی میں جس کے وہ چار سال تک رکن رہے، ان سے وابستہ اور متعلق رہا۔ اس زمانے میں وہ حکومت پاکستان میں بحیثیت نائب وزیر اور وزیر مملکت کے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے شہید ملت لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں مکمل وزیر کی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کی۔ اگرچہ مختلف اوقات میں انھیں وزارتوں کا کام سونپا گیا۔ لیکن انھوں نے ہر جگہ بڑے انہماک، تن دہی اور خلوص کے ساتھ کیا اور اپنے آپ کو ایک اچھا منتظم اور پارلیمنٹرین ثابت کیا۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے اجوابات بڑے سلیقے اور ہوشیاری کے ساتھ دیتے تھے اور جب بعض ٹیڑھے اضافی سوالات پوچھے جاتے تو ان کا

بھی وہ خاطر خواہ جواب دیتے تھے۔ پارلیمان میں ان کی تقریر ہر شخص بڑے توجہ اور انہماک سے سنتا تھا۔
وہ ایک نامور ماہر تعلیم تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے وہ اساتذہ اور طلبہ میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عاشق علی ایچ حسین ۔ ناظم آغاخان اسمٰعیلیہ محکمہ تعلیم برائے پاکستان

ڈاکٹر محمود حسین نے تعلیم و تعلم کی جو خدمت پاکستان میں کی ہے۔ اس میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ وہ صرف ایک عالم باعمل ہی نہ تھے بلکہ ایک مشفق استاد بھی تھے۔ جس نے اپنی مخلصانہ تعلیمی سرگرمیوں کی بدولت تعلیم کے فروغ کے لئے بڑا کام کیا۔ ان کی تعلیمی قیادت اور تعلیم کے لئے ان کا ہمہ تن کار ہونا ایک ایسی روشن مثال ہے، جس کی آنے والی نسلیں پیروی کریں گی۔
ڈاکٹر محمود ایک ایسے ممتاز اور محترم شہری تھے جس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے اٹھ جانے سے پاکستان صرف ایک ممتاز عالم ہی سے محروم نہیں ہوا۔ بلکہ انسانی ہمدردی اور انسانی محبت کی زندہ علامت سے محروم ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ یہ سانحہ ملک و قوم کے لئے ایک عظیم المیہ ہے۔
ہم سب دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

بیگم الماس ہارون

میرے شوہر محمود ہارون چند روز سے کراچی سے باہر ہیں اور میں بیمار پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے بیرونی اخباروں میں ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کی خبر پڑھی اور مجھے لکھا کہ میں ان کے جذبات کا اظہار کروں کہ ایک عظیم انسان کی موت سے ہمیں بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔ یہ نقصان صرف ڈاکٹر صاحب کے اپنے ہی گھر کا نہیں بلکہ یہ ساری قوم کا نقصان ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تحریک پاکستان میں جو نمایاں حصہ لیا اور پاکستان کے استحکام کے لئے جو کام کیا، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
ہماری سب کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

اے ۔ کے ۔ سومار

میں بیرونی سفر سے واپس ہوا تو مجھے ڈاکٹر محمود حسین کے انتقال کی خبر ملی ۔ بڑا افسوس ہوا ۔ ہم ایک دوسرے سے قیام پاکستان کے وقت متعارف ہوئے اور اس کے بعد مختلف کمیشنوں اور تنظیموں میں ساتھ کام کرتے رہے ۔ انھوں نے اکثر جامعہ ملیہ کی تقریبوں میں مجھے تقریر کرنے کے لئے بلایا اور میں نے ہمیشہ کہا کہ ڈاکٹر محمود جیسے لوگ پاکستان کا عظیم اور قیمتی سرمایہ ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب مجھ سے ہمیشہ بڑی ملاطفت سے پیش آتے تھے ، جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔ وہ یقیناً ایک عظیم انسان تھے اور پاکستان کو ان جیسے لوگوں کی بڑی ضرورت ہے ۔ میں اس نقصان کو بہت بڑا قومی نقصان تصور کرتا ہوں ۔ میں ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے ۔

ڈاکٹر دین محمد ملک ۔ گومل یونیورسٹی

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کا بہت صدمہ ہوا ۔ مرحوم سے پہلی بار ہاشمی صاحب مرحوم (سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) کی وساطت سے بلکہ ان کے یہاں لاہور میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا ۔ اور پھر ۱۹۶۰ء میں جامعہ ملیہ کے قیام کے دوران میں نے اتنا شفیق حلیم اور ہمدرد بزرگ نہیں دیکھا ۔ میرے قیام کے درمیان جامعہ کے چھوٹے بچوں کے اسکول میں ایک تقریب میں آئے اور اصرار کر کے بچوں کے ساتھ بیٹھے ۔ نفسیات کے ماہر کہتے ہیں بچوں کے ساتھ ان ہی کے محاورے میں ان کی سمجھ اور دلچسپیوں کے مطابق بات کرو " اس کی بہترین مثال میں نے اس تقریب میں مرحوم کی بچوں سے گفتگو میں دیکھی ۔

نواب اللہ نواز صاحب (وائس چانسلر گومل یونیورسٹی) سے پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بات ہوئی ۔ نواب صاحب نے ان کی بے حد تعریف کی بلکہ یہاں تک کہا کہ ڈاکٹر محمود حسین کی وفات سے پاکستان کے وائس چانسلروں کی تنظیم اور سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں میں اکیلا رہ گیا ہوں ۔ مرحوم ایک جید عالم اور ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ ذاتی اور خاندانی شرافت کا ایسا نمونہ تھے ۔ جو اب پاکستان سے ناپید ہو رہا ہے ۔ خدا انھیں اپنے

جوار رحمت میں جگہ دے ۔ آمین

ان لوگوں کے بعد پاکستان کی علمی ثقافتی زندگی میں صرف بونے رہ گئے ہیں ۔ معلوم نہیں نئی نسل جو نظریاتی وحدت کی بجائے نظریاتی تثلیث (مذہب، معیشت، سیاست) کا سبق پڑھ رہی ہے۔ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کس طرح اور کس حد تک کر سکے گی ۔

پروفیسر سید وقار عظیم

اگرچہ اخبار کی خبروں سے دل برابر سہما ہوا تھا۔ اور ہر روز یہ دعا کر کے سوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ خیریت کی خبر سنائے ۔ لیکن جب ریڈیو نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر سنائی تو یہ معلوم ہوا کہ یہ بات اچانک اور غیر متوقع ہوئی ہے۔ ان کی انتہائی علالت کے علم کے باوجود دل اس تصور سے گھبراتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے ۔ ان کا جانا آپ کے اور میرے لئے تو ایک ذاتی غم اور ذاتی نقصان ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر اس آدمی کا غم اور نقصان ہے، جسے زندگی کی صالح قدریں عزیز ہیں ۔ ایسے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں جو زندگی کا بھرم اور اس کی آبرو تھے ۔

دل بے حد افسردہ ہے۔ آپ کی حالت کا مجھے اندازہ ہے ۔ اس لئے یہ خط آپ ہی کو لکھ رہا ہوں ۔ ان کے عزیزوں میں سے شاید ہی کسی کو نیاز مندی کے اس رشتے کا علم ہو جو مجھے مرحوم سے تھا۔ ان کی خدمت میں میرے جذبات پہنچا دیجئے ۔ وہ سب مجھے اپنے غم میں اپنا شریک جانیں گے[1] ۔

ایم۔ نور خاں (ریٹائرڈ ایر مارشل) چیرمین پی آئی اے

آپ کے نامور شوہر کی اچانک اور اندوہ ناک وفات پر، میں اور میری بیگم، حد درجہ غمگین ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین ایک ممتاز اسکالر، ماہر تعلیم اور شریف النفس انسان تھے اُن کی موت، قوم کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مختار مسعود

آپ کے شوہر کی وفات کی خبر سے دلی صدمہ ہوا یہ صرف آپ کا ذاتی نقصان نہیں پوری ملت کا نقصان ہے خدا ان کی مغفرت کرے اور متعلقین کو، اس صدمے کو برداشت کرنے کی قوت بخشے ۔

---

[1] یہ تعزیتی خط مرقومہ ۱۰ اپریل مدیر نگار کے نام ہے ۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ہر قسم کی علمی و ادبی اور نصابی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی مندرجہ ذیل تصنیفات، ہم سے طلب کیجئے :-

---

(۱) اردو رباعی — مکتبۂ سنگ میل کراچی

(۲) تحقیق و تنقید — قمر کتاب گھر کراچی

(۳) اردو کی منظوم داستانیں (پی ایچ ڈی کا مقالہ) — انجمن ترقی اردو کراچی

(۴) غالب شاعر امروز و فردا — اظہار سنز لاہور

(۵) اردو شعرا کے تذکرے و تذکرہ نگاری (ڈی لٹ کا مقالہ) سنہ ۷۳ء کا ادبی انعام یافتہ — مجلس ترقی ادب لاہور

(۶) تاویل و تعبیر — نذر سنز لاہور

(۷) دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ — آئینۂ ادب لاہور

(۸) نواب مرزا شوق کی مثنویاں — آئینۂ ادب لاہور

(۹) زبان اور اردو زبان — قمر کتاب گھر کراچی

(۱۰) تدریسِ اردو — مکتبہ جامعہ ملیہ کراچی

(۱۱) قمر زمانی بیگم — علمی کتب خانہ لاہور

(۱۲) نیا اور پرانا ادب — قمر کتاب گھر کراچی

(۱۳) اردو کی نعتیہ شاعری — آئینۂ ادب لاہور

(۱۴) ارمغانِ گوکل پرشاد — انجمن ترقی اردو کراچی (زیر طبع)

(۱۵) میر انیس کی حیات اور شاعری — اردو اکیڈمی سندھ کراچی (زیر طبع)

قمر کتاب گھر A - ۱۵۹ اردو بازار کراچی

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

محترمی تسلیم

ڈاکٹر محمود حسین، پاکستان کی اُن گِنی چنی شخصیتوں میں سے تھے جن کا نام ملّی و قومی خدمات کے سبب، ہماری تاریخ میں سُنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ وہ آج ہماری نظروں سے اوجھل سہی، لیکن اُن کا کام، اُن کے نام کو زندہ رکھے گا اور ہمیں اُن کی یاد دلاتا رہے گا،

وہ ملک و قوم کے معمار و محسن تھے، اور ہم اُن کی زندگی اور سیرت سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، نگارِ پاکستان نے "محمود حسین نمبر" شایع کر کے، ملّت کی طرف سے ایک فرض اَدا کیا ہے، ہم نگارِ پاکستان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اسٹنڈرڈ ڈفنس آیل کمپنی

D-33-S.I.T.E

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

محترم و مکرّم

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات ملک و ملت کے لئے نا قابلِ تلافی نقصان ہے، پُرانے رہنماؤں میں اُن کا نام سرِ فہرست ہے تحریکِ پاکستان سے لے کر استحکامِ پاکستان تک، اُن کی خدمات اتنی گرانمایہ ہیں کہ ہمارے دل سے اُن کی یاد کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کے ہر علاقے اور ہر طبقے میں اُن کو مقبولیت حاصل تھی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ سارے پاکستانیوں کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتے تھے اور دل و جان سے مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔

محمود حسین نمبر شائع کرنا، ایک قومی خدمت ہے اور 'نگارِ پاکستان' مبارکباد کا مستحق ہے۔

میں بھلاؤں تو بھلاؤں کیسے

محترم و مکرّم

ڈاکٹر محمود حسین صاحبؒ کی وفات سے مجھے ذاتی طور پر صدمہ پہنچا ہے۔ اُن کا اخلاق، اُن کی سادگی، اُن کی خوش مزاجی، اُن کی شرافت اور اُن کی دلنوازی، مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔
سارے پاکستانیوں کی طرح، میں بھی اُن کے ارادت مندوں میں تھا اور آج بھی اُن کا غم میرے لئے تازہ ہے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے۔

صدّیق سیلجا۔ نیو ٹاؤن کراچی

"ڈاکٹر محمود حسین نمبر" کے بعد

نگارِ پاکستان

کا

آئندہ خصوصی شمارہ

"حسرت موہانی نمبر"

ہوگا